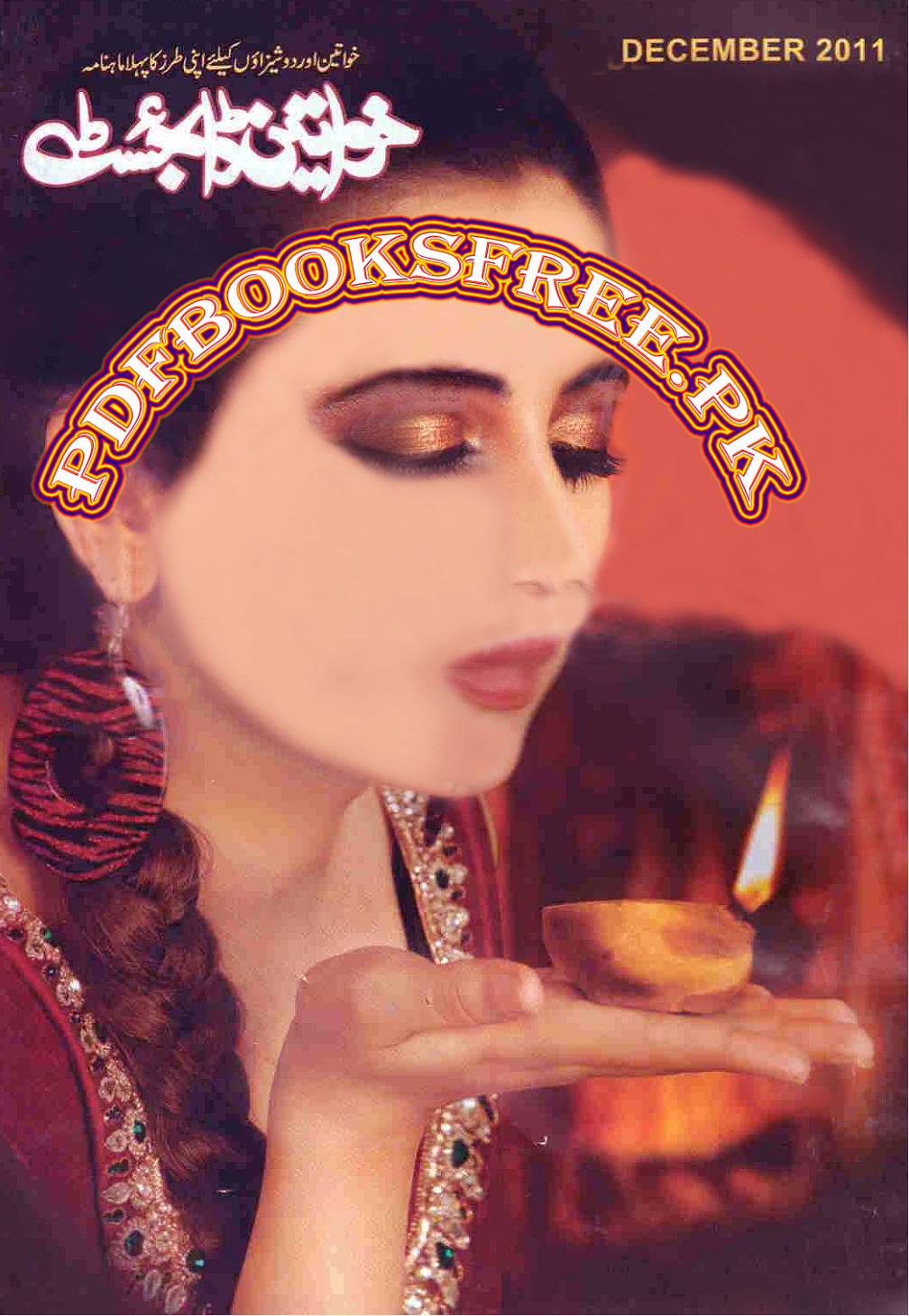


خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

DECEMBER 2011

خواتین کا عالم

PDFBOOKSFREE.PK





- پکوان 280 آپ کا باورچی خانہ مگر شاہا عالم
- نفسیات 282 خالدہ جیلانی
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان 288
- بیوی بکسر 290 بیوی بکسر کے مشورے امت الصبور
- نارنگ پھول 262 نکلت جہاہ
- 285 تصویر لٹاٹل
- 279 روشن ہاشم
- آپ کی بیاض سے خالدہ جیلانی 268
- دسمبر 2011
- جلد 39 شاہ 8
- قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: نی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: khawateendigest@hotmail.com, info@khawateendigest.com

- کہنہ منیٰ 14 سیر
- کرن کرن رشتی 15 اداس
- ہمارے تاہم 270 نادرہ خاتون
- آپ کے لیے 20 یادداشت کی تلاش
- سفال گر 146 بشری سعید
- میسران 208 لیم آمنہ
- افسانے 266 امت الصبور
- فیس بک 58 فاخرہ جمیں
- چاہ اور زوہ کا پھندا 64 شامین ملک
- دو کوڑی کی 74 سیر حمید
- عامی لطیفی 204 قرق العین چنا
- احساس 53 نعیمہ ناز
- عائزہ خان 28 شامین رشید
- نادر 36 رفعت ناہید
- چرخ آخر شب 126 نگہت عبداللہ
- میرے خواب لوٹا دو
- فیس بک 58 فاخرہ جمیں
- چاہ اور زوہ کا پھندا 64 شامین ملک
- دو کوڑی کی 74 سیر حمید
- عامی لطیفی 204 قرق العین چنا
- احساس 53 نعیمہ ناز
- عائزہ خان 28 شامین رشید
- نادر 36 رفعت ناہید
- چرخ آخر شب 126 نگہت عبداللہ
- میرے خواب لوٹا دو

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے سچے اور باہر شعاع اور باہر شعاع میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق منسلک ہیں اور ادارہ محفوظ ہے کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ویڈیو یا فوٹو یا ڈراما یا ٹیلی ویژن اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ عملی کا حق رکھتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کا مدیر کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
وقت کا تنہا تیر دھارا بہہ رہے کوہائے بلبلہ چارہ ہے۔ اہلی سال کا آغاز ہوا تھا کہ اختتام آپہنچا۔
پلک بچھلکے سال بیت گیا۔ وقت کو پیسے پر تک گئے ہوں۔ تیزی سے گزرتا یہ وقت ہی انسان کی سب سے قیمتی متاع ہے اور حیرت کی بات ہے کہ انسان اس قیمتی متاع سے ہی سب سے زیادہ غافل ہے جو اس کے لیے جواب دہ ہوتا ہوگا کہ وقت کی کاموں میں صرف کیا۔
نئے اسلامی سال کا آغاز ہر حال ہے۔ عوام الحرام اسلامی تاریخ کا پہلا مہینہ ہے۔ دس محرم وہ تاریخ ہے جب نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان کربلا میں حاکم شہادت نوش کیا۔ یہ دولت اور اقتدار کی جنگ نہ تھی نہ ہی حکومت کی طلب تھی۔ امام عالی مقام نے حکومت وقت کا بگاڑ اور خلافت کو مملکت میں بدلنے دیکھ کر اس کے خلاف آواز بلند کی۔ حق کے لیے اپنی اور اپنے اہل فائدہ کی قربانی دے کر نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ میں بیٹھ کے لیے یہ حقیقت رقم کر دی کہ کثرت حق کی دلیل نہیں ہے۔
رواں سال کی آخری ساعتوں میں اللہ کے حضور پاکستان کی سلامتی کے لیے دعا کیجیے۔ آئے والا سال ہمارے ملک کے لیے بہتری لے کر آئے۔ آمین۔

سوال توغیر

- جنوری کا شمار حسب روایت سال نو غیر ہوگا۔ سال نو غیر میں قادیان کی شہریت کے لیے سروے بھی شامل ہے۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔
- 1- کچھ لوگ زندگی کے شقیں و فراک کا مقابلہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت سے دوسروں کو حوصلہ ملتا ہے۔ کوئی ایسی شخصیت یا کردار جس نے آپ کو متاثر کیا۔ ہاں کی کسی اچھی بات یا نصیحت نے آپ کی رہائی کی؟
 - 2- اس سال آپ نے اپنا قارعر وقت کسی طرح گزارا؟ مطالعہ، فی وی، دوست احباب سے کچھ شپ یا کھونا پھرنا؟
 - 3- فارغ اوقات میں آپ کی بہترین تفریح یا مشغلہ؟ کون سی چیز سب سے زیادہ خوشی دیتی ہے؟ ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں دسمبر تک موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- فرحت اشتیاق کا مکمل ناول۔ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو،
 - دارشہدہ رفعت کا مکمل ناول۔ اب نجات کرنی ہے،
 - نایاب جیلانی کا مکمل ناول۔ بادلوں کے چیمپے،
 - بشری سعید اور نسیم اکبر کے ناولٹ،
 - فاخرہ حبیب، شاہین ملک، قرۃ العین چنا، نعیر ناز اور میرا حمید کے افسانے،
 - فی وی فنکارہ عائزہ خان سے ملاقات،
 - بائیں دنگالی سے،
 - کرن کن روشنی، نفسانی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- خواتین ڈائجسٹ آپ کا پرچہ ہے۔ آپ کی رائے ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ خط لکھ کر یا بذریعہ ای میل اپنی رائے سے توازن لے گا۔

کون کن روشنی

ادارہ

جس شخص کو اہمیت نہیں دی جاتی

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”کیا میں تجھے جنت کے بادشاہ نہ بتاؤں؟“ (ہر) ضعیف آدمی، کمزور سمجھا جانے والا (لوگ اسے کمزور سمجھیں اور اس سے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہ کریں۔) دو پرانے کپڑوں میں ملبوس۔ (لیکن اللہ کے ہاں اتنا بلند مقام ہے کہ) اگر اللہ کے نام سے قسم کھالے تو وہ اس کی قسم پوری کر دیتا ہے۔“
حضرت حارث بن وہب خراسانی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”کیا میں تمہیں جنت والے نہ بتاؤں؟ ہر ضعیف آدمی، کمزور سمجھا جانے والا (جنتی ہے) کیا میں تمہیں جہنم والے نہ بتاؤں؟ ہر درشت خود زور پرست، متکبر (جہنمی ہے۔)“

فوائد و مسائل : ○ ”کمزور سمجھا جانے والا“ مراد شریف النفس آدمی ہے جو کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی زیادتی کرے تو وہ معاف کر دیتا ہے۔ لوگ اسے کمزور سمجھتے ہیں اس سے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے اور نہ اس کے شر و عیوہ ہی کا کوئی خوف ہوتا ہے۔
○ انفرادی معاملات میں نرمی اور درگزر کا چلن عام ہو جائے تو معاشرہ امن کا گوارہ بن جاتا ہے۔ فساد پریشہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب کوئی اپنی مالی، جسمانی یا خاندانی اور افرادی طاقت پر گھمنڈ کر کے دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ اگر وہ کسی پر زیادتی نہ کرے، خواہ اسے کمزور سمجھا جائے تو یہ اخلاقی کا نمونہ ہے جس کا ثواب جنت ہے۔
○ درشت خود سے مراد بات چیت کے انداز میں اور برتاؤ میں سختی اختیار کرنے والا ہے۔ اس قسم کے

بد اخلاق آدمی سے ہر کسی کا جھگڑا ہوتا ہے جس سے فساد جنم لیتا اور بڑھتا ہے۔

○ جو اظا کا مطلب المجموع المنوع بیان کیا گیا ہے یعنی ایسا حریص آدمی جو مال جمع کرتا رہتا ہے لیکن بخیل بھی ہے خرچ نہیں کرتا۔ مومن میں حرص اور بخل کی عادتیں نہیں ہوتیں بلکہ یہ منافقوں اور کافروں میں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

○ تکبر سے مراد دوسرے کو حقیر سمجھنا اور حق واضح ہو جانے کے باوجود تسلیم نہ کرنا ہے۔ یہ برتری کا لحاظ احساس بہت سی اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کا باعث ہے۔

قابل رشک مومن

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل رشک وہ مومن ہے جو ہلکا پھلکا (کم آمدنی والا) ہو اسے نماز سے وافر حصہ ملا ہو (نفل نماز اور تہجد زیادہ پڑھتا ہو) لوگوں میں گنہگار ہو اس کی پروا نہ کی جاتی ہو اسے ضرورت کے مطابق رزق میسر ہو (انتا زیادہ رزق نہ ہو کہ بچا کر رکھا جائے) وہ اس پر صبر کرے (مزید کالاچ نہ کرے) اسے جلدی موت آجائے اس کا ترکہ تھوڑا ہو اور اسے روئے والیاں بھی کم ہوں۔“

حضرت ابو امامہ حارثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”سادگی ایمان میں سے ہے۔“

راوی نے کہا ”سادگی سے مراد معمولی لباس وغذا پر اکتفا کرنا ہے۔“

○ مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے ”سدا“ ضعیف قرار دیا ہے جبکہ سنن ابی داؤد کی تحقیق میں اسے حسن قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں شیخ ابالبی رحمۃ اللہ نے اس حدیث پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اسے

حسن قرار دیا ہے۔ بتاویں تحسین حدیث والی رائے ہی درست معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ہمارے فاضل محقق نے اسے ایک جگہ حسن قرار دیا ہے۔

○ تکلفات سے پرہیز ایمان کا جز ہے لہذا سادہ عادات کا حامل عام نعمت پر بھی اللہ کا شکر کرتا ہے جب کہ زیب و زینت کا عادی بعض اوقات ایک بڑی نعمت کو بھی اپنے معیار سے کم تر سمجھتا ہے اور شکر کے بجائے شکوہ کرنے لگتا ہے۔

○ سادگی میں بہت سی چیزیں شامل ہیں مثلاً ”پچوند لگا کپڑا پہن لینا زمین پر بیٹھ جانا، مفلس اور غریب کی بات سننے اور حتی الوسع مدد کرنے کو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھنا غریب کی معمولی دعوت قبول کر لینا اور اس کا پیش کیا ہوا سادہ کھانا کھا کر احسان مندی کا اظہار کرنا۔ ملازموں سے تحقیر آمیز رویہ رکھنے سے اجتناب کرنا اپنے سے کم تر درجے کے لوگوں کی خوشی اور غمی میں شریک ہونا وغیرہ۔“

بہترین افراد

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا آپ فرما رہے تھے۔

”کیا میں تمہیں تمہارے بہترین افراد کی نشان دہی نہ کروں؟“

صحابہ نے عرض کیا۔

”کیوں نہیں اللہ کے رسول!“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تمہارے

بہترین افراد وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ کی یاد آئے۔“

شک و سستی کی فضیلت

حضرت سل بن سعد سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

انہوں نے عرض کیا۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے زیادہ صحیح ہے۔ ہم تو اپنی معلومات کے مطابق یہ کہتے ہیں یہ شخص معزز (دولت مند) افراد میں سے ہے۔ اس کے بارے میں یہی توقع ہے کہ اگر کسی گھرانے میں نکاح کا پیغام دے تو اس کا پیغام قبول کیا جائے اگر کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے اور اگر بات کرے تو اس کی بات سنی جائے (اور اسے اہمیت دی جائے)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ (پھر ایک اور آدمی گزرا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟“

انہوں نے کہا۔ ”اللہ کے رسول! قسم ہے اللہ کی! ہم تو کہتے ہیں کہ یہ ایک غریب مسلمان ہے۔ اس کے بارے میں توقع ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اسے رشق نہ دیا جائے۔ اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے اگر بات کرے تو اس کی بات نہ سنی جائے۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”یہ (غریب مسلمان) اس (پہلے) شخص جیسے زمین

بھر آدمیوں سے بہتر ہے۔“

فوائد و مسائل : ○ غریب مسلمان اگرچہ گنہگار ہو،

دنیا والوں کی نظروں میں اس کا کوئی مقام نہ ہو لیکن اللہ

کے ہاں ایسا ایک آدمی بھی دنیا بھر کے ان انسانوں سے

بہتر ہے جو ایمان و تقویٰ سے محروم ہوں۔

○ اللہ کے ہاں اصل اہمیت اور قدر و منزلت ایمان و

تقویٰ کی ہے نہ کہ مال و دولت، شان و شوکت، ذات

برادری اور نام و نسب کی۔

○ نکاح کے لیے نیک مردوں اور نیک عورتوں کا

انتخاب کرنا چاہیے خواہ وہ غریب ہی ہوں۔ غریب

نیک آدمی امیر نیک آدمی کا ہم پلہ ہے لیکن بد عقیدہ یا

پری عادتوں والا دولت مند شخص نیک آدمی کا ہم پلہ

نہیں۔

اللہ کی محبت

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ اپنے مومن، نیک و درست سوال سے بچنے والے، ہاں بچوں والے بندے سے محبت فرماتا ہے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ناور مومن دولت مندوں سے آواہان یعنی پانچ

سوال پہلے جنت میں جائیں گے۔“

فوائد و مسائل :

○ اللہ کے ہاں ہزار سال کی مدت ایک دن کے برابر

ہے۔ اس لیے دولت مندوں سے آواہان پہلے جنت

میں جانے کا مطلب دنیا کے حساب سے پانچ سوال

پہلے جنت میں داخل ہونا ہے۔

○ پہلے جنت میں جانا ان کے بلند درجات کو ظاہر کرتا

ہے اور انہیں محشر کی مشکلات بھی کم برداشت کرنی

پڑیں گی۔

○ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دولت مندوں کو اپنی زیادہ

دولت کی آمد و خرچ کا حساب دینا پڑے گا جس میں کافی

وقت صرف ہو گا جب کہ غریب لوگ اپنی تھوڑی کمائی

کے حساب سے تھوڑی دیر میں فارغ ہو جائیں گے۔

○ دنیا میں دولت کم ملنا یا نہ ملنا بھی اللہ کی ایک نعمت

ہے لیکن اس کے ساتھ صبر ضروری ہے جس طرح

زیادہ دولت کے ساتھ شکر ضروری ہے۔

زیادہ مال رکھنے والوں کا بیان

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”زیادہ مال رکھنے والوں کے لیے ہلاکت ہے مگر جس

نے مال کو اس طرح، اس طرح، اس طرح اور اس

طرح خرچ کیا۔“

یہ فرمایا: ”ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں بائیں آگے اور پیچھے چاروں طرف (ہر طرف ایک بار) اشارہ فرمایا۔
فوائد و مسائل :

○ مال حرص اور بخل کے ذریعے سے جمع ہوتا ہے اور یہ دونوں مذموم خصالتیں ہیں۔
○ جائز طریقے سے کمایا ہوا مال بھی اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا ضروری ہے اپنی ذاتی آسائشات اور تعیشات پر مال صرف کرنا درست نہیں۔

○ سخاوت کرنے والا ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا مال اس کے لیے نیکیوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جس قدر زیادہ خرچ کرے گا اتنا ہی جنت میں بلند درجات کا مستحق ہو گا۔
فائدہ : سخاوت سے اس شخص کو فائدہ ہو سکتا ہے جس کی کمائی حلال ہو، لہذا حرام کمائی سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

زیادہ مال

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو تو میں نہیں چاہوں گا کہ مجھ پر تیسری رات آئے اور (اس وقت بھی) اس میں سے کچھ میرے پاس (بچا ہوا) موجود ہو“ مگر اتنی چیز جسے میں قرض کی ادائیگی کے لیے سنبھال رکھوں۔“
فوائد و مسائل :

○ اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا بیان اور امت کے لیے ترغیب ہے۔
○ احد ایک پہاڑ ہے اتنا سونا دو تین دن میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا، اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہی تھی کہ اگر اتنا مال بھی ہو تو وہ بھی دو تین دن میں مکمل طور پر تقسیم کر دیا جائے۔
○ قرض کی ادائیگی قرض خواہ کا حق ہے اس کی ادائیگی

سخاوت سے اہم ہے۔
○ قرض لینا دینا جائز ہے لیکن قرض لیتے وقت یہ نیت ہونی چاہیے کہ جلد از جلد ادا کر دیا جائے گا۔
○ سنبھال رکھنے کی ضرورت تب پیش آسکتی ہے جب ادائیگی کا مقررہ وقت آنے میں کچھ وقفہ باقی ہو تاکہ جب قرض خواہ مطالبہ کرے تو ادائیگی کا اہتمام کرتے ہوئے ادائیگی میں تاخیر نہ ہو جائے۔
○ اگر قرض خواہ قریب موجود ہو تو مقررہ وقت سے پہلے خود جا کر ادائیگی کر دینا افضل ہے لیکن اگر اس سے رابطہ مشکل ہو تو رقم سنبھال کر رکھنا مناسب ہے تاکہ ادائیگی جلد از جلد کی جاسکے۔

خوبی

حضرت نقاہہ (بن عبد اللہ) اسدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: انہوں نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک آدمی کی طرف بھیج کر اس سے ایک اونٹنی طلب فرمائی۔ اس شخص نے (اونٹنی دینے سے) انکار کر دیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک آدمی کی طرف بھیجا۔ اس نے ایک اونٹنی بھجوا دی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی کو دیکھا تو فرمایا: ”یا اللہ! اس میں برکت عطا فرما اور اسے بھیجنے والے کو بھی۔“
حضرت نقاہہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے کہا ”جو اسے لے کر آیا اس کے لیے بھی برکت کی دعا فرمائیں۔“
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اور جو اسے لے کر آیا (اللہ اسے بھی برکت دے۔“

پھر آپ کے حکم سے اسے دوایا گیا، اس نے بہت دودھ دیا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہلے شخص کے بارے میں جس نے انکار کر دیا تھا فرمایا: ”یا اللہ! فلاں! فلاں زیادہ فرما۔“

اور جس نے اونٹنی بھیجی تھی اس کے حق میں فرمایا: ”یا اللہ! اس کو روزگار و رزق روز دے۔“

ہلاکت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہلاک ہو جائے (بتاہ ہو جائے) دینار کا بندہ، درہم کا بندہ، کسب کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ اگر اسے دیا جائے تو خوش رہتا ہے، اگر نہ دیا جائے تو بیعت والا (وعدہ پورا نہیں کرتا)۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہلاک ہو جائے دینار کا بندہ، درہم کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ ہلاک ہو جائے اونٹن کا بندہ، اسے کاشا لگے تو نکال دے۔“

فوائد و مسائل :

○ دینا کا لفظ مذموم ہے۔
○ جب محبت و نفرت کی بنیاد محض دنیوی مفاد پر ہو جائے تو غلوں باقی نہیں رہتا۔ اس صورت میں خلیفہ المسلمین یا اس کے نائب سے بیعت بھی اللہ کی رضا کے لیے اور اسلامی سلطنت کی حفاظت اور خدمت کے لیے نہیں ہوتی، اس طرح یہ عظیم نیکی بھی تمام برکات سے محروم ہو کر رانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
○ دینی جماعتوں اور تنظیموں سے تعلق اللہ کی رضا اور ثواب کے لیے ہونا چاہیے۔ اسی نیت سے عہدہ اور ذمہ داری قبول کی جائے۔ اگر محسوس ہو کہ محنت کرنے کے باوجود جماعت میں اہمیت تسلیم نہیں کی جا رہی تو اکابر سے ناراض ہو کر جماعت سے الگ نہ ہو جائے ہاں، اگر یہ محسوس کیا جائے کہ جماعت یا تنظیم کے عہدے دار صحیح انداز سے کام نہیں کر رہے اور توجہ دلانے کے باوجود اصلاح پر آمادہ نہیں تو خاموشی کے ساتھ تنظیم سے الگ ہو جائے۔
○ درہم و دینار کے بندے سے مراد وہ شخص ہے جو دنیا

کے مال و دولت کی اتنی خواہش رکھتا ہے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا محور حصول دولت بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح وہ دولت سے خدمت لینے کے بجائے دولت جمع کرنے اور سنبھالنے میں مصروف رہتا ہے گویا دولت اس کا آقا یا معبود ہے اور وہ غلام یا پجاری ہے۔

○ دولت کے پجاری کے لیے بددعا کی گئی ہے کہ وہ تباہ ہو جائے۔ منہ کے بل کرنے اور سر کے بل اونٹن کا ہونا جانے سے بھی مراد ہے۔ کاشا لگانے کا لے جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ مشکلات میں پھنسا رہے اور اس کی بددعا اور نجات کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

قناعت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”امارت سلمان کی کثرت سے نہیں ہوتی بلکہ امیری تو دل کی امیری ہے۔“
فوائد و مسائل :

○ انسان دولت اس لیے حاصل کرتا ہے کہ اس کے کام چلتے رہیں لیکن جب دولت خود مقصود بن جائے تو پھر مال و دولت کی کثرت کے باوجود وہ سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوتا جس کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔
○ قناعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے پاس موجود رزق کو کافی سمجھے اور اپنی ضروریات کو اس حد تک محدود کرے کہ حلال روزی میں گزارہ ہو جائے۔
○ دولت مند وہ ہے جس کا دل دولت مند ہے۔ اور دل دولت مند تب ہوتا ہے جب اس میں حرص اور بخل نہ ہو۔ ایسا آدمی تھوڑے سے مال سے اتنی خوشی حاصل کر لیتا ہے جو حریص آدمی کو بہت زیادہ مال سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔



فی زمانہ حکومتوں کے بدلنے کے دو طریقے رائج اور مقبول ہیں۔ ایک بیلٹ یعنی الیکشن کا، دوسرا بیلٹ یعنی گولی کا۔ ویسے اب دونوں میں چنداں فرق نہیں رہا کیونکہ الیکشن میں بھی بیلٹ کے ساتھ ساتھ بیلٹ سے زیادہ بیلٹ کا استعمال ہونے لگا ہے اور زیادہ مؤثر اور کامیاب پایا گیا ہے۔ ہم ذاتی طور پر الیکشن کے حق میں نہیں۔ یہ خون خرابے کی چیز ہے جسے ہم نے مغرب کی اندھی تقلید میں اختیار کیا ہے۔ ہمارے بہترین بادشاہوں میں سے جن کا نام دریں حروف سے لکھتے لکھتے ہماری دوا میں خشک ہو گئی ہیں اور ملک کے سونے کے ذخائر میں معتدبہ کمی واقع ہو گئی ہے۔ اکبرؒ، جہانگیرؒ، شاہجہاںؒ وغیرہ۔ ان میں سے کون الیکشنوں کے ذریعہ برسر اقتدار آیا؟ عوام کی اکثریت کی رائے کی کوئی سند بھی نہیں۔

لوگوں کا بس چلنا تو بادشاہ غازی حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلے میں وہ ووٹ دارا شکوہ کو دیتے، حالانکہ ہم آپ جانتے ہیں کہ وہ بڑا بد عقیدہ آدمی تھا۔ ہمارے مروج کے مقابلے میں جو متدین ایثار پیشہ، درویش اور اپنے بھائیوں پر جان چھڑ گئے والے تھے۔ اس میں کوئی خاص خوبی نہ تھی بلکہ ایک بڑا عیب یہ تھا کہ کتابیں لکھتا تھا۔ اکبر اعظمؒ تو الیکشن کا فارم بھی خود نہ پُر کر سکتے تھے۔ ان کے نامزدگی کے کاغذات ابوالفضل کو پُر کرنے پڑتے۔ بادشاہ بس نشان انگشت ثبت کرتا۔ محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی سے بھی یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ اس کھٹ راگ سے گزرتے۔

امیر تیمور کو ہم قائل کر لیتے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ ہماری بات نہ ٹالتے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ اس قسم کا نذر کر کے ”آج میری ٹانگ میں درد ہے، کل الیکشن کی تاریخ کا اعلان کروں گا۔“ راتوں رات

گھوڑوں کی نقلی پیٹھ پر بیٹھ کر لشکر لے کر ”علی علی“ کرتے تو رازم کی طرف نکل جاتے، بلکہ ان کا ایک اور گھوڑا جاتے جاتے ہماری پیوس کی کلی کولات مار جاتا کہ اور دو مشورے صاحب قراں کو۔ اصولاً ”توانگریزوں کو بھی حکومت سنبھالنے سے پہلے ہندوستان میں الیکشن یا استصواب رائے وغیرہ کرنا چاہیے تھا لیکن خیر! دوسرا طریقہ بھی حکومت بدلنے کا آسان ہی مقبول اور مشہور ہے بلکہ ہمارے ہاں جمہوریت تو بدلتے سے کافور ہے اسی کا زیادہ دستور ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان دو گھسے بے طریقوں کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہے جو پُر امن بھی ہو۔ افسوس کہ ٹیلیوژن اور ریڈیو کی بدعت رائج ہونے کے باعث لوگوں میں پرانے کلاسیکی ادب کا ذوق اٹھ گیا ہے۔ ہائے کیا زمانہ تھا کہ لوگ شب و روز داستانیں کہتے سنتے رہتے تھے۔ خوش جمال بادشاہوں اور ماہ پارہ شہزادیوں کی اور تین آنکھوں والے ناپاکار دیوؤں کی اور اڑتے قانونوں کی۔ داستانوں میں اس انہماک کا ایک ضمنی فائدہ یہ تھا کہ ملک میں انقلابی شہنشاہ (افراط زر) بھی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

ان قصوں کہانیوں کے بموجب ایک بادشاہ کے لاولد مرنے پر لوگ صبح دم شہر کے دروازے میں سب سے پہلے داخل ہونے والے مسافر کے سر پر تاج رکھ کر شاہیائے بجا دیتے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے شاہ مرحوم کا کانوا زیر اس پہلے آدمی کو پہلے ہی بغلی دروازے سے یا فصیل کے برج سے رسی لٹاکر شہر کے دروازے کے پاس اندر دیتا تھا اور وہ ترکے تک سردی سے ٹھنڈا اپنے کو بادشاہی کے خوابوں سے گرما تاہاں دیکا پرارہتا تھا۔ لیکن ہم اسے محض بدگمانی سمجھتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں ولی عہد پیدا کرنے کے معقول انتظام ہوتے تھے۔ خاصے مختار حرم ہجوموں

کے بھی مہینوں کے بھی امراء و ذرائع کی ہونٹیاں اس پر مستزاد اور اولاد نرینہ کی بشارتیں اور دعائیں دینے والے اہل اللہ بھی شہر کے باہر ڈیرے بنائے بیٹھے رہتے تھے۔ شہر سے باہر لیکن اتنی دور بھی نہیں کہ لوگوں کو نذر و نیاز کے ٹوکے وہاں تک لے جانے میں وقت نہ ہو۔

علاوہ ازیں ان دعاؤں کو مستجاب بنانے اور اس معاملہ میں قدرت کاملہ کو ظہور میں لانے کے لیے محل کے اندر حبشی غلام بھی رہتے تھے جن کے سرکاری فرائض تو دن میں ختم ہو جاتے تھے لیکن اپنے آقا کی بیگمات کی فرمائش پر اور رات بھی خوشی خوشی کر لیتے تھے۔ خواجہ سراؤں کی موجودگی اس میں ملنے نہ ہوتی تھی۔ تاہم داستانوں سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہوں کی لاولدی اور صبح دم مسافروں کو بیٹھے بیٹھے کی پکائی بادشاہی ملنے کی وارداتیں خاصی ہوتی تھیں۔



ہم بادشاہت کے تہہ دل سے قائل ہیں۔ اس وقت بالخصوص مسلمان ملکوں میں جو بادشاہ ہیں وہ ہماری آنکھ کا آرا ہیں۔ ہم نے کئی بار لکھا کہ اب جو ہمیں خدائے یہ ملک دیا ہے تو اس میں ہمیشہ بادشاہت لا کر کسی کو بادشاہ یا خلیفہ بنانا چاہیے تاکہ یہ آئین دستور، پتیل پارٹی، بی این اے وغیرہ کے جھگڑے نہ اٹھیں۔ یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ ہمیں بادشاہ بنایا جاتا۔ کسی اور کو بھی بنایا جاسکتا تھا کیونکہ فی زمانہ اہلیت اور لیاقت کو کون دیکھتا ہے؟ تاہم ہماری شہنائی نہ ہوتی۔

انگلستان ہم اس لیے بھی آئے تھے کہ یہاں بادشاہت ہے۔ یہاں بھی نہ کبھی کوئی تولاولد مرے گا کیا عجب یہاں صبح دم دروازہ شہر میں داخل ہونے والوں کے حقوق تسلیم کیے جائیں، لیکن یہاں اگر پہلی مایوسی تو یہ ہوتی کہ اس شہر میں نہ فصیل ہے نہ کوئی دروازہ ہے، یہاں ہم کبل لے کر پڑ جاتے اور ہر روز اخبار نامہ خرید کر سیاہ چابی کی خبروں کا مطالعہ کرتے ایک صورت یہ بھی تو تھی کہ لوگ در بدر تلاش کرتے تھے کہ شہر میں کوئی ایسا بصرے یا کاشفرا کا نوجوان

تاجر ملے جس کا تعلق کسی پرانے شاہی خاندان سے ہو اور جو حسن صورت، لیاقت اور فطانت میں یتائے زائد ہو۔ ہم نے اسی خیال سے اپنی ڈگریاں اس ڈگری کے علاوہ جو کو آپرہ قرضہ کی نانہندی کے سلسلے میں ہم پر ایک دیوانی عدالت نے دی تھی (کوئی باہوش عدالت ایسا نہیں کر سکتی تھی) فریم کر کے اپنے ذرا تنگ روم میں لٹکادیں یہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایسے بھی جن کی پارلیمنٹ اور پارلیمنٹس تک پہنچ ہے اور خود عمل کیخبر ضرور کر دیا۔ قیامت یہ ہوتی کہ کسی نے ملکہ عالیہ کو بروقت فیملی پلاننگ کا لٹریچر نہ بھیجا تھا جس سے چند قیامتیں پہلے ہی پیدا ہو چکی تھیں بلکہ قیامت در قیامت بھی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ شہزادی ابن کے ہاں اس عزمیہ کے پیدا ہونے کی ہمیں خوشی نہیں۔ جب اور سب ہی کو بے تو ہمیں بھی ہے تاہم یہ ہوا کہ بادشاہت کی کمی میں ان کا نمبر لگ گیا ہے انچوائس

ہم کہاں تک ترے پہلو سے مرے کتے چاؤں پھر بھی اگر پہلے چار امیدواروں کو کچھ ہو جائے اور ان میں جو اولاد نرینہ ہے وہ فاتح العسل نکل جائے یعنی سب کے سب امریکی منکوحہ عورتوں سے شادی کر کے وزیر اعظم وقت کو ناراض کر لیں، یا رومن کیتھولک مسلمان یا کبیر پنتھی ہو جائیں اور یہ نومولود بچی تاج پھرنے سے انکار کر دے کہ چھوٹا ہے یا میرا پیشہ دواس سے خراب ہوتا ہے تو سلطنت دست بردست ہم تک آسکتی ہے۔ لیکن آج یہ خبر آئی کہ اس گھرانے میں ایک اور شہزادی نے جنم لیا ہے۔ یہ دچس آف گلو سسٹر کی صاحبزادی ہیں۔ ان کا بادشاہت کی قطار میں بار ہواں نمبر ہے۔

ہم نے ایک ہمدرد سے ذکر کیا اور کہا کہ گلو سسٹر پلیس میں رہنے کی وجہ سے ہم بھی ایک طرح کے ڈیوک آف گلو سسٹر ہیں کہ نہیں؟ تو کہنے لگے ”صاحب من اگر ملکہ الزبتھ ثانی کو ملکہ وکٹوریہ کی عمر ازانی ہوئی تو کچھ عجب نہیں کہ ایک سو بار ہواں امیدوار بھی پیدا ہو جائے۔ بس سیدھے اپنے وطن واپس جاؤ، اپنا وقت مت ضائع کرو۔ امیگریشن کے

رجسٹر کے مطابق تمہارا نمبر وراثت کے معاملے میں چھ کروڑ اسی لاکھ چوراسی ہزار آٹھ سو پینتیس سو الپتیس ہے۔ پھر تم کالے بھی ہو اور پرانی داستانوں میں بھی شاہی خون کی شرط ہو اگر تھی۔“

ہم نے بتایا کہ ”کالے تو ہم بیماری کی وجہ سے ہو گئے ہیں۔ جب وقت آئے گا تو اسے ملک سے گورا کرنے والی کریم منگائیں گے جس کے استعمال سے حبشی تک گورے ہو سکتے ہیں۔ اور روڈیہ یا اور جنوبی افریقہ تک کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ اب رہی شاہی خاندان کی بات ہم نے ایک پرانی کتاب میں دیکھا ہے کہ پراچین زمانے میں ہمارے جد امجد کا لبحر کے قریب ایک ریاست کے ایک طرح سے راجہ تھے۔ وہ یوں کہ بظاہر راجہ ان کے چھوٹے بھائی تھے لیکن وہ بڑے بھائی یعنی ہمارے جد امجد کا اتنا ادب کرتے تھے کہ ان کی کھڑاؤں تخت پر تو نہیں، تخت پر جگہ ہی کہاں ہوتی ہے، تخت کے نیچے رکھتے تھے۔“

ہمارے ان مہیاں نے فرمایا۔ ”یہ انگلستان ہے، یہاں انگریزی خون یعنی سفید خون کی شرط ہے۔ کا لبحر کا حوالہ نہیں چلے گا۔“

ہم نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔ ”اچھا تو اور ملکوں کے نام بتاؤ جہاں بادشاہت ہو اور جہاں جو ہر قابل کی قدر ہوئی ہو۔ اسلامی ملک ہو تو اور اچھا ہے، کیونکہ ہمیں اسلام کا بول بالا کرنے کا بھی شوق ہے۔“

ہمارے ان دوست نے چند ملکوں کے نام بتائے لیکن یہ بھی کہا کہ ”آج کل وہاں ویزا کی پابندی ہے اور پاکستانیوں کو تو بالکل نہیں ملتا۔“

اس کے بعد جیب سے پی آئی اے کا ٹائم ٹیبل نکال کر کہنے لگے۔

”بتاؤں لندن سے کون کون سی فلائیں سیدھی کراچی جاتی ہیں؟“

ہم نے منغض ہو کر کہا۔ ”رہنے دو، ہم خود دیکھ لیں گے، آدمی گزرتا دے گا تو کئی سی بات تو کرے۔“

ہم بادشاہ ہوتے تو کیا کرتے۔ اس باب میں ہم نے ایک منشور چھاپ رکھا ہے جسے خرچا ڈاک کے لیے دس روپے بیج کر ہم سے طلب کیا جاسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ملک سے ساری بری بری باتوں کا قلع قمع کرتے

پہلے قلع پھر قلع۔ جیسے کی چھٹی کرتے، لیکن افسوس وہ پہلے ہی ہونے لگی ہے۔ خیر جیسے کی دو چھٹیاں کر دیں گے۔ ہمارے عہد معدلت عہد میں ہفتے میں دو جیسے ہوا کریں گے تاکہ لوگ دل جی سے عبادت کرتے رہیں۔ جمہوریت اور سوشلزم وغیرہ کے شیطانی دوسے ان کے دل میں پیدا نہ ہوں۔ شراب کی ممانعت کرنے کا نکتہ بھی ہمارے منشور میں قلمبند بھی ہو چکی، لیکن ہرج نہیں، ہم مزید ممانعت کر دیں گے تاکہ جو لوگ نہیں پیتے وہ مزید نہ پیئیں۔ یہاں تفصیل کیادیں، آزمائش شرط ہے۔ ”مشک آنت کہ خور بوید“

تاریخ انگلستان ہم نے اس خیال سے لکھی شروع کی تھی کہ آخر میں اپنے عہد کا حال اپنے قلم سے لکھ جائیں تاکہ آنے والے مٹوں غلطیاں نہ کریں، لیکن قارئین کرام شاعر کہہ گیا ہے۔

”حب وطن از ملک سلیمان خوشتر۔“

اب ہم فرنگستان کے راج پاٹ پر لالت مار کر وطن واپس آنے اور ایک رحم دل اور بیدار مقصد تاجدار کے طور پر اپنے ملک اور رعایا کی خدمت کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ جو نبی امراء اور عمائد کا کوئی وفد ہمیں لینے کے لیے آئے گا، ہم لندن کے در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہوئے روانہ ہو جائیں گے، اس کالم کی کٹنگ سنبھال کر رکھیں۔ اپنے سب قارئین کو ہم خلعت و انعام دیں گے اور لوگوں کا منہ موتیوں سے بھر دیں گے۔ خصوصاً ان کا جو نکتہ چینی کے لیے منہ کھولنے کی کوشش کریں گے۔

(ستری و ہائی میں لکھا گیا)

✱

✱ ✱ ✱

بائیں رکھائی سے

شاہین کشید

- 1 "اصلی نام؟"
- "رضوانہ کمالی۔"
- 2 "پیار کا نام؟"
- "گھر میں ابو "انو" کہتے ہیں اور بھائی "بھول"۔"
- 3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
- "25 دسمبر / ابو طلحہ۔"
- 4 "ستارہ / تعلیمی قابلیت؟"
- "A / Aquarius لیول اور اسٹوڈیو آرٹ سے"
- 5 "نیکسٹل ڈیزائننگ کا کورس کیا ہے۔"
- "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
- "میں اور ایک بھائی / دو سر نمبر۔"
- 6 "شادی کب کرنی ہے؟"
- "کچھ کہہ نہیں سکتی ہو سکتا ہے اس سال ہو جائے۔ ہو سکتا ہے ایک سال بعد ہو۔"
- 7 "شوہر میں متعارف کرانے کا سراپ؟"
- "کسی کے سر نہیں۔ بس اتفاق سے آگئی۔"
- 8 "پہلا پروگرام / وجہ شہرت؟"
- "پہلا سیریل "پہلا چاند" جو سے ہوا تھا / اور شہرت سب نے دی۔"
- 9 "پہلی کمانی کی سیٹھی / کیا کیا تھا؟"
- "پہلا چاند کے 85 ہزار ملے تھے اور خرچ کر دیے تھے کہ مجھے خرچ کرنے میں بہت مرا آتا ہے۔"
- 10 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
- "پہلے فریش ہوتی ہوں۔ پھر شوٹ کے لیے نکل جاتی ہوں اور گاڑی میں ہی ناشتا کرتی ہوں۔"
- 11 "اپنے چہرے کے خدوخال میں کیا پسند ہے؟"

- 12 "میرے ہونٹوں کے نیچے جو تل ہے وہ پسند ہے۔"
- "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
- "اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر۔"
- 13 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
- "مجھے بھوک کنٹرول کرنا آتی ہے۔ میں بے قابو نہیں ہوتی۔"
- 14 "اپنے مسائل کس سے شیر کرتی ہیں؟"
- "کسی سے بھی نہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں خود ہی اپنے مسائل حل کر لوں اور اگر بہت زیادہ پر ابلغمز ہوں تو پھر می سے ڈسکس کرتی ہوں۔"
- 15 "کوئی گہری نیند سے بیدار کروے تو؟"
- "می ہی کرتی ہیں۔ تھوڑی چڑچڑی ہو جاتی ہوں، لیکن اٹھ جاتی ہوں۔"
- 16 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتی ہیں؟"
- "لڑکیاں ہوں تو ہاتھوں اور پیروں پر خود بخود نظر پڑ جاتی ہے اور حضرات ہوں تو بات چیت کا طریقہ دیکھتی ہوں۔"
- 17 "آئندہ دیکھ کر کیا خیالات آتے ہیں؟"
- "اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔"
- 18 "اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتی ہیں؟"
- "جب میں بہت کچھ کروں کسی کے لیے اور کوئی میری فیلنگ کو سمجھ نہ سکے۔"
- 19 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"
- "اپنے آپ کے لیے۔"
- 20 "آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟"
- "کننے کو تو بہت لوگ کہتے ہیں، لیکن میرا نہیں خیال کہ

- 21 "اگر دعا سے کوئی مل سکتا تو کسے مانگتیں؟"
- "میرے خیال میں میرے پاس سب کچھ ہے، ماں باپ بھائی عزت شہرت سب کچھ۔"
- 22 "کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی بدل دی ہو؟"
- "نہیں، کوئی خاص نہیں۔ مجھے جس کی جو بات اچھی لگتی ہے اس کو میں گہ سے باندھ لیتی ہوں۔"
- 23 "جب پہلی مرتبہ نیا جین استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟"
- "اپنے سائز کرتی ہوں۔"
- 24 "کوئی غلطی جس کو سوچ کر پشیمانی ہوتی ہو؟"
- "ہاں، ایسی بہت سی غلطیاں ہیں جو ہر انسان سے سرزد ہو جاتی ہیں اور میری اچھی عادت یہ ہے کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔"
- 25 "بہن بھائی میں کھانا پنا چھوڑا؟"
- "نہیں، جب مجھے غصہ آتا ہے تو پہلا کام ہی یہی کرتی ہوں اور دو دن کھانا نہیں کھاتی۔"
- 26 "بہن سوچا کہ کچھ عرصے بعد آپ کہاں ہوں گی؟"
- "نہیں کبھی نہیں، میں تو اپنے اگلے لمحے کا نہیں سوچتی کہ میرا خیال ہے کہ سب پر ی پلان ہوتا ہے۔"
- 27 "کھانا کس کے ہاتھ کا کھا ہوا پسند ہے؟"
- "مئی کے ہاتھ کا۔"
- 28 "پسندیدہ ناشتا؟"
- "کوئی خوراک نہیں ہے، جو بھی ناشتا ہو، کھانا ہو، بس ذائقہ دار ہو۔"
- 29 "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"
- "اچانک ہی خراب ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی بہت ہی معمولی بات سے بھی ہو جاتا ہے۔"
- 30 "جب بی وی آن کرتی ہیں تو پہلا چینل کون سا دیکھتی ہیں؟"
- "اگر میرے کسی پروگرام کا وقت ہو تو وہ چینل لگاتی ہوں اور اگر ویسے ہی کچھ دیکھنے کا سوچا ہے تو مووی چینل یا



میوزک چینل لگاتی ہوں۔"

31 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے؟ لڑکیاں یا لڑکے؟"

"کوئی بھی ہو سکتا ہے، لیکن اگر بھروسا صرف اپنے آپ پر کریں تو زیادہ بہتر ہے۔"

32 "کیا دعا سے قسمت بدل جاتی ہے؟"

"بالکل، کیونکہ دعا میں بہت اثر ہوتا ہے۔ قسمت بدلتے ہم نے دیکھا ہے۔"

33 "اپنی شخصیت میں کیا بدلنا چاہتی ہیں؟"

"دوسروں پر جلدی بھروسا کرتی ہوں۔ اسے بدلنا چاہتی ہوں اور اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال کرتی ہوں اور نقصان اٹھاتی ہوں۔"

34 "گھر آکر پہلی خواہش؟"

"داش روم جانے کی اور فریش ہونے کی۔"

35 "موت سے ڈرتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔"

36 "کون سی تقریبات میں جانا پسند نہیں؟"
 "جہاں بلاوجہ ہنسنا پڑے۔ میں پارٹی میں جانا پسند نہیں کرتی۔"

37 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
 "موبائل فون جس کے ذریعے ہمات کر رہے ہیں۔"

38 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"
 "جب مصلحت بولنا پڑے۔"

39 "تم وار جو شوق سے مانتی ہیں؟"
 "عید۔"

40 "شوہر کی سب سے بڑی برائی؟"
 "مناظر بہت ہوتے ہیں۔ مطلب بہت ہوتے ہیں۔ مطلب کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں۔"

41 "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"
 "سوکر، کمرے کی صفائی کر کے، کوکنگ کر کے۔ مجھے کوکنگ کرنے میں بہت مزا آتا ہے۔"

42 "شہرت، رحمت یا زحمت؟"
 "رحمت ہے لیکن اگر عزت کے ساتھ ملے تو۔"

43 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
 "جب آپ کچھ کرنا چاہیں اور نہ کر سکیں تو یہی سوچ آتی ہے کہ کیا فائدہ ایسی زندگی کا۔"

44 "ایک سوال جو برا لگتا ہے؟"
 "آئندہ پانچ دس سال بعد آپ کہاں ہوں گی۔"

45 "کوئی لوکا مسلسل گھورے تو؟"
 "اس کی اپنی مرضی ہے، گھورتا ہے تو گھورتا ہے۔"

46 "سارے دن میں آپ کا پسندیدہ وقت؟"
 "جب میں گھر آتی ہوں اور فریش ہوتی ہوں۔ وہ وقت اور جب میں ٹی وی دیکھ رہی ہوتی ہوں۔"

47 "ایک عادت جو شوہر کے لوگوں کو بھی معلوم ہے؟"
 "ہاتھوں پر یوں میں لوشن لگانے کی، سیٹ پہ جو سینے کی عادت۔"

48 "کب چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟"
 "برے سینس میں تو چیخنے چلانے سے اپنی انرژي دے دیتی ہے۔ جب کوئی میری بات نہیں سمجھ رہا ہو تو میں

خاموش ہو جاتی ہوں۔"

49 "کس لمحے نے زندگی بدل دی؟"
 "کسی لمحے سے نہیں بدلتی بلکہ زندگی تو ہر موڑ پر بدلتی ہے۔ اچھے برے احساسات کا نام زندگی ہے۔"

50 "صحیح جوہری لگتی ہے؟"
 "اگر کوئی بچے دل سے کر رہا ہے اور اپنا قیمتی وقت آپ کو دے رہا ہے تو مجھے برا نہیں لگتا۔"

51 "ایک رشتہ جس نے دکھ دیا؟"
 "نہیں ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

52 "غصہ کب آتا ہے؟"
 "جب کوئی میری بات سمجھ نہیں رہا ہوتا۔"

53 "فقیر کو کم سے کم کتنا ملتی ہیں؟"
 "جتنا اس وقت میرے پاس ہو۔ فقیر کو دیکھ کر اس کی مدد کرتی ہوں، بٹے کنوں کی نہیں۔"

54 "کن باتوں پہ کنٹرول نہیں؟"
 "میں کسی سے ناراض نہیں رہ سکتی۔"

55 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"
 "زندگی میں آپ کو ایک سے زیادہ افراد بھی متاثر کر سکتے ہیں۔ عشق، محبت اور پیار میں فرق ہوتا ہے۔"

56 "آپ کی محبت کا پیمانہ؟"
 "اگر آپ لڑکی اور لڑکے والی محبت کی بات کر رہی ہیں تو مجھے محبت اس سے ہوگی جو میرا شریک سفر بن کے میری زندگی میں آئے گا۔"

57 "پسندیدہ صحافی؟"
 "ہر بندہ، ہر صحافی اپنے شعبے میں اچھا کام کر رہا ہوتا ہے۔ کسی کا نام نہیں لوں گی۔"

58 "کبھی اپنی غلطی کا اعتراف کیا؟"
 "ہاں جی، اپنی بار۔ بہت صاف دلی کے ساتھ۔"

59 "ایک انوکھی خواہش؟"
 "کوئی انوکھی خواہش نہیں کرتا۔ ہر کوئی وہی خواہش کرتا ہے جو پوری ہونے کی امید ہو۔ میری خواہش ہے کہ میں ایک "گے ٹور" پہ جاؤں۔"

60 "میں اس سچ کا پیار سچا ہوتا ہے یا ناخواندانی ہوتی ہے؟"
 "کہتے ہیں کہ پہلا پیار بڑا سچا ہوتا ہے جو کبھی نہیں

بھولتا۔"

61 "گھر والوں کی کس بات سے موڈ آف ہو جاتا ہے؟"
 "اگر میں کبھی دیر سے آؤں تو میری کاموڈ آف ہو جاتا ہے تو میرا بھی موڈ آف ہو جاتا ہے کہ کیا میں اپنے لیے ٹائم نہیں نکال سکتی۔"

62 "کن چیزوں پہ بہت خرچ کرتی ہیں؟"
 "پکڑوں پہ، جو توں پہ، بیکنز پہ۔"

63 "فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتی ہیں؟"
 "لوگوں کو دیکھتی ہوں اور نظرس خود بخود مختلف چیزوں کا جائزہ لے رہی ہوتی ہیں۔"

64 "کس چیز کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟"
 "فریش جوہر۔"

65 "کس شخصیت کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟"
 "بہت سے لوگ زندگی میں اہم ہوتے ہیں، لیکن زندگی کا کام چلتے رہتا ہے۔ کسی کے آنے جانے سے زندگی نہیں رکتی۔"

66 "کس بات سے خوفزدہ رہتی ہیں؟"
 "کہ میری وجہ سے کسی کا دل نہ دگھے۔"

67 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت؟"
 "اچھی تو یہ کہ سب سے فرینک ہوتی ہوں اور کیونیکیشن کب نہیں رکھتی اور بری عادت یہ کہ بہت جلد کوئی بات دل کو بری لگ جاتی ہے اور میرا منہ بن جاتا ہے۔"

68 "آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟"
 "کروٹ لیتی ہوں۔ سونے کی کوشش کرتی ہوں یا Net پہ بیٹھ جاتی ہوں یا ٹی وی آن کر لیتی ہوں۔"

69 "ایک شام جو اپنی پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں؟"
 "ایسی تو کوئی شخصیت نہیں ہے۔ جو بھی وقت گزاروں گی اپنی فیملی کے ساتھ گزاروں گی۔"

70 "کس ملک کے لیے کتنی ہیں کاش یہ ہمارا ہوتا؟"
 "کسی کے لیے نہیں، صرف اپنا ملک ہی سب کچھ ہے۔"

71 "اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ جملہ؟"
 "میا۔"

72 "بستر لیٹتے ہی نیند آ جاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"
 "جب بہت نیند آ رہی ہو تو بستر لیٹتے ہی سو جاتی ہوں۔"

73 "انسان کا بہترین روپ مرد یا عورت؟"
 "عورت، کیونکہ ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہے۔"

74 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ چٹائی یا ڈائنگ ٹیبل؟"
 "کپنی پر منحصر ہے۔"

75 "کون سے الفاظ یا محاورے زیادہ استعمال کرتی ہیں؟"
 "ذیل، آئی مین۔"

76 "مرد کو کب برے لگتے ہیں؟"
 "جب بلاوجہ اپنے مزہ ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔"

77 "پیدہ کس شکل میں جمع کرتی ہیں؟"
 "گولڈ کی شکل میں۔"

78 "اگر مذہب میں ایک قتل کی اجازت ہوتی تو؟"
 "کسی کو نہیں، کیونکہ میں تو لال بیگ کو نہیں مار سکتی۔"

79 "بیڈ کی سائڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہیں؟"
 "ذرائع فروٹ، لوشن، روز وائر بول، ٹیپ اور موبائل فون۔"

80 "آپ کی ایک عادت جو گھر والوں کو پسند نہیں؟"
 "شاید، میرا ایک دم ناراض ہو جانا اور جلدی غصے میں آ جانا۔"

81 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
 "محبت دے کر محبت لی ہے۔"

82 "کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
 "اپنا والٹ، موبائل فون اور سب سے بڑھ کر ماں کی دعا۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
 "ہر چیز کو زوال ہے۔ یہ تو ایک نیچل پروکس ہے۔"



’ٹوٹے ہوئے پرکئی فنکار‘

عائشہ خان سے ملاقات

شاہین رشید

دینے کے لیے بلاوجہ بہانے بناتے ہیں۔ وقت کی کمی ان کا خاص بہانہ ہوتا ہے اور۔۔۔ چلیں جانے دیں۔ اللہ انہیں اور ترقی دے۔

عائشہ خان نئی نسل کی نمائندہ فنکار ہیں۔ ”ٹوٹے ہوئے پر“ نے انہیں راتوں رات مشہور کر دیا اور ناظرین نے ان کی پرفارمنس کو بے حد سراہا۔ اصل میں کسی بھی کردار کی مقبولیت میں فنکار کی محنت تو ہوتی ہے، لیکن زیادہ سرائے کے قابل وہ رائٹر ہے جو اتنا مضبوط کردار تخلیق کرنا ہے کہ فنکار کو پرفارم کرنے

کچھ ڈراموں کے کردار ایسے ہوتے ہیں جو فنکار کو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پہ پہنچا دیتے ہیں۔ تب فنکاروں کے خیرے قابل دید ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ پانچ چھ سال سے وہ شہرت کو پانے کی جدوجہد میں مصروف عمل تھے اور آج جب انہیں کچھ مل گیا ہے تو بجائے ان میں انکساری آنے کے وہ اتنے مغرور ہو گئے ہیں کہ کسی سے بات کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اور ایسا کوئی ایک فنکار یا فنکار نہیں کرنا، بلکہ آج کل کی نسل میں بیشتر فنکار ایسے ہیں جو انٹرویو



میں زیادہ مشکل بھی پیش نہیں آتی اور وہ انجوائے بھی کرتا ہے۔

”لیکنی ہو۔ بہت مصروف رہتی ہو کہ بات کرنے کی بھی فرصت نہیں ہے؟“

”اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ٹھاک ہوں اور ایسی بات نہیں کہ بات کرنے کی فرصت نہیں۔ بات تو میں کر لیتی ہوں، مگر انٹرویو کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہے اور واقعی میں بہت مصروف رہتی ہوں، مگر آج ٹائم ہے آپ کے لیے۔“

”شکریہ۔ کیا کیا پروجیکٹ ہیں آج کل؟“

”یہ مت پوچھیں۔ بس یہ سمجھ لیں کہ کافی کام ہے اور سب انڈر پروڈکشن ہیں اور کب کون سا سیریل یا سوب آف ایر آجائے کچھ کہہ نہیں سکتے، ویسے ”ٹوٹے ہوئے پر“ کی ریکارڈنگز بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔“

”اداکاری میں سینئر فنکاروں نے مدد کی یا ڈائریکٹر

نے؟“

”سینئر فنکار بہت اچھے ہیں، لیکن مجھے اگر کچھ سکھایا ہے تو محسن مرزا اور بابر جاوید نے اور ان ہی کی وجہ سے مجھے یہ کردار کرنے میں آسانی ہوئی۔“

”آج کل تو کمر سے لکنا مشکل ہوتا ہو گا ناظرین پہچان لیتے ہوں گے؟“

”جی بالکل پہچان لیتے ہیں۔ اور بہت پیار سے ملتے ہیں۔ میرے کردار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ مثلاً ”جو لوگ ٹوٹے ہوئے پر“ شوق سے دیکھتے ہیں وہ شروع شروع میں کہتے تھے کہ ہمیں اجیہ بہت اچھی لگتی ہے، مگر لڑکی کو اتنا بولڈ نہیں ہونا چاہیے پھر میرا اس سیریل میں سنجیدہ رول شروع ہوا تو ملنے والوں نے کہا کہ ہمیں ہمیں تو پہلے والی اجیہ ہی اچھی لگتی تھی۔ آپ کے چہرے پر سنجیدگی سوٹ نہیں کر رہی اور دلچسپ بات بتاؤں غڑگوں کو شوخ و چٹپل اجیہ اچھی لگتی تھی اور لڑکیوں کو سنجیدہ اجیہ۔“

”آئندہ کس قسم کے کردار لینے ہیں؟“

”ایسے کردار جو پاور فل ہوں، جن کو کرتے وقت تھوڑی محنت کرنی پڑے، تھوڑا مشاہدہ کرنا پڑے، خواہ وہ نیگیٹو ہوں یا پوزیٹو، بس ہوں پاور فل۔“

”نیگیٹو رول سے تو تمہاری شخصیت پر برا اثر پڑے گا اور ابھی تو تمہیں بہت آگے جانا ہے مارڈن رول نہیں کرو گی کیا؟“

”ایسے نیگیٹو رول نہیں کروں گی کہ جس سے ایج خراب ہو، اتنی تو میں احتیاط کروں گی۔ ہاں ایسے مارڈن رول یا بولڈ رول جن کو دیکھ کر لوگ وائٹل میں انگلیاں دیں، ہرگز ہرگز نہیں کروں گی۔ کیونکہ اگر مجھے اس فیلڈ میں آنے کی اجازت ملی ہے تو کچھ شرائط کے ساتھ اور ویسے بھی لی وی فیلڈ کے سب لوگ دیکھتے ہیں۔ انسان کو اتنا تو خیال رکھنا چاہیے کہ شرمندگی نہ ہو اپنے بزرگوں کے آگے۔“

”تم نے کہا کہ گھر والوں کی کچھ شرائط کے ساتھ اس فیلڈ میں آئی ہوں۔ تو گھر والے راضی نہیں تھے کیا؟“

”جی ہاں۔ گھر والوں کی اجازت نہیں تھی اور

بنیادی طور پر میں خود بھی کوئی بہت بولڈ قسم کی لڑکی نہیں ہوں۔ بس اتفاقاً اس فیلڈ میں آئی۔ تو اچھا لگا“

گھر والوں نے شروع میں تو اجازت نہیں دی نہ ہی کسی قسم کی پسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن جب آصف رضا میرا نکلنے ڈرامے میں کام کرنے کی پیش کش کی تو گھر والوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

”اب خوش ہیں کہ والے تمہارے؟“

”جی خوش ہیں۔ اور اس فیلڈ میں اچھا خاصا کام کرنے کے باوجود شوٹ کے لیے اکیلے آنے جانے سے ڈرتی ہوں، اس لیے کوئی نہ کوئی فیملی ممبر میرے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔“

”تم نے کہا کہ اتفاقاً آئی اس فیلڈ میں۔ تو یہ اتفاق کیسے ہوا؟ اور کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ کو جو ان کے ہوئے؟“

”اتفاقاً یوں کہ جب میں پندرہ یا شاید سولہ سال کی تھی تو کالج کے کسی مقابلے میں میں نے حصہ لیا وہاں کچھ ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ میری ریفارمنس دیکھ کر ایک ایجنسی سے کال آئی، کمرشل کرنے کے لیے۔ بس میں نے ہائی بھری“

”میں نے کبھی نہیں سوچا تھا اس فیلڈ میں آنے کا؟ اور کیسا لگتا ہے اس فیلڈ میں آکر؟“

”کیونکہ میری اس طرح کی کوئی پلاننگ نہیں تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں تو صرف دھیان پڑھائی کی طرف ہی ہوتا ہے۔ بس وہ اچانک ہی سب کچھ ہو گیا اور رہی یہ بات کہ فیلڈ میں آکر کیسا لگتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔ لیکن کبھی بھی ایسا لگتا ہے کہ اس فیلڈ میں آکر میں نے غلطی کی ہے۔ کیونکہ یہاں کا

ماحول میری سوچ سے بہت مختلف ہے۔“

”کیا ماحول خراب ہے؟“

”نہیں۔ خراب تو نہیں کہہ سکتی، ہر انسان کے سوچنے سمجھنے کا ایک انداز ہے، میری تربیت اس انداز کی ہے کہ میں آزادانہ ماحول میں اپنے آپ کو مس فٹ سمجھتی ہوں۔ اور یہاں سب لوگ دوسروں کو اپنی سوچ کے مطابق لیتے ہیں۔ مثلاً ”میں جیسی ہوں“ میرا خیال ہوتا ہے کہ سب ایسے ہی ہوں گے، مگر ایسا نہیں ہے، لوگوں کی اکثریت میری سوچ سے بہت مختلف ہے۔ اس لیے کبھی کبھی لگتا ہے کہ میں نے اس فیلڈ میں اگر غلطی کی ہے۔“

”پھر تو نئے پروجیکٹ کو سامن کرتے وقت بھی بہت مشکل پیش آتی ہوگی تمہیں؟“

”ہاں آتی تو ہے، اس لیے بہت احتیاط سے پروجیکٹ سامن کرتی ہوں، تو جن لوگوں کو میں جانتی ہوں اور جن کی شہرت اچھی ہوتی ہے اور جن کے ساتھ کام کرنے پر گھر والوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا“ ان کے ساتھ کام کو ترجیح دیتی ہوں، جن کو نہیں جانتی ان کو انکار کر دیتی ہوں۔“

”گویا کبھی فیلڈ کو چھوڑنا پڑے تو تمہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“

”بالکل بھی مشکل نہیں ہوگی، کیونکہ مجھے اپنی پڑھائی بھی مکمل کرنی ہے اور پڑھائی اگر ڈسٹرب ہوئی تو فیلڈ کو چھوڑ دوں گی، کیونکہ مجھے اپنی تعلیم کے ذریعے ہی آگے بڑھنا ہے۔ مارکیٹنگ میرا سبجیکٹ ہے اور میں اس میں جاب بھی کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس فیلڈ میں مزا آ رہا ہے اور مجھے اچھا بھی لگ رہا ہے شہرت پا کر۔ مگر تعلیم ہر حال میں پہلے ہے۔“

”لیکن بہت پرانی کمات ہے کہ شہرت کا مزاحمہ کو لگ جائے تو اس سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے؟“

”کیا خیال ہے تمہارا؟“

”آپ کسی حد تک ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے ایسا لگا تو ہو سکتا ہے اس فیلڈ کو نہ چھوڑوں اور ہو سکتا ہے کہ میں پروجیکشن ڈائریکشن میں چلی جاؤں۔“

”جو لڑکیاں اس فیلڈ میں آتی ہیں وہ تو فلموں میں جانے کا سوچتی ہیں اور تم۔“
 ”ارے نہیں۔ میں بہت مختلف قسم کی لڑکی ہوں۔ اپنے گھر کے ماحول کی عادی اور عزت۔ فلموں میں جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ بے شک مجھے فلمیں دیکھنا اچھا لگتا ہے، لیکن کام کرنا نہیں۔ میرے بغیر بھی بہت صحیح چل رہی ہے انڈسٹری۔“

”اس فیلڈ میں اگر از خود کیا سیکھا؟“
 ”بہت کچھ سیکھا ہے۔ اب مجھ میں بہت زیادہ خود اعتمادی آگئی ہے۔ بہت کچھ فیس کرنا آگیا ہے۔ بولنا آگیا ہے، اچھے برے کی تمیز آگئی ہے۔ لوگوں کو پہچانا آگیا ہے، بہت سیکھا ہے میں نے اس فیلڈ میں۔“
 ”گفتہ تو کیا پہلے تمہاری شخصیت میں یہ خوبیاں نہیں تھیں؟“

”نہیں۔ مگر نہ ہونے کے برابر۔ گھر سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے گھر۔ اسکول کالج میں بھی یہی حال تھا۔ مگر اس ماحول میں اگر ہر اور کچھ کو فیس کرنا آگیا ہے۔ جو ڈر اور خوف پہلے تھا مجھ میں کافی حد تک دور ہو چکا ہے۔ پہلے بیڑوں کی انگلی پکڑ کر چلتی تھی۔ اب اکیلے چلنے میں بھی ڈر نہیں لگتا۔ پہلے ڈرپوک تھی اب ہمدرد ہو گئی ہوں۔ اب دوسروں کی بات ماننا اور اپنی بات منوانا آگیا ہے۔“

”چلو اب اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔“
 ”جناب! میرا اور میرے آباؤ اجداد کا تعلق حیدر آباد سے ہے اور میں 15 جنوری کو کراچی میں پیدا ہوئی ہوں۔ میرے دو بھائی اور ایک بہن ہے اور میںوں مجھ سے چھوٹے ہیں۔“

”اب تو تم بولڈ ہو گئی ہو پہلے کی یہ نسبت۔ تو شادی اپنی پسند سے کرو گی یا والدین کی پسند سے؟“
 ”میں بولڈ ضرور ہو گئی ہوں، لیکن اتنی بھی نہیں کہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کروں اور وہ بھی شادی کا۔ میرے والدین میرے لیے سب کچھ ہیں، وہ میرے

لیے جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہو گا۔“

”پڑھائی میں کیسی ہو۔ اوسط یا بہت تیز؟“
 ”اوسط اور نہ ہی بہت زیادہ تیز، لیکن میں اپنے آپ کو ایک اچھی طالبہ کہہ سکتی ہوں اور اس کا اندازہ آپ اس سے لگا میں کہ اسکول کالج اور اب یونیورسٹی میں کبھی چھٹی نہیں کرتی، تاوقت کہ کوئی بہت مجبوری نہ ہو جائے۔“

”اس فیلڈ کی لڑکیوں کے جب میں انٹرویو کرتی ہوں تو عموماً وہ یہ ہی کہتی ہیں کہ ہم نے تو اپنا بچپن ٹام بوائے کی طرح گزارا ہے۔ لڑکیوں والی تو ہم میں کوئی عادت ہی نہیں تھی تم اپنے بارے میں کیا کہو گی؟“
 ”اور اگر میں اپنے بارے میں بھی یہی کہوں تو شاید آپ کو یقین نہیں آئے گا، لیکن یہ سچ ہے کہ میری زندگی بھی ایسی ہی گزری ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ میں اس فیملی سے تعلق رکھتی ہوں جہاں جوائنٹ فیملی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ جہاں رشتوں کا بہت احترام کیا جاتا ہے تو میں نے آنکھ ہی جوائنٹ فیملی میں کھولی اور اتفاق دیکھیں کہ میرے دوھیال میں لڑکیاں کم اور لڑکے زیادہ ہیں۔ تو میرا سارا بچپن اپنے نرنگے ساتھ گزرا۔ تو میں نے بھی لڑکوں والی زندگی گزار لی ہے۔“

”لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کودنے والی لڑی میں خود اعتمادی کی کمی کیوں ہوئی؟“

”خود اعتمادی کی کمی سے مطلب یہ نہیں کہ مجھ میں کچھ کرنے کی صلاحیت یا کوئی قدم اٹھانے کی صلاحیت نہیں تھی۔ آج خود اعتمادی تھی تو میں اس فیلڈ میں آئی۔ مسئلہ یہ تھا کہ چونکہ دوھیال میں لڑکیاں کم تھیں تو بس انہیں ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھا جاتا تھا۔ ورنہ تو جناب میں نے بچپن میں تمام کھیل لڑکوں والے کھیلے ہیں۔ کپڑے بھی لڑکوں والے ہی پہنتے ہیں۔ سب میرے بارے میں کہتے تھے کہ اس میں تو لڑکیوں والی بات ہی نہیں ہے، لیکن جب بڑی ہوئی تو احساس ہوا کہ اللہ نے جس کو جیسا بنایا ہے اسے ویسا ہی رہنا چاہیے۔ اسی میں انسان کی خوب صورتی ہے۔“

عظیم



ساتھ ہوں تو پھر جی بھر کے خرچ کرواؤں ہوں، ویسے انسان کو کفایت شعار ہی ہونا چاہیے۔“

”کن چیزوں پر زیادہ خرچ کرتی ہو؟ اور کیا کیا مشاغل ہیں اداکاری کے علاوہ؟“

”کچھ مخصوص نہیں ہے، جو پسند آجاتا ہے، خرید لیتی ہوں، ان میں کپڑے، جوتے، بیک، ریفورمز سب کچھ ہی شامل ہے اور اداکاری کے علاوہ کافی مشاغل ہیں۔ مجھے گلاس پیئنگ کا شوق ہے، کبھی کبھی اس پر طبع آزمائی کرتی ہوں اور چونکہ مجھے یکسانیت پسند نہیں تو کھری چیزوں کی ترتیب بدلتی رہتی ہوں۔“

”پھر تو امور پچن سے بھی لگاؤ ہوگا؟“

”جی، بہت زیادہ۔ ہاتھ میں ڈاٹھ ہے۔ سب ہی میرے ہاتھ کے پکے کھانے پسند کرتے ہیں اور چونکہ میرا تعلق حیدر آباد سے ہے تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ حیدر آبادی کھانے کتنے مشہور ہیں، تو بہت کچھ پکالتی ہوں۔ مجھے پچن میں کام کرنا اچھا لگتا ہے۔“

”پکانے کا شوق ہے کھانے کا بھی ہے؟“

”میں سمجھتی ہوں کہ جس کو کھانے کا شوق ہوگا“

اسی کو پکانے کا بھی شوق ہوگا۔ کوئی کام دلچسپی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ دلچسپی ہی سب کام کروانے پر مجبور کرتی ہے۔ مجھے کھانے کا بہت شوق ہے، اور اپنے ہاتھ کے پکے ہوئے اور مہما کے ہاتھ کے پکے کھانے بہت شوق سے کھاتی ہوں، گھر سے باہر کھانا کبھی کبھار ہی کھاتی ہوں۔“

”میوزک سے لگاؤ تو ہوگا؟“

”جی بالکل ہے۔ آج کے دور میں کون تو جوان ہوگا جس کو میوزک سے لگاؤ نہ ہو، بلکہ ہر دور میں میوزک روح کی غذا رہی ہے۔ تو مجھے بھی شوق ہے، مگر موڈ کے لحاظ سے میری پسند بدلتی رہتی ہے، ایسا نہیں کہ ہمیشہ پاپ اچھی لگے یا غریبیں، جیسا موڈ ہوتا ہے ویسی ہی میوزک سنتی ہوں۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عائزہ خان سے اجازت چاہی۔

”آج کل جو ملک کے حالات ہیں، ان کے بارے میں سوچتی ہو، یا یہ کہو گی کہ مجھے تو سیاست سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے؟“

”میں ایسا بھی نہیں کہوں گی کہ مجھے سیاست سے دلچسپی نہیں ہے، کیونکہ اب تو سیاست بھی ہماری زندگی کا حصہ ہے اور جو آج کل کے حالات ہیں، ان سے غافل رہنا حماقت ہے۔ میں بالکل اپنے ملک کے بارے میں سوچتی ہوں اور اس کی سلامتی کے لیے دل و جان سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں اور اکثر ایسی محفل میں سیاست پر بحث ہو رہی ہو تو ضرور حصہ لیتی ہوں۔“

”قسمت پر کتنا یقین ہے؟“

”مکمل یقین ہے، آپ اپنی ہی مثال دوں گی کہ میں اس فیلڈ میں بغیر کسی پلاننگ کے آئی اور میرے لیے راستے خود بخود ہموار ہوتے گئے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے مقدر میں اس فیلڈ میں آنا لکھا ہوا تھا۔ بعض کام انسان کی سوچ کے برخلاف ہوتے ہیں، مگر چونکہ مقدر میں لکھے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے وہ ہو کر رہتے ہیں۔“

”فضول خرچ ہو؟“

”نہیں زیادہ نہیں اور مزے کی بات یہ کہ اپنے پیسے سے کچھ خریدنا پڑے تو تجھ سے آجاتی ہے، لیکن اگر پیلا

عظمت

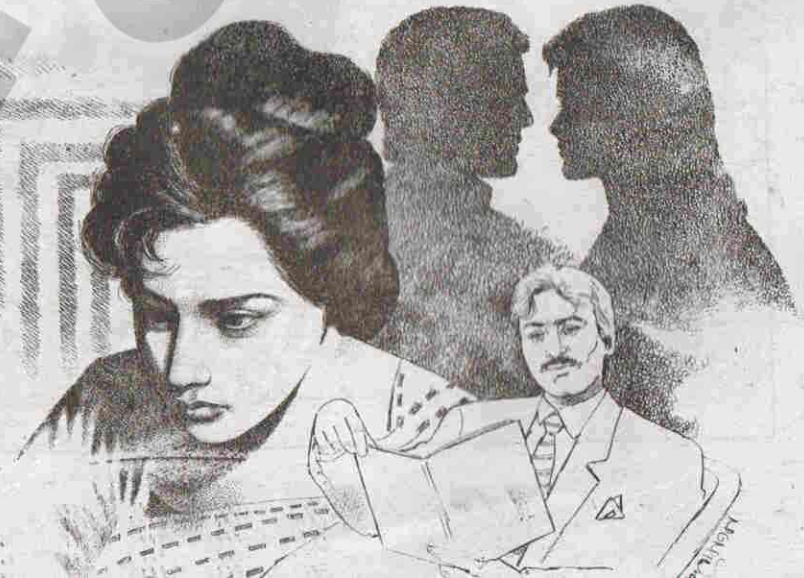
سیرۃ النبیؐ

پروفیسر عباس رشید کا گہرا علمی و تہذیبی اعتبار سے ٹل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاکر دین ان کے علمی خزانے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھر پر ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادی اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ توہر، عثمان اور عبید۔

بڑی بیٹی توہر ماں کی لازمی ہے۔ دورانِ تعلیم غیر تصانی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گستاخی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ توہر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی ہے۔ ایک بیٹی کو گیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ذہنی کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے باجول اور پر اعتماد نقصان سے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونیورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کمالات ہے کہ گزراوقات اچھی ہو جائے۔

عبید آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی



علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے، وہ حالات کو حساس انداز میں دیکھتی ہے۔ عبیرہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ شریا بھی عبیرہ کی دوست ہے۔

وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیرہ اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ یہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی نانی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیرہ کا گروپ یوم پاکستان کے خوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا یہ اٹھانے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیرہ دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور دھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کر دیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف ایسا نرمل جاتا ہے بلکہ ڈراما آؤٹس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیرہ کو سب سے زیادہ شو میں کرن شہریار کی موجودگی مسور کرتی ہے، جو محض عبیرہ کی خاطر طویل سفر طے کر کے شویہ مینے آئے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیرہ کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیرہ کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ اچھا دیتی ہے۔

۲۶

چھٹی سون قادیب

صبح سے اس کے خیالات بے ربط ہو رہے تھے۔ اچھے ہوئے، جنگل سرول کا وہ ایک کونا پکڑتا تو دوسرا ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ ادھر بچکن کے اسٹور پر رکھی کیشی ایک تسلسل سے سیٹی بج رہی تھی۔

”مجھے بھی دیکھو، میری بھی سنو۔“ میز پر کھلی اور جا بجا فیک کی ہوئی جمال کی فائل کھتی تھی ”مجھے بھی دیکھو، میری بھی سنو۔“

”آخر کس کس کی سنے انسان۔“ کافی کے خشک بھورے سفوف پر ابلتا پانی ایک دھار سے گراتے فاروق نے قدرے آکٹا ہٹ سے سوچا۔ مک کے کنارے ٹیبلے بھاگوں سے لبریز ہو گئے اور کسی ایک طرف بھی اس کی توجہ مکمل طور پر مبذول نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ مک اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی موبائل کی اسکرین روشن تھی۔ اس نے بے پروائی سے دیکھا۔ وہاں حروف نہیں ہند سے جل بچھ رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں نم ہوتا بھاپ اڑاتا مک تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں کان سے لگائے موبائل کے اسپیکر سے جو آواز ابھری، اس کی توقع وہ کسی قیمت پر بھی نہیں کر رہا تھا۔

”میں شہریار بول رہا ہوں۔ کسی کام سے اسلام آباد آیا تھا، سوچا تم سے ملتا جاؤں اگر تمہارے پاس وقت ہو۔“

”وقت ہی تو ہے میرے پاس۔“ اس کی آواز میں اتنی ایکسانٹنٹ کہاں سے آگئی تھی۔ اس کے اپنے کانوں نے بھی خود کو صبح سے پہلی دفعہ اس بے ساختگی سے خوش ہوتے سنا تھا۔

”میں نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔ اگر تم نے بھی نہیں کھایا تو کیسے چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”اگر تم بہت اگلیز نہیں ہو تو تمہاری طرف آجاتا ہوں۔“

”بولو! تمہیں کہاں سے پک کروں؟“

”میرا کوئی مسئلہ نہیں، میں یا آسانی تم تک پہنچ جاؤں گا لیکن میرا خیال تھا، ہم سڑکوں پر پھریں گے۔ دراصل آج میں تمہاری آنکھ سے اسلام آباد دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”اس کا مطلب فیصلہ کر آئے ہو کہ اسلام آباد کو ناپسند کر کے جاؤ گے، آؤ میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”کیا چیز مشترک ہوتی ہے کچھ لوگوں میں۔“ اس نے — کافی سے بھرا مک اپنے سامنے رکھتے لمحے بھر کو سوچا۔ ”مگر فاصلے ختم ہو جاتے ہیں۔“

”غالب ندیم دوست سے۔“

کتنی دیر گزر گئی مگر اس نے ایک گھونٹ نہیں بھرا تھا۔ کرسی گھسیٹ کر مک سامنے دھرے اس نے عادتاً ہی غالب کا مصرع دہرایا تھا۔ معلوم نہیں اس سست سے جو ہوا چلتی ہے وہ کیوں خوشبوؤں بھری مک سے اس قدر بو جمل ہوتی ہے۔ فضا میں کچھ دیر پہلے، پھیلی کافی کی سوندھی باس اب بچھ کے رہ گئی تھی۔ مرغولوں کی شکل میں مک سے اٹھتے بھاپ کے کیلے جھونکے فضا میں کہیں تحلیل ہو کر غائب ہوئے۔ سب پر حاوی تھا تو ایک انتظار۔

وہ کب آتا ہے۔ چپ چاپ سامنے بڑی کافی سے اس نے ایک بڑا گھونٹ بھرا۔

”دنیا کی سب سے بڑا لقمہ چیز ٹھنڈی ہوئی ہوئی کافی ہے۔“

کم از کم ایک حتمی فیصلہ تو اس نے کیا۔ خواہ وہ اس طرح نیم گرم مشروب کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو۔

اسنے دن ان لوگوں کے درمیان رہتے۔ وہ شہریار کے مقام سے اچھی طرح آگاہ ہو گیا تھا۔ ان سب کی گفتگو میں ہر چوتھا پانچواں جملہ شہریار سے متعلق ہوتا تھا۔ وہ خود اس دن کی ادھوری سی ملاقات کے بعد اس کے بارے میں لا تعداد مرتبہ سوچ بیٹھا تھا۔

”مشغول ہوں بندگی تو تراب میں۔“

واہ غالب صاحب آپ بھی کمال ولی تھے، آپ کو کیسے پتا چلا، پونے دو سو سال بعد ایک شخص ہائی رازنر فلیٹ کے

ایک خاموش اور اداس کمرے میں ابھرنے والی ایک انجانی سی چاب کا اس شدت سے منتظر ہو گا۔ اس کو تو اتار سے دھڑکتی ہوئی دھڑکنوں کے درمیان شہ پرنا کہ نہیں کہیں سے کوئی سیٹ غائب بھی ہو رہی ہے۔
 ”غالب ندیم دوست سے۔۔۔“
 ”حد ہوتی ہے بچنے کی۔۔۔“ اس نے خود کو جھڑکا۔



فاروق نے لبار ٹمنٹ کی کھڑکی سے نیچے جھانکا گول گھماؤ والے چوک کے اوپر ایستادہ جیو میٹرککل ڈیزائن کا خوب صورت نقش سینٹ کے دائرے کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ اوپر سے دیکھو تو ہر چیز چھوٹی اور حقیر نظر آتی ہے۔ رفلک اس تیز رفتاری سے گزر رہا ہے کہ لگتا ہے وہی گاڑیاں ہیں جو اس گول چکر کے گرد دیوانہ وار گھوم رہی ہیں۔ چوخیوں کے پھولے پھولے گھیروں کے ساتھ۔۔۔ دیوانہ وار۔۔۔ می رقصہ بانچے ہیں جو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ایک ہی دائرے میں گول گول گھومتے ہیں۔

Ringo Ringo Roses

یابانی کے تسلی میں موم بتی کے گلاسے سے چلنے والی کشتی، گھومتی اور رڑاتی جاتی ہے۔ اپنے طور پر تو انسان بڑا طویل سفر طے کر آیا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ ایک دائرے کے گرد ہی گھوم رہا ہے اور یہ بھی سچ ہے اس نے پھر سوچا اس کے حالات خطرناک حد تک بے ربط ہو رہے ہیں۔
 وقفے وقفے سے سرکاری گاڑیاں بھی گزرتی ہیں جن کے پیچھے سیکورٹی گارڈز ہوئرز بجاتے دوڑتے ہیں۔ وہ اس قدر بوکھلائے ہوئے ہیں کہ گاڑی کے شیشے سے ہاتھ باہر نکال کر حقیر گاڑیوں میں ست روی سے چلنے والے سفید پوشوں اور آہستہ قدم دھرتے رزق کی دھن میں مگن پیدل چلنے والوں کو حقارت سے سڑک سے ایک طرف ہوجانے کے اشارے کرتے ہیں۔
 ”پیرے پیرے۔۔۔ وقت نہیں ہے ہمارے پاس، نیچے آکر کھلے جاؤ گے کیڑے مکوڑے، ہم تو تمہارا بھرتا ہوا گزر جائیں گے، خواہ مخواہ تم کھڑی گاڑیاں جلاتے پھوگے، عمارتوں کے شیشے توڑو گے لیکن پرے، ہٹو ہم جلدی میں ہیں۔“

وہ کسی ٹیکسی کے انتظار میں تھا یا کوئی جیب جو سامنے پارکنگ میں آکر رکے گی۔ لیکن گاڑیوں کا ازدحام تیز رفتاری سے گول گھومتا مرکز کی طرف رواں دواں تھا۔ جہاں تقریباً ”سب ہی چین فوڈ سینٹرز تھے، دوکانوں پر رکتی گاڑیاں، بچوں اور نوجوانوں کے گروہ، دروازوں اور شیشوں کے پیچھے غائب ہو جاتے تنگیاؤں، ہاتھ پھیلائے نیچے ان کے پیچھے پند قدم بھاگتے پھر کسی اگلی رکنے والی گاڑی کی طرف لپک کر آجاتے۔ دنیا کس قدر جلدی میں ہے۔“
 ”وقت شیں ہے جلدی جلدی۔۔۔“ نذرل کے وقت میں بھی وقت اس قدر کم یا ب تھا؟
 اس نے یاب کی محبت میں رنگالی سیکنے کی کوشش کی لیکن وہ نا اہل شاگرد ثابت ہوا۔ بابا کے سارے حوالے پٹ سن، پانی موسیٰ، جھینے، ملاح اور نذرل تھے۔ وہ کانٹوں والی پھلی اس مہارت سے کھاتے تھے کہ ان کے حلق میں آج تک کوئی کاٹنا نہیں اٹکا۔ ابھی وہ قتلے ٹٹل کر ان کا بھر کس نکال رہا ہوتا یا کسی دے ہوئے خفیہ کاٹنے کی تلاش میں ٹانگ ٹوٹاں مار تاکہ بابا دوسرا قتلہ اٹھا چکے ہوتے تھے۔
 رنگال نے ان کو عاق کر دیا تھا، لیکن رنگال خود کو ان کے دل سے نہیں نکال سکا تھا۔ آج بھی جب وہ فاروق سے کہنا چاہتے تھے کہ ”بیٹا ذرا ہاتھ تیز چلاؤ، میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ تو غالب کے کسی مصرعے کی طرح وہ نذرل کو دہراتے۔

اور وقت ہے کہ کس تیزی سے بھر پوری رست کی طرح بند مٹھی میں سے پھسلا جاتا ہے۔ وقت صرف گزرتا ہے یا بدلتا بھی ہے؟ اور بدلتا ہے تو دکھائی کیوں نہیں دیتا۔
 سچ اس کی غیر موجودگی میں ہدایت اللہ آجاتا تھا۔ اس کو پتا تھا صاحب چالی کہاں چھپا کر جاتا ہے، پہلے وہ ادھر ادھر جاسوس نظروں سے کھوتا کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر فٹ میٹ کے نیچے سے چالی نکال کر فلیٹ کا دروازہ کھولا اور فاروق کے واپس آنے سے پہلے وہیں چھپا کر واپس چلا جاتا۔ ان ہی چور نظروں سے لوگوں کو شوقیہ شک میں مبتلا کرتے۔ اور نہیں جانتا تھا کہ سارے نیچلے اپنی چالی ایسے ہی کسی فٹ میٹ کے نیچے یا کسی اوندھے پرے گمے کے پیچھے چھپا کر جاتے ہیں۔ اور چور بھی یہ راز خوب جانتے ہیں۔
 جب سے وہ مٹھی چھوڑ کر فلیٹ میں شفٹ ہوا تھا۔ ہدایت اللہ ساتھ ہی نکھی ہو گیا تھا۔ وہ ذہن، دیکھنے والا تھا یا اس کی ٹینگ ماہر ہاتھوں سے ہوتی تھی۔ وہ یکوم لگانا، امٹیک کو اودن میں ڈالنا، مگر کو پرہیزنا اور اس کے گھر کے واحد بیڈ روم کو چکا کر اور اجال کر جانا۔ جن کے ریک چمک رہے ہوتے اور برتن قرینے سے شایف میں اسکول کے بچوں کی طرح قطار میں دھرے رہتے۔ فریق میں اشاک لیے شیشے کے برتنوں پر ترتیب وار پیر، منگل، بدھ کی پرچیاں، چھپاں ہوتیں، یہ ماں کا کارنامہ تھا۔ وہ بھی کھار آتیں مگر ان کی آمد کا احساس جنگ گالی ناب سے لے کر دیواروں سے لگے بلب تک جھٹکتا تھا۔ ساتھ ساتھ ہدایت اللہ کی شامت آتی، گونوں میں چھپی مٹی کی تہہ کو اڑوں کے پیچھے قبضوں میں دھنے، نظریہ آنے والے جالے، ہدایت اللہ جھنجھلا جاتا۔
 ”آپ صاحب کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں؟“ وہ ایسے بڑبڑاتا جسے قائم مقام بیوی کا کردار ادا کرتے عاجز آگیا ہو۔

”تم اس کو کہنا! کوئی لڑکی ڈھونڈے۔“

”میرے خیال سے لڑکی تو کوئی انہوں نے ڈھونڈ لی ہے۔“ وہ ایک بیٹری کی موٹر آف کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”کون ہے وہ لڑکی؟ یہاں آئی تھی کیا؟ کیسی ہے؟“

”نہیں خیر! آئی تو نہیں، میں نے دیکھی بھی نہیں لیکن نظر آتا ہے صاحب کچھ بدل گیا ہے۔ اکثر کھڑکی میں کھڑا چاند دکھاتا رہتا ہے۔“

”حد کرتے ہو ہدایت اللہ!“ وہ پھر ناامیدی سے اپنے سونے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ”کیا اس کی چاند سے شادی کروں؟“

”یہ بات نہیں ہے۔“ وہ اڑا رہا۔ ”جب کوئی لڑکی پسند آجائے تو لوگ چاند کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔“
 ”لیکن چاند دیکھ کر کرتا کیا ہے؟ گانا گاتا ہے؟“ انہوں نے ماوے میں آنسو گنگ شوگر گراتے مسجد کی پوچھا۔

”آپ مذاق اڑا رہی ہیں۔ دیکھ لیجئے گا۔ یہ بات سچ ثابت ہوگی۔“

”تمہارے زمانے کی فلموں میں ایسا ہوتا تھا ہدایت اللہ! اب محبت ایسے نہیں ہوتی۔“ انہوں نے سفید برف کی چوٹیوں جیسا سونے فریزر میں رکھتے کہا۔

”اب شادی بھی ایسے نہیں ہوتی۔ آدھے گھنٹے بعد نکال لینا اور شایف سے یہ چھنٹے صاف کر دینا۔“

”اب ازراہ کرم میرے ملازم کو گانا گانے کی کوشش مت کیجئے۔“ وہ تھکی سے بڑبڑاتا کہیں سے نمودار ہوا۔
 ”تمہیں تو بگاڑ نہیں سکی، اتنی اجازت تو دو کہ تمہارے ملازم کو ہی بگاڑوں۔ بڑی حسرت ہے۔ ویسے وہ چاند

والے ادا کیے کی گالی کیا ہے؟ چاند ہی دیکھتے ہو یا سامنے والی کھڑکی میں کوئی کھڑا رہتا ہے؟“
 وہ اہالی میں تو یہی ہے بے آباد سا گھر جگمگا اٹھتا تھا۔ دو کرسیوں والی ڈانگنگ ٹیبل پر بیٹھے وہ ان کو یہاں سے وہاں منظر دیکھا رہتا۔ فٹل خانوں میں اس کی دیواروں کی ٹائلز کی سفید سفوف سے چمکتے وہ بڑے سانسنی سے گلے جاری رکھتیں۔

”تمہاری چیزیں تمہاری تھالی داخل ہو گئی ہے۔ مجھے تم سے ڈر لگتا ہے فاروق! اپنے باپ کی طرح اپنی ذات کے عشق میں زندگی نہ گزار دیتا۔“

”لڑا چاند کا نہ بھی ہو تو مجھے قبول ہے۔ انسان کا بچہ ہو۔“ وہ یکے ہوئے کھانوں پر کلنگ ریپ چمکتے باورچی خانے کے کونے سے آواز لگاتیں۔

”ذہنی ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔ عشق کرنے کے بجائے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ سمجھ رہے ہونا!“

”جی سمجھ رہا ہوں۔“ وہ بے دھیانی سے کہتا۔

”جی جی! ایک بات تو بتاؤ۔“ وہ چھوٹے تو لیے سے ہاتھ خشک کرتی اس کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھتیں، ٹھوڑی کے پیچھا تھ نکائے اسکول گزرنے کے بھول پڑنے سے وہ اس سے پوچھتیں۔

”یہ عشق کیا ہوتا ہے؟ کیا جانا ہے باقاعدہ منصوبہ بنا کر یا بس ہو جاتا ہے؟“

”بھی کیا تو ضرور بتاؤں گا۔“

”ابھی کیا نہیں تو وہ چاند والا قصہ کیا ہے؟“

”آپ سنجیدہ ہو گئیں، چاند جیسے بے ہودہ واقعہ پر ہدایت اللہ کے بیان سے۔“ اس نے مصنوعی حیرت طاری کرتے بھٹوس اچکا گئیں۔

”چاند والے واقعہ پر تو نہیں۔ لیکن ہدایت اللہ والے بیان پر ہاں!“

وہ چمکتی میز کی ملائم سطح پر کہ جس پر گرد کا شائبہ بھی نہ تھا، ناخوش سی لکیریں کھینچتی ایک دم جیسے بہت سنجیدہ نظر آئیں۔

”اب ایک بات میں بھی بتاؤں اگر ایسا کوئی واقعہ ہوا تو میں جانتی ہوں، تم مجھے نہیں اپنے باپ کو بتاؤ گے۔“

”یہ اچانک فاصلوں پر کیوں چلی جاتی ہیں آپ؟“

”اس لیے کہ فاصلے تو بہر کیف ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ پیدا بھی ہم نے خود ہی کیے ہیں۔ دیکھو فاروق! شادی بہ حال اپنی خوشی کے لیے کرتی ہے۔ اگر اپنے ماں اور باپ دونوں کو خوشیاں دینے کی کوشش کرو گے تو یہ بھی نہ بھولنا کہ ہم میں کچھ بھی کامن نہیں۔ ہماری خوشیاں ایک دوسرے سے مختلف ہمارے غم جدا ہماری دلچسپیاں ساؤتھ نار تھ بولز، ہم نے زندگی میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں بولا جس کے بعد دوسرے نے کیا مطلب؟ نہ کہا ہو۔ یاد رکھو، تم دو بالکل مختلف ہستیوں کو بیک وقت خوش نہیں کر سکتے۔“

وہ برق رفتاری سے اٹھیں جیسے کوئی ادھور اکام اچانک یاد آیا ہو۔ اس کے بستر سے سلوٹیں دور کرتے، اس کی طرف پشت کیے انہوں نے جیسے سے کہا۔

”ہم دونوں تمہارے مجرم ہیں۔ اپنے حصے کی معافی میں تم سے مانگتی ہوں اور اس کا اعتراف تو کبری چکی ہوں کہ اس نے تمہیں بہت شان دار انسان بنایا ہے۔“

”پھر وہ اسی تیزی سے پلٹ آئیں۔ ان کی پلکیں ہلکی سی نم تھیں۔“
 ”کیا نام ہے اس کا؟“

”کس کا؟“ فاروق نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
 ”اسی چاند کے ٹکڑے کا جو سامنے والی کھڑکی میں رہتا ہے۔“
 ”لاحول ولا قوۃ میں سمجھا، بابا کا نام پوچھ رہی ہیں۔“



”کہاں سے آرہے ہو؟“ انہوں نے ایک نظر اس کی دھج کی طرف دیکھا ”یا کہیں جا رہے ہو؟“
 انہوں نے کانڈوں کے ڈھیر سے لمحے بھر کے لیے ہی سر اٹھایا تھا۔
 ”مجھے یقین تھا آپ یہیں ملیں گے۔ اب تک دفتر میں بیٹھنے کی وجہ؟“
 فاروق نے کرسی گھسیٹ کر سامنے بیٹھنے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ مسلسل کام نے ان کے چہرے کی شادابی نوج
 والی تھی۔ اسے رنج سا ہوا لگتا یا را آوی ہنس پڑی سے خود کو بریاد کیے دے رہا ہے۔
 انہوں نے ہلکا سا تھک کیا۔ ”پہلے میرے سوال کا جواب دو۔“
 ”مجھے کہاں جانا تھا، میننگ تھی۔ اٹھا تو سیدھا اس طرف آگیا اور اب آپ یہ ریز گاری گننا بند کریں۔ اس نے
 آپ کو بہت تھکا ڈالا ہے۔ میرے پاس آکر رہیں۔ کچھ دن آرام کر لیں۔“
 انہوں نے چین کا ڈھکا بند کر کے جیسے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے، وہ کچھ
 دیر اپنے آپ میں مسکراتے رہے۔
 ”اول تو تھکے بغیر آرام کرنے کا تصور میری ڈکٹری میں نہیں ہے۔ نمبر دو تمہارے گھر آکر میں کیا کروں گا۔
 تمہارا ملازم مجھے ہر وقت روکتا تو کتنا رہتا ہے۔ میں اپنی پلیٹ بھی دھونے کھڑا ہو جاؤں تو ایسے تربانہ تھا ہے جسے
 میں اس کی ملازمت پر ڈاکا ڈالنے آگیا ہوں۔ نمبر تین مجھے اسلام آباد کا مزاج ہی پسند نہیں۔ عجیب شہر ہے۔ لگتا
 ہے غلطی سے میانیاں صاحب آٹکلا ہوں۔“
 انہوں نے سر کاٹی ہوئی فائلیں واپس گھسیٹیں۔ ٹینک دو بارہ ناک پر رکھی۔ ان عقاب کی کوند والی آنکھوں سے ایک
 نظر اس کی طرف دیکھا۔
 ”نلو میرے سر سے۔ میں تمہاری طرح سرکاری ملازم نہیں ہوں کہ عیش کرنے کی تنخواہ لوں۔“
 ”آج بروز ہفتہ جب آپ کا سارا عملہ عیش کرنے کی تنخواہ لے رہا ہے تو آپ اکیلے ہی غیر سرکاری کیوں؟“
 ”یہ میرے اعم نیکس ریٹرن ہیں اور GST میں کچھ گڑبڑ لگتی ہے، لہذا آپ تشریف لے جائیے۔ رات کے
 کھانے پر آپ سے ملاقات ہوتی ہے۔“
 انہوں نے جو کہنا تھا کہہ دیا پھر اس کے وجود سے بے خبر ہو چکے تھے۔



”کہاں جاتے ہیں عموماً؟“ یہ راستے؟“ اس نے چوک پر کھڑے ہو کر ہر طرف مجھے راستوں اور زمین میں اترتی
 سرنگوں جیسی سرنگوں کی طرف دیکھتے تشویش سے سوچا۔ راستوں کا انتخاب بھی کیا تکلیف دہ مرحلہ ہے۔
 ”ایسا الناس۔“ اس نے ادھور اسرافظ دہرایا وہ چچا عبدالعزیز کے ساتھ اندر داخل ہوا تو اس کی توقع کے عین
 مطابق بلیک سیڑھیوں پر میلہ لگائے بیٹھی تھی۔ جہاں برآمدے میں جلنے والی روشنی کی راؤ جس پر ہنگوں پتنگوں کا
 ازدحام بھی منڈلا رہا تھا، ان تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ عبید اپنی دوست کے ساتھ کسی لایعنی تقریر میں الجھی تھی۔
 رضائے شاید اس کے آنے کا اعلان نہیں کیا تھا کیونکہ ان سب کے چروں پر اس کو اچانک دیکھ لینے کی حیرت بھری
 خوشی المی تھی۔

”یہ کتنے بھلے لوگ ہیں۔“ اس نے ایک مرتبہ ان سب کے بارے میں نہایت فرصت سے سوچا تھا۔ ”چشم ماروشن دل ماشاؤ۔“ قسم کے قسم کے ہر ایک کو سمیٹ لینے والے۔ جسے چھت پر سونے والے دونوں میں بابا اس کو پودے کی لمبائی سناتے تھے۔ ”گھس گھس! میرے کان کی کوکرو میں گھس۔“ ہاتھی شیر چیونٹی دریا ایک ننھے سے پودے کے کان میں کیا کیا کائنات سالی تھی۔

اس نے دوائے درد دل پہنچنے والے کے گرم جوشی سے بڑھے ہاتھ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور اسی کان کی کوکرو میں ایک کوئے میں اپنا ردال بچھا کر بیٹھ رہا۔

البتہ بیٹھے سے پہلے وہ جوئے بھر کو ایک سایہ ڈاکٹر صاحب کے چہرے سے گزرا، وہ لمحہ جیسے غلطی سے اس کی گرفت میں آ گیا تھا۔ ایک لمحہ ہی ہوتا ہے اگر اتفاق سے وہ کسی اور طرف دیکھ رہا ہوتا یا کسی اور حسن اتفاق سے اسی وقت اس کی بلیکس جھپک گئی ہوتیں یا کاش اس دن وہ وہاں آیا ہی نہ ہوتا، تاریخ کے اس حصے سے بے خبری، ایک نعمت رہتی۔

”آپ بھی اپنے خواب بیان کیجئے۔“ ڈاکٹر نے اصرار کیا تھا۔

”اچھی بات ہے ڈاکٹر صاحب! اس نے سوچا، کاش مجھ میں بھی ایسی اعلا طربی ہوتی۔“ وہ مسکرایا ایک طویل معنی خیز مسکراہٹ۔

”ان میں سے بچپنا ابھی شتم نہیں ہوا۔ یہ ابھی تک ان سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنے اپنے حصے کا تھپڑ ہراتے رہتے ہیں۔ اللہ ان سب کی مصدیت برقرار رکھے۔“

وہ خلوص نیت سے دھا کرتا، اس بحث کا حصہ بن گیا جو ٹاک شوز دیکھ دیکھ کر ان سب کی رگوں میں سرایت کر چکی تھی۔



”تم اس طرف گئے نہیں؟“

”کس طرف؟“ اس نے بے دھیانی سے اوہرا دھریکھتے ہوئے کہا۔

”اسی طرف جس کے خیال سے تمہارے چہرے پر اسٹرابری آکس کریم والا فلیور دکھائی دے رہا ہے اور تم ضرورت سے زیادہ بے توجہی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔“

”میں نے آپ کو پہلے بھی مشورہ دیا تھا، اپنے آفس کے باہر ایک کھوپڑی اور دو ہڈیوں والا بورڈ لگالیں۔ آدھے بنگالی بابا تو آپ کو دیکھتے ہی ہنس پڑتے ہیں۔“

”عباس س لے تھے؟ کیا ہے وہ؟“

”نہیں مل سکا۔ وہ سب لوگ باہر سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ میں باہر سے ہی واپس آ گیا۔“

”اندر جانے پر پابندی لگا دی ان لوگوں نے؟“

”جی ہاں! وہاں بورڈ پر بڑا بڑا لکھا تھا۔ ”یہ شارع عام نہیں ہے، خلاف ورزی کرنے والا حوالہ پولیس کیا جائے گا۔“

”تم عام تو نہیں ہو یا حوالہ ہونے سے ڈرتے ہو؟“ وہ سوپ کا چمچ منہ میں لے جاتے رک گیا۔

”بابا! آپ تو خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ خود کیوں نہیں گئے ابھی تک وہاں؟ آپ بھی تو عام نہیں ہیں؟“

”ضرور چلتا۔ تم نے اب تک مجھ سے کہا ہی نہیں تھا۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے فیکٹری اور پلیٹ رکھتے پر جوش لہجے میں کہا۔

”چلیں گے آپ؟“

”تم کو گے تو ضرور۔ ویسے تو یہ کام تمہاری ماں کا ہے۔“

”میں سنجیدہ ہوں۔“

”مجھے یقین ہے، میرا بیٹا منحرف ہو ہی نہیں سکتا۔“

فاروق کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا، جیسے اس ساری بے سرو پا بحث سے باہر نکلتا جا رہا ہو۔

”آپ مل کیوں نہیں لیتے سرے؟“

”سوچا تھا، ملوں گا۔“ وہ قطعی سنجیدہ ہو گئے۔

”جب پاکستان اپنے مسائل سے نمٹ کر ترقی کر رہا ہو گا اور ہم اپنی اپنی الجھنوں سے آزاد ہو چکے ہوں گے۔ لوگ فخر سے سراٹھا کر اپنے وطن کی طرف دیکھیں گے۔ یہاں خوشحالی ہوگی۔ امن و امان ہو گا۔ ہم ایسے ہی بچکانہ خواب دیکھنے والے لوگ ہیں۔ اب اس سے کیا ملوں۔ کس طرح اس کا سامنا کروں، جب اور پیچھے اور پیچھے ہٹتے دیوار سے جا لگے ہیں۔ جس طرف سرگھماؤ سازی ہے ایمان لوگ جو غلوں کی طرح چنے خون چوتے مگدھوں کی طرح لاشوں پر منڈلاتے اتنے گدھ کہ آسمان سے حتم ہو گئے ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے کا سامنا کر ہی نہیں سکتے۔“

”کیا اس میں آپ دونوں کا قصور ہے؟“

”شاید ہے۔ ظلم صرف یہ نہیں ہے کہ ظلم کیا جائے۔ روایت سے کہ ظلم سنا بھی ظلم ہے۔“

”ہم تو نسلوں کے ظالم ہوئے پھر۔“ فاروق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کبھی کبھی مجھے یہ سوچنا بڑا عجیب لگتا ہے کہ ہم بار بار یہاں بیٹھ کر یہ کہانی دہراتے ہیں اور وہ مجھے بچانے بھی نہیں۔“

”اس غلط فہمی میں مت مارے جانا۔ وہ تمہیں نہ پہچانتا تو تمہیں اتنی جرات نہ دیتا کہ تم آؤ اور اس کی سیڑھیوں پر پاؤں پیا کر بیٹھ جاؤ۔ قدیم زمانے کی بات ہے۔“

وہ دھیمے لہجے میں بولے۔

”اب تو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ قبل مسیح کی ہے یا فرعون کے زمانے کی یا تب کی جب نوح اپنا سفینہ تیار کر رہے تھے۔ ہم آدھی کامیابی حاصل کرنے والے لوگ کسی کو راہ سے ہٹا تو دیتے ہیں مگر اس سے بدتر کو کاندھوں پر اٹھائے لہرے لگاتے فجوم میں شامل ہو جاتے ہیں جیسے ایک پرستہ چل رہا ہو یا جیسے کسی میکینیکل خرابی سے ایک سی منظر ساکت ہو گیا ہو۔ اب اسی منظر میں اسی کھوتے پیچھے کے گرد میں اس سے کیا ملوں؟“

”پتا نہیں، ہم نے کب سے تاریخ کو فریزر میں جماد رکھا ہوا ہے۔ آپ کے زمانے سے میرے زمانے تک تاریخ جیسے ٹھنڈی ہوئی ساکت رہی ہے۔ میں جمال کیس میں اس کی فائل دیکھ رہا تھا۔ اس کے فرد جرم پر جو تاریخ درج ہے وہ 2011ء ہے لیکن لگتا تھا یہ واقعہ 1970ء کا ہے یا حد سے حد 1980ء کا۔ میرے خیال میں واقعات وہی رہتے ہیں۔ بس ریفرنس نمبر بدل جاتے ہیں۔ آج بھی ایک محب وطن پاکستانی ہمیں نہیں چاہے۔“

کیونکہ وہ شور مچاتے ہیں، ڈاؤنلا کرتے ہیں ہاں اگر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ وہ چپ بیٹھا اپنے اندر کڑھتا رہے گا تو ہمیں زیادہ شکایت نہیں ہوگی کیونکہ اپنے دل کے جلانے پر ہمیں اپنا پورا حق اور اختیار حاصل ہے۔ جمال ایک گناہ

کھائے ہے لیکن اپنے وقت کا استعارہ ہے۔“

”وہ کورٹ کیوں نہیں جاتا؟“

”شاید اس لیے کہ کورٹ اٹھارہ کروڑ مقدسے ہر روز نہیں نمٹا سکتی۔ یہاں کون دکھی نہیں؟ آپ دیکھیے! وہ

اپنے حقیر سے حقیر ایجنٹ کی بھی حفاظت کرتے ہیں اور ہم نے اپنے لوگوں سے بھی ہاتھ اٹھالیا ہے۔ عجیب بات ہے وہ جتنے مالک کے وفادار ہیں اس شدت سے ملک کے وفادار نہیں۔ کیا ہر آدمی کی کوئی قیمت ہوتی ہے یا ہر آدمی بکاؤ ہے؟ ہر خواہش، ہر خواب سیل پر لگا ہوا ہے۔ کٹ تھروٹ سیل، کھڑکی توڑ ہفتہ، ایک خریدیں ایک مفت حاصل کریں۔ کتنے بے قیمت ہو گئے ہیں ہمارے خواب۔“



”یہ سیدھی چوڑی شاہراہ ایک اہم موڑ پر بند ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے راستے کہیں نہیں جاتے۔ غور کرو شہر مار اور میری آنکھ سے اسلام آباد کو دیکھو۔“

یہ پارلیمنٹ ہے، آپ اس سے بچ بچا کروائیں یا نہیں نکل سکتے ہیں لیکن پھر آگے راستے بند ہیں۔ لوگ اس کو بحال کرنے کے لیے سالوں جدوجہد کرتے ہیں، جانوں سے پھیلے ہیں قید ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ گولیاں کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے، لیکن جب ان لوگوں کو آپ باہر سے اندر لے کر آتے ہیں تو سب سے پہلے وہ آپ کو قید کرتے ہیں، آپ پر گولیاں چلائے ہیں اور ان کے سامنے بھی بنے ہیں جن کے خلاف آپ اب تک جدوجہد کرتے آ رہے تھے۔ قزاقیوں سے ان کو دلچسپی نہیں کیونکہ یہ ان کو نوازتے ہیں جہاں سے تیر آ رہے تھے۔

ایک کہانی کی روایت ہے کسی بادشاہ کا فقیر بیروں آ گیا۔ تم جانتے ہو بادشاہ دل پھیل کر لیے پھرتے تھے وہ اس کو بیاہ کر گھر لے آیا۔ بیاہ کا لفظ میں نے رفع شر کے لیے استعمال کیا ہے۔ پتا نہیں بیاہ کر لایا یا بس لے آیا۔ اس کو منہلا دھلا کر خلعت فاخرہ پہنا دی گئی۔ یار شہر مار! خلعت فاخرہ صرف مردوں کا لباس ہے یا عورتیں بھی پہن سکتی ہیں؟ خیر! خوب صورت تو بھی ہی رنج سنور کر بالکل ملکہ لگنے لگی۔ میرا یہ مسئلہ بھی حل کرنا سب ملازمین چندے آفتاب چندے ماہتاب کیوں ہوتی ہیں؟ کوئی معمولی شکل و صورت کی گھنگنی، مولیٰ بادشاہوں کے گھریلوں پیدا نہیں ہو سکتی؟ تو راوی بیان کرتے ہیں رات ہوتی اور سارا محل سو جاتا تو وہ طاقتوروں پر سکے رکھ دیتی اپنا بھکارن کا لباس پہن کر کشکول اٹھائے، ہر طاقتور سے سکے مانگتی تھی۔ کسی کسی طاقتور پر وہ سکے رکھتی بھی نہیں ہوگی کہ دھتکارے جانے کی حسرت بھی پوری ہوتی رہے۔

تو اس کہانی سے یہ سبق ملا انسان اپنے اصل کی طرف دیوانہ وار پلٹتا ہے۔ سو یہ سڑک جس عمارت پر ختم ہوتی ہے وہاں کوئی نہ کوئی بھکارن کا لباس پہنے کشکول ہاتھ میں اٹھائے آگے تم خود سمجھ دار ہو کیونکہ یہ ریڈ زون ہے۔“



”چین نے جب کلوزڈروپالیسی اپنائی تو اسے دروازے بند کر لیے تھے اور جب ایک ”کھل جاسم سم“ کے طلسم نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ دس ماہ میں دس عظیم الشان عمارتیں کھڑی تھیں جن کی تعمیر دس سال میں بھی ممکن نہیں تھی یہ ہمارا Tenamen square ہے۔ اس شاہراہ پر ہماری بھی دس عظیم الشان عمارتیں ہیں۔ میں نہیں جانتا، ان میں بسنے والے لوگ بھی عظیم الشان ہیں کہ نہیں۔ کیونکہ یہاں کے باسی ان محلوں میں رہتے ہی نہیں انہوں نے محلوں کے اندر بڑے بڑے بلکڑ تیار کر رکھے ہیں۔ دولت آپ کی قسمت کی لکیر میں ہے، بلکڑ نصیب میں نہیں۔“

جن تمام عمارتوں کی سامنے والی سڑکیں مہم سرب اور سیمنٹ کی مضبوط دیواروں میں بند دیکھ رہے ہو یہ سب وہ لوگ ہیں جو حکومت پاکستان سے ہماری حفاظت کی بھاری تنخواہ لیتے ہیں اور ہمارے خوف سے اپنی تحفظ پناہ گاہوں سے باہر نہیں آتے اور ہماری تنخواہ سے اگر تمہیں غلط فہمی ہو، میری یا تمہاری تنخواہ یا ہم دونوں کی مجموعی

تختوا تو ایسا نہیں ہے تاہم وہ دونوں کی تختوا کو آپس میں ضرب دے دیا جائے تو حاصل ضرب آس پاس ہوتا ہے۔

راولپنڈی میں اس سے بھی زیادہ احتیاطیں ہیں۔ دیواروں سے باہر مزید دیواریں ہیں۔ ان سے باہر لوہے کے خاردار کھچے ہیں اور ان کھچوں سے بھی آگے سڑک بند کرنے کے لیے ہلاک گھرے ہیں۔ ان حفاظتوں کے باوجود آپ اس سڑک کے برابر سے گزر نہیں سکتے

کیونکہ آپ Who the hell bloody people ہیں۔ یہاں جگہ جگہ آپ کو ایسے گھر ملیں گے جن کو چاروں طرف سے لوہے کی مضبوط گرل نے جکڑ رکھا ہے۔ اس گھر کے سامنے والی معمول کی سڑک بھی ٹریفک کے لیے بند کر دی جاتی ہے اگر اتفاق سے آپ کا گھر اسی گلی میں ہے تو آپ کہیں دور دراز کا راستہ تلاش کرتے براہ راست اپنے گھر کی پچھت پر اتریں کیونکہ مملکت خدا واد پاکستان کی سرزمین پر سی ڈی اے کی بنائی ہوئی سڑک پاکستانیوں پر بند ہے۔

یہ کون لوگ ہیں۔ شہروں کے درمیان شہروں کو تنگ کرنے کے لیے کیوں آباد ہو گئے ہیں۔ کیا کام کرتے ہیں۔ کہاں جاتے ہیں، کہاں سے آتے ہیں کوئی نہیں جانتا۔ یہ سب کے سب سفید فام ہوتے ہیں، کسی سے بات کرنا تو درکنار بات کا جواب بھی نہیں دیتے۔ کیونکہ انہوں نے دیواریں اور گیٹ بھی بند کر لیے ہوتے ہیں لہذا آپ ان کے گھروں میں جھانکنے کی بد گیزری بھی نہیں کر سکتے۔

ایک مرتبہ بڑے بڑے افلاطون شہروں کو ایک چھوٹے سے بچے نے مات دے دی۔ اس نے سائیکل چلا تے اور چوگر چباتے ایک عمارت کی طرف دیکھا جو سروں اور سینٹ کے ٹکڑوں سے ڈھانی جا رہی تھی بچے نے بھائی سائیکل کو بریک لگائی کام کرنے والے مزدوروں کے پاس لمبے بھر کو اور تشویش سے بولا۔

”اوہ! ہماری اسٹریٹ میں بھی بلیک وائڈ لے آگئے۔“

تب میں نے جانا یہ محاورہ نہیں ہے۔ سچ بچہ جانتا ہے۔ پہلے لوگ شرمندہ ہوئے تھے اور خفیہ رکھتے تھے کہ ان کے امریکہ اور روس میں رابطے ہیں۔ اب ڈھٹائی آگئی ہے۔ ہر شخص یہ ثابت کرنے پر تلا ہے کہ وہ امریکہ سے بہت قریب ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو گول مول کر کے یہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ امریکہ میں ہائی کمان ہر بات انہیں خود بتاتی ہے اور وہ لوگوں سے آکر پوچھتا ہے ”یار حقیقت ایسا کیا کروں؟“

”معاف کرنا! یہ اس طرف وہ سڑک ہے جس پر میں تم کو نہیں لے جاسکتا۔ کیونکہ یہاں سفید فام باشندوں کی بستیاں ہیں جس کو مندرجہ زبان میں Diplomatic enclave کہتے ہیں۔ وہ شہر کے اس حصے کے حکمران ہیں، آپ غلام باشندے، حقیر پاکستانی، سفید قوم کی مرغوبیت میں مبتلا اور پرستہ دہشت گرد۔ اس لیے امن پسند رہیں جو گورے آپ کو یہاں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے اس لیے آپ اس علاقے کو یہیں سے دیکھیں گے۔“

میں کمزور عقیدہ آدمی نہیں ہوں، لیکن جب میں اس طول القامت مارگلہ ٹاورز کے نیچے کھڑا ہوتا ہوں تو مجھے لگتا ہے وقت ریورائنڈ ہو گیا ہے۔ بلڈنگ میں روشنیاں جل جاتی ہیں جو قیمتی پردوں سے چھن چھن کر باہر آتی ہیں، کسی کمرے میں ایک چھوٹی سی بجلی نظر آتی ہے جس کی مائے ابھی پر دے نہیں گرائے۔

میں دیکھتا ہوں وہ کمپیوٹر پر بیٹھی کوئی گیم کھیل رہی ہے۔ کسی دوسرے فلیٹ کی کھڑکی سے ایک آباد ڈاننگ روم نظر آتا ہے۔ خاتون خانہ بڑی تیزی سے کمرے اور باورچی خانے کے درمیان آتی جالی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک ٹھنڈا نرسکون ماحول، آرام دہ خوش باش گھر یہ اس بلڈنگ پر آخری رات ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں اور جانتا ہوں لیکن مقیم نہیں جانتے۔ میں یہاں ٹھہرا نہیں چاہتا، لیکن ہمیشہ رک جاتا ہوں۔ میں Saddist نہیں لیکن خود کو

اس اقدت سے بار بار گزارتا ہوں۔ جب میرے سامنے یہ عظیم الشان عمارت زمین بوس ہوتی ہے تو میں ان تمام زندہ توانا لوگوں کو اسے سامنے ہوا میں اڑتا اور لمبے میں دھنستا دیکھتا ہوں۔ دھول بیٹھتی ہے تو یہ بلند بالا جاوہ جلال والی عمارت ایک نوحہ نظر آتی ہے۔

اب تم جو سینٹ کے غلوے اور لوہے کے مڑے تڑے ڈھانچے اس گراؤنڈ پر بکھرے دیکھ رہے ہو۔ یہاں ایک سرسبز میدان تھا، رنگ برنگ پھولوں سے سجا، کسی کے ڈانگ روم نے، کسی کے کمپیوٹر کے لمبے نے ان رنگوں اور خوشبوؤں کو ڈھانپ لیا ہے۔ ابھی تک مجھے سینٹ کے اس غلوے سے اس کھٹی بجلی کے خون کی خوشبو آتی ہے جو رات گئے وہ ڈیوٹیم کھیتی رہی اور صبح تک سوئی تھی کہ ایک دھماکا اس کو نیند میں نکل گیا۔

یہ اسلام آباد کا قبرستان ہے۔ اس دیرانے میں سے دوسریں نکلتی ہیں۔ ان میں سے ایک پطرس بخاری روڈ دوسری فیض احمد فیض روڈ ہے۔ گو اس قبرستان میں نہ فیض ہیں نہ پطرس، لیکن وہ دونوں قبرستان کو گھیرے دیرانے میں چپ چاپ رہے ہیں۔ ان کے حصے میں یہی دوسریں آتی ہیں کیونکہ بڑی والی آباد شاہراہ آفتاب شاہی کو مل گئی تھی۔ اسلام آباد کی طرح اس قبرستان کے بھی کئی سیکڑ ہیں۔ یہ وہ سیکڑ ہے جس میں گریڈیٹ سے اوپر کے افسران دفن ہیں۔ سرکاری ملازمین سے کم تر درجے کا لفظ لگتا ہے، علفان افسروں کو ہم سرکاری افسر کہتے ہیں۔ ان کے اکثر تکیوں پر ان کے عہدے درج ہیں۔ پرنسپل سیکرٹری، جوائنٹ سیکرٹری، چیئر مین، ٹائل فلاں۔

یہاں اٹھارہ ایس گریڈ کے مردے دفن نہیں ہو سکتے ان کے لیے شاگرد پیشہ اسی عمارت میں افسروں سے ذرا فاصلے پر تعمیر ہے۔ ازراہ احتیاط تاکہ فرشتوں کو پرو تو گول کا دھیان رکھنے میں آسانی رہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں یہ افسران آپس میں کیا باتیں کرتے ہوں گے، کبے ایک دوسرے کو اپنے قصے سناتے ہوں گے، تمہارا کبھی ان سے بالا رہا ہے۔ میرا مطلب ہے جب یہ زندہ تھے، مگر پٹاڑ ہو کر ان میں کسی ڈال کر بیٹھے کسی غیر اہم بڑے کی طرح انتظار کرتے کہ کب کوئی ملاقاتی آتا ہے۔ کیونکہ ان کا ماضی داستانوں سے زرخیز ہوتا ہے۔ یہ یہ لوگ بہت اچھے قصہ گو بھی ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ کوئی بات کرتے ہیں تو ان کے جملے کی ساخت ایک مخصوص لفظ سے سجائی جاتی ہے ”اس نے مجھ سے کہا۔“ سر، سر کا لفظ ادا کرتے ان کا منہ لذت بھرے ذائقے سے لبریز ہوتا ہے۔ بس بھرا ”سر“ فٹے میں سرشار ”سر“ سامنے کھڑا مودب، محکوم، آپ کو افسری کے شمار میں ات پت کرنا۔ میں یہاں کھڑا ہوتا ہوں تو مجھے لگتا ہے ”یہ قبر اس قبرستان میں ہے۔“ کل آیا تھا ایک فرشتہ مجھ سے کہنے لگا۔ ”سر! اگر آپ کی اجازت ہو۔“

عموماً ”لوگ“ گھر کرتے ہیں، مشرف نے اپنے نو سالہ عہد حکومت میں کچھ بھی نہیں بنایا، لوگوں کو بھی گلہ کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ نیشنل مونیٹ اس کی بنائی ہوئی ہے۔ ہر روز چیکس سے تیس لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ اوپر پیر سو باوہ ہے جہاں لوگ ”منال“ کی ریلنگ سے نیچے اسلام آباد کے گھروں کو باری باری روشن ہوتے دیکھتے ہیں۔ سبز پٹاڑ آہستہ آہستہ کاہی رنگ کے پھریا پڑ جاتے ہیں۔ یہ تفرق گاہ بھی مشرف کی ایجاد ہے یا دریافت ہے، جو لفظ نہیں مناسب لگے وہ اس میں ڈال لو۔

یہ جو پہلے رنگ کی ہے یہ لال مسجد ہے۔ ایک دفعہ بے قابو ہجوم نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ایک شخص کہیں سے بیڑی لے آیا وہ سرا کوچی اور سرخ نیٹ اور وہ اس پہلی عمارت کو تن دی سے لال کرنے میں مل گیا۔ اس دوران ہم دھماکہ ہوا۔ لوگ جایش بچا کر بھاگنے لگے لیکن وہ لاپرواہ اپنی پشت پر ہونے والے واقعے سے بے نیاز اسی تن دی سے کوچی پھرتا رہا۔ افسوس حکمرانوں نے اس کو مزدوری دینے بغیر نیٹ خشک ہونے کا انتظار کیے، ہٹا مسجد کو پھر سے بنایا کر دیا۔ یہ رنگ اس مسجد کی یادیں تھا جس کو آزادی سے قبل مسلمانوں نے ایک شب میں تعمیر کیا تھا۔ یہ چک خزاوہ ہے۔ اس کا پہلا گھر ہی عبرت کا نشان ہے۔ درختوں سے الٹی لگی چمگاڑیں اور چھوڑ کر بھاگ

جانے والوں کا غم منافی تبتائی۔ اس کے گیٹ پر ایک کتبہ لگا ہے۔ سوری اچھے معلوم ہے کتبہ گھروں پر نہیں لگتا اور لکھا تو کچھ اور ہے کہ آپ اپنی شناخت کرائے بغیر اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتے لیکن میرے سامنے سے یہ حرف مٹ جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے یہاں لکھا ہے ”برمزا رہا نے چراغ نے گلے۔“



”او! یہاں بیٹھے ہیں کیونکہ میں نے سنا ہے، تمہیں نہوں سے عشق ہے۔“ وہ جیسے مین اور روز گارڈن کے بچے پانی کی پٹی پر بیٹھے ہوئے بولا ”مہاٹوں کی ندیاں بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔ تم نے غور کیا؟ اب تک جن لوگوں کا تم گلے کرتے آئے ہو۔ ان میں سے ایک طبقے کے نمائندے ”تم“ اور ایک کا ”میں“ ہوں۔ او! ہم یہاں بیٹھ کر اپنا اپنا گریہ کریں۔“

ان دونوں کے درمیان خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ صرف پلی کے نیچے بچے سبزی ماں پانی کی دھیمی آواز سے سربراہٹ سنا کر دے رہی تھی۔

کتی دیر کے سنانے کو پھر شرار نے ہی توڑا تھا۔ ”مجھے اندیشہ تھا شاید تم اچھے شخص نہ ہو مگر یا تم تو یا کمال آدمی نظر۔“

”یسا ہے کیا؟ شاید نہیں۔“ فاروق کاہلی سے پاؤں پیارے بولا تھا۔ ”شاید ہمارے سوچنے کا محور ایک ہے ہم ایک ہی فریڈینسی پر جلتے ہیں۔“

”مجھے اب تسلی ہے تم کسی کا دل نہیں دکھاؤ گے حالانکہ مجھے اندیشہ تھا۔“

”مگر تمہیں تسلی ہے تو مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔ کیا اس ”کسی“ میں تم نے خود کو بھی شامل کر لیا ہے؟

کیا مجھے یقین دلا سکو گے کہ میری وجہ سے تمہارا دل نہیں دکھاؤ گا؟ حالانکہ میں نے اسلام آباد کا کیسا مکروہ نقشہ تمہارے سامنے رکھا۔ آئندہ زندگی میں امید کی طرف دیکھیں گے۔“

”نہیں میرا دل ہرگز نہیں دکھا۔“ شرار نے دھوکے سے کہا۔ ”میں راضی برضارہ کے خوش رہتا ہوں اور اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہو گا وہی جو اس کی چاہت ہے۔“

فاروق کو لگا اس کے پاس لفظ ختم ہو گئے ہیں۔ کتنی دیر وہ اچھے لفظ کی تلاش میں غوطے مارتا ہے۔ بی سے بڑبڑایا۔

”میں نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا تو۔۔۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تم چیزوں کے بارے میں جذباتی ہو۔“

”ہاں ہوں۔“ اس نے ایک لمحے کے لیے شرار کا چہرہ دیکھا۔ ”تم نہیں ہو کیا؟“

”ہاں میں بھی ہوں۔“

وہ دونوں جانتے تھے وہ اس موضوع پر بات نہیں کر رہے جو بظاہر نظر آ رہا تھا۔ کتنی دیر کی خاموشی کے بعد فاروق اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

”تمہیں یہاں سے فوراً اٹھ جانا چاہیے کیونکہ اسلام آباد کے بارے میں میں نے تمہیں آخری بات تو بتائی نہیں جیسے ملی نے شیر سے درخت والی یوٹن چھپالی تھی۔ رات ایک بجے کے بعد اچانک کہیں سے سوروں کے غول نمودار ہو جاتے ہیں اور یہ خاصے جارح ہوتے ہیں گنڈا اس سے قبل کہ سوری گھروں میں ایک بجے ہمیں اپنے ٹھکانوں پر ہونا چاہیے۔“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



نعمت ناز



”یا سہرا! آپ خود دیکھ رہے ہیں سب کچھ اب“

تائیں کہ میں کیا کروں؟“

نرگس بہت جھنجھلائی ہوئی تھی ”ادھر چھوٹے بیٹے

نے آئے اور دست سے بے حال ہو کر اسے حال سے

بے حال کر رکھا تھا، ادھر ساس کی بیماری اور لاچار

نے مزید کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بیٹے کا پھیلا ہوا گند

سہاگت کر اسے دھو کر فارغ ہوئی تو لال کا کمرہ اس کا

بستر تھا۔ ان کو کوئی بھی چیز ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

اسی ٹھوڑی دیر پہلے جو دلہہ کھایا تھا وہ سب نے میں

اٹل کیا۔ بستر کی چادر ان کے کپڑے اور فرش دیکھ کر

نرگس کو انکلیاں آنے لگیں۔

”یا سہرا! سبھی بہت ہو چکی، آپ ظاہر سے کہیں وہ

بھی کچھ خد میں کر لے سارے ثواب لوٹنے کے لیے

ہم ہی رہ گئے ہیں۔“

کمرے اور ساس کو ان کے حال پر چھوڑ کر اس نے

شوہر کا پیچھا لیا۔

”یار! کسی طرح بندوبست کرلو، ظاہر اور اس کی

بیوی کا جواب تمہیں معلوم ہی ہے چوتھے فلور پر دو

کمروں کا فلیٹ لفٹ نہیں ہے، بیڑھیوں سے آنا جانا

کیسے ہو گا، آئے دن لوڈ شیڈنگ، جس اور گرمی الگ

ایں کا دم گھٹے گا، وغیرہ وغیرہ ان کے پاس برائوں کی کیا کمی ہے؟ یا سر بے بسی سے بولا۔

”کیوں؟ آپ سے کچھ بولا کیوں نہیں جاتا؟ اس کی بھی تو مال ہیں، صرف آپ رہی تو سارے فرائض عائد نہیں ہوتے، لینے کے لیے کھانے کے لیے اپنا حق جتنا خوب آتا ہے خدمت گیری کے لیے ہماری بیماری میں دیکھ بھال کے لیے ہمیں ہی باگل بنایا جاتا ہے ہماری گردن ہی پتلی نظر آتی ہے، او بھئی لو پھندا فٹ کرو۔“

نرس کئی مہینوں سے بھری بیٹی تھی جب سے ساس کی بیماری نے طول پکڑا اور وہ محتاج ہو کر بستر پر پڑی تھیں، نرس ایسی گن چکری کہ اب تو بے زاری کی حد کو پہنچ گئی تھی، حالانکہ گھر کے بھانڈو بوجھا صفائی برتن اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی آتی تھی بلکہ

ساس کے بیشتر کام بھی اسی سے کروائے جاتے تھے۔ ان کا نسلانا دھلانا، ان کے کپڑے وغیرہ دھونا، سب کچھ ماسی ہی کرتی تھی مگر وہ چوپیس گھنٹے کے لیے تو نہیں آتی تھی، وہ ابھی ابھی ایں کو دلیہ کھلا پلا کر، سارے کاموں سے فارغ ہو کر گئی تھی کہ پیچھے سے پھر انہوں نے گند پھیلادیا تھا۔

نرس کو یہ بھی غصہ تھا کہ دیور اور دیورانی تو ہمارے بنا کر انہیں اپنے ساتھ رکھنے سے گریز کرتے تھے بس آتے اور خیر خیریت پوچھ کر ان سے مل ملا کر چلے جاتے اور خدمت گزاری کا سارا بوجھ اس کے ناتواں کندھوں پر آن پڑا تھا۔ یا سر کون سا کچھ کرتے، رقم دے کر اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو جاتے، آگے نرس جانے اور اس کا کام اس کے کاموں میں ساس کی تیار داری کا جو نیا کام شامل ہوا تھا اس نے اسے چکر اکے رکھ دیا۔

”صلیہ کو کسی سے بلالو، وہ صفائی کر دے گی۔“ یا سر نے اس کی مسلسل بیزاریاٹ کے جواب میں کہا۔ ”ہاں تو ظاہر ہے کہ اب اسے ہی بلواؤں گی، اب

میں خود تو یہ سب کچھ کرنے سے رہی، بڑی بی کے جراثیم، میرے بیٹے کو بھی لگ گئے، دودن میں ہی ذرا سامنے نکل آیا ہے بے چارے کا۔“

ہر ماں کی طرح اس کی جان بھی اپنے چار سالہ اکلوتے بیٹے میں تھی، اس کی پرورش ویسے ہی بڑے لاڈ پار اور جاؤ سے ہو رہی تھی، بیماری وغیرہ میں تو وہ ماں باپ کی پہلی کچھالیں بن جاتا تھا، ایک وقت میں دو دو مریض سنبھالنے سے نرس عاجز ہو گئی تھی، بیٹے کی بات الگ تھی، وہ اس کے وجود کا حصہ تھا، اس کی آمد اور پھر اسے پالنے پونے کے سارے مراحل نکتے ہی تکلیف دہ اور جانگسل۔ کیوں نہ ہوں، اس میں بھی اک سر خوشی اور راحت محسوس ہوتی تھی، ممتا کے جذبے کی تسکین یا مستقبل کے نشاط افزا خواب اولاد خصوصاً بیٹوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس ایک بوڑھی بیمار اور لاچار عورت کا کیا ہے؟ بے شک وہ اس کے شوہر کی ماں ہی سہی مگر اپنی ساری توانائیاں اور عمر وہ قریب قریب خرچ کر بی چکی تھیں، عمر کی نقدی میں فقط چند سکے باقی تھے۔ جو بھی بھی، کسی بھی وقت اچانک ختم ہو جانے تھے، ایک وجود جو ایک رشتے یا انسان ہونے سے زیادہ اپنے بوجھ ہونے کا احساس دلاتا ہو، اس کی اہمیت اور پروا ذرا کم ہی کی جاتی ہے۔

ایں کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اس نے فون کر کے دیور، دیورانی کو بلوا لیا۔

”کچھ ہو گیا تو کل کلاں کو مجھے ہی طے ملیں گے کہ آخری وقت میں بلوایا نہیں۔“ باتوں باتوں میں نرس نے دیورانی کو جتائی دیا۔ ”اب جہاں اتنی خدمت کر رہی ہوں تو چھوٹے بیٹے کو بھی ان کی آنکھوں کے سامنے کر دوں، بے چاری کو سکون مل جائے گا، اسی لیے تم لوگوں کو بلوایا، مجھی ماں ہیں، بے شک ہمارے ساتھ رہتی ہیں مگر ماں کی مانتا تو سارے بچوں کے لیے ہوتی ہے، چاہے دور ہوں یا قریب۔“

چکن فورمہ بناتے ہوئے نرس مسلسل بولتی رہی۔ طلعت ڈپلومیٹ بنی اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے

ساتھ ساتھ اپنی مجبوریاں بھی بتاتی رہی کہ وہ اپنے شوہر اور بچے کو اپنی ساس سے دور رکھنے پر کیوں مجبور ہے۔ ”دینے آج کل تم بلیک سوٹ بہت بنانے لگی ہو۔“ نرس نے اس کے بلیک سوٹ کو بغور دیکھا جس پر بہت نفاس سے پانچنگ اور ڈوریلوں سے ڈیزائن بنا تھا۔

”بس اتفاق ہے۔“ طلعت ایک ماہ میں چوتھی بار نیا بلیک سوٹ پہن کر آئی تھی اور اسے اتفاق قرار دے رہی تھی، جبکہ اپنی بہن کے یہی سوال پوچھنے پر اس نے جواب دیا تھا کہ

”جتنی کب بڑی بی کا پورے بلالو آجائے، سوئم کے لیے بنا کے رکھتی ہوں اور پھر پہن لیتی ہوں، یہ چوتھا سوٹ ہے۔“

اودھیا سر کا ہر کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ ”ماں کی بیماری میں ٹھیک ٹھاک پیسہ اٹھ گیا ہے، تھوڑی بہت سیونگ بھی سب ہی ختم ہو گئی، بہت مشکل حالات ہو گئے ہیں۔“ یا سر دھکے پچھے لفظوں میں یہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اب ایں پر رقم خرچ کرنے کی باری تمہاری ہے، اب ظاہر تھوڑا بہت اپنا حصہ ہی ڈال دے، مگر ظاہر بھی بیوی کا سکھایا پڑھایا ہوا تھا، زمانے بھر کی بے چارگی اور مسکینیت چہرے پہ طاری کرتے ہوئے گویا ہوا۔

”بھائی جان! آپ کو سب کچھ معلوم ہے ہمارا حال، روز کتناں خود کو بیانی پینے والے لوگ ہیں ہم، منگانی اتنی ہو گئی ہے کہ بس سفید پوشی کا بھٹکل بھرم رکھا ہوا ہے، طلعت بیمار ہو گئی تھی، ڈاکٹر نے طافت کے انجشن اور دوائیاں وغیرہ لکھی تھیں، ہفتہ دس دن تک استحال کیں پھر لای، نہیں سکا، خراجات ایسے ہیں کہ مہینے کے آخر میں پہنچ جان کے گزر بسر کرتے ہیں۔“

کھانا کھا کر وہ لوگ رخصت ہوئے تو بارہ بج چکے تھے نرس کچن سمیٹ کر بیڈ روم میں آئی تو اس کا موڈ آف تھا۔ آتے ہی یا سر برسر پر ہی۔

مشہور مزاح نگار اور شاعر انشاء جی کی خوبصورت تحریریں

کارٹونوں سے مزین
آفٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

قیمت	کتاب کا نام	
450/-	آوارہ گرد کی ڈائری	سفر نامہ
450/-	دیبا گول ہے	سفر نامہ
450/-	ابن بطوطہ کے نقاب میں	سفر نامہ
275/-	چلتے ہوئے چین کو چلیے	سفر نامہ
225/-	عمری عمری پھر اسافر	سفر نامہ
225/-	خمار گندم	طہر و مزاح
225/-	آرڈو کی آکری کتاب	طہر و مزاح
300/-	اس ہستی کے کوپے میں	مجموعہ کلام
225/-	پانچم	مجموعہ کلام
225/-	دل دہشی	مجموعہ کلام
200/-	اندھا کنواں	ایک گراٹین پو ایں انشاء
120/-	لاکھوں کا شہر	اودھری ایں انشاء
400/-	باتیں انشاء جی کی	طہر و مزاح
400/-	آپ سے کیا پردہ	طہر و مزاح

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

”ہمیشہ ہی دونوں میاں بیوی بے وقوف بنا کر چلتے رہتے ہیں۔ آپ نے ظاہر پر زور کیوں نہیں دیا، کیا وہ بیٹا نہیں ہے؟ ان لوگوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ اماں جی کی خدمت کرنے کا، غضب خدا کا ہر ہفتے بیگم صاحبہ نیا سوٹ بنا رہی ہیں اور ماں کے اوپر کچھ خرچ کرنے میں مزگانی کا رونا رو رہے ہیں دونوں میاں بیوی۔ آخر ہم کہاں کے لینڈ لارڈ ہیں جو یوں پانی کی طرح پیسہ بہاتے رہیں؟ اور ہاتھ پاؤں سے جو خدمت ہو رہی ہے وہ الگ۔“

”نرگس ایسے احسان جتا رہی تھی جیسے اماں کے سارے کام ہاسی کے بجائے وہ خود کرتی ہو۔“

”تو اب میں کیا کروں؟ اماں کو زبردستی تو ظاہر کے گھر چھوڑ کر آنے سے رہا۔“

یا سرنے دبے دبے لہجے میں ایسے کہا جیسے ماں کی بیماری اور لاچاری میں وہ خود قصور وار ہو، نرگس کے سامنے اس معاملے میں اس کا رویہ ہمیشہ معذرت خواہانہ ہی ہوتا تھا، نرگس کے ہاتھ کی شکنیں پھر بھی کم نہیں ہوئیں وہ مسلسل بریدراتی رہی تو فیکلہ اسے نیند آگئی۔

رات کے نہ جانے کس پر قدرت کو رحم آیا اور اماں کی اور بیٹوں ہوسوں کی بھی مشکلات آسان ہو گئیں۔ ظہری نماز میں تدفین کر دی گئی۔ شام تک بیشتر رشتے دار جو دور کے علاقوں سے آئے تھے وہ بھی چلے گئے رات میں ظاہر اور اس کی بیوی رک گئے تھے۔

دوسرے دن نرگس نے ماسی کو اماں کے کمرے کی صفائی پر لگا دیا، ان کا بستر چادریں اور تکیہ وغیرہ اوپر دھوپ میں ڈال دیا اور حلیہ کو بے سبب چیریں لے جانے کو کہہ دیا۔ الماری سے ان کے کپڑے بھی نکال کر اسے ہی دے دیے۔ نرگس کو ویسے بھی مرے ہوئے انسان کی کوئی چیز استعمال کرتے ہوئے بڑا خوف محسوس ہوتا تھا۔

طلعت بھی وہیں کمرے میں آگئی، کچھ دیر تک وہ نرگس کو الماری سے مختلف اشیاء نکالتے ہوئے دیکھتی

رہی، نرگس نے الماری بند کی تو اس سے صبر نہیں ہوا۔

”بھابھی! طلعت، جھٹائی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

”ظاہر بتا رہے تھے کہ اماں کے پاس کچھ زیورات تھے، شاید ان کی اپنی شادی کے موقع کے تھے، انہوں نے دیکھے ہیں پر اے اشائل کا گلو بند کاسیٹ تھا، ہم دونوں کو تو بری میں نئے ڈیزائن کے زیورات ہی چڑھائے تھے، وہ سیٹ شاید ان کے پاس ہی ہوگا، آپ کو کبھی کچھ بتایا نہیں انہوں نے؟“ طلعت نے بیٹھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

نرگس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس کی بات سن کر ”دھک سہسہلی فاختہ اور رائے لکھائیں کوئے۔“

فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی محاورہ آیا۔

”بیمار ماں کی دیکھ بھال اور خدمت گزاری کے لیے تو تم لوگوں نے ہری جھنڈی دکھا دی اور اب حصہ ہٹانے کے لیے ابھی سے حاضر ماں کے مرنے کے دوسرے ہی دن۔“

نرگس انتہائی تلخ لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں بابی! بڑی اماں کے پاس ایک کالی پیٹی ہے اس میں سے پتا نہیں کیا دیکھتی رہتی تھیں، ایک بار میں نے پوچھا بھی کہ اماں اس میں کیا دیکھتی رہتی ہو، کوئی آجائے تو جھٹ سے بند کر دیتی ہو تو کتنے لگیں کہ اس میں میری ساری دولت ہے۔“ حلیہ نے دخل اندازی کی جو وہیں کام کر رہی تھی۔

”تمہیں کس نے کہا ہے بیچ میں بولنے کو۔ جاؤ، جا کے اپنا کام کرو۔“ نرگس اس پر برس پڑی۔

”دیکھا۔ میں نے کہا تھا تا کہ ان کے پاس کوئی نہ کوئی قیمتی چیز موجود ہے۔“

اپنی بات کی تصدیق ہونے پر طلعت چمک کر بولی، ملنے والی متوقع خوش خبری نے جھٹائی کا سخت لب و لہجہ اور بات بھی، نظر انداز کر دادی۔

”بلکہ میں خود ہی دیکھ لیتی ہوں۔“ طلعت لپک کر

الماری کی طرف بڑھی نرگس کی کھا جانے والی اور گھورتی ہوئی نظروں کی پرواہ کیے بغیر الماری میں کئی اشیاء کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی گئی۔

ایک کالے رنگ کا چھوٹا سا ٹیچی کیس الماری سے نکال کر اس نے نیچے رکھا۔

”جاذب!“ کمرے سے باہر اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔

”مے پیا کو بلاؤ اور بڑے ابو کو بھی۔“ طلعت کا چہرہ خوشی اور کامیابی کے احساس سے چمک رہا تھا۔

”کیسی کھنی تھیں بڑی لی!“ نرگس کے دل میں مری ہوئی سانس کے لیے غصہ اٹھنے لگا۔ ”ساری خدمتیں ہم نے کیں اور کبھی بھیک بھی نہیں پڑنے دی کہ اپنی دولت پر سانپ بن کر بیٹھی ہیں محرام ہے جو کبھی کوئی اشارہ بھی دیا ہو کہ اپنے زیورات کیجیے سے لگا کر رکھے ہیں، کبھی بھاپ تک نہیں نکالی منہ سے۔“

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے نرگس یہ بات بیکسر فراموش کر گئی کہ وہ سانس کے پاس آکر بیٹھی ہی کتنا تھی، جو انہیں کچھ کہنے سننے کا موقع ملتا۔ یا سرنے کبھی کبھار کھڑے کھڑے خیر خیریت پوچھ لیتا اور اس کو تو اس کی بھی فرصت نہیں تھی۔

یا سرنے اور ظاہر بھی آگئے تھے۔

”چلو کچھ تو چھوڑ کے گئی ہیں۔“ یا سرنے کے دل کو تھوڑا اطمینان ہوا، ”تین تیر خرید کے رکھ دوں گا، آگے چل کے کام آئیں گے۔“

ظاہر سوچ رہا تھا کہ ملنے والی رقم سے پرانی موٹر سائیکل بیچ کر نئی بایک خرید لے گا بہت عرصے سے اس کی خواہش تھی مگر اتنی رقم نہیں ہو پاتی تھی بڑی مشکل سے لاک تو ڈر کر یا سرنے اسے کھولا، سب کی تجویز اور اشتیاق بھری نظرس اندر سے نکلنے والی اشیاء پر جمی تھیں، ایک ایک کر کے مختلف اشیاء نکلتی گئیں اور ان سب کے چہرے پھیکے پڑتے چلے گئے۔

سب سے اوپر یا سرنے اور ظاہر کی شادی کی دو تصاویر

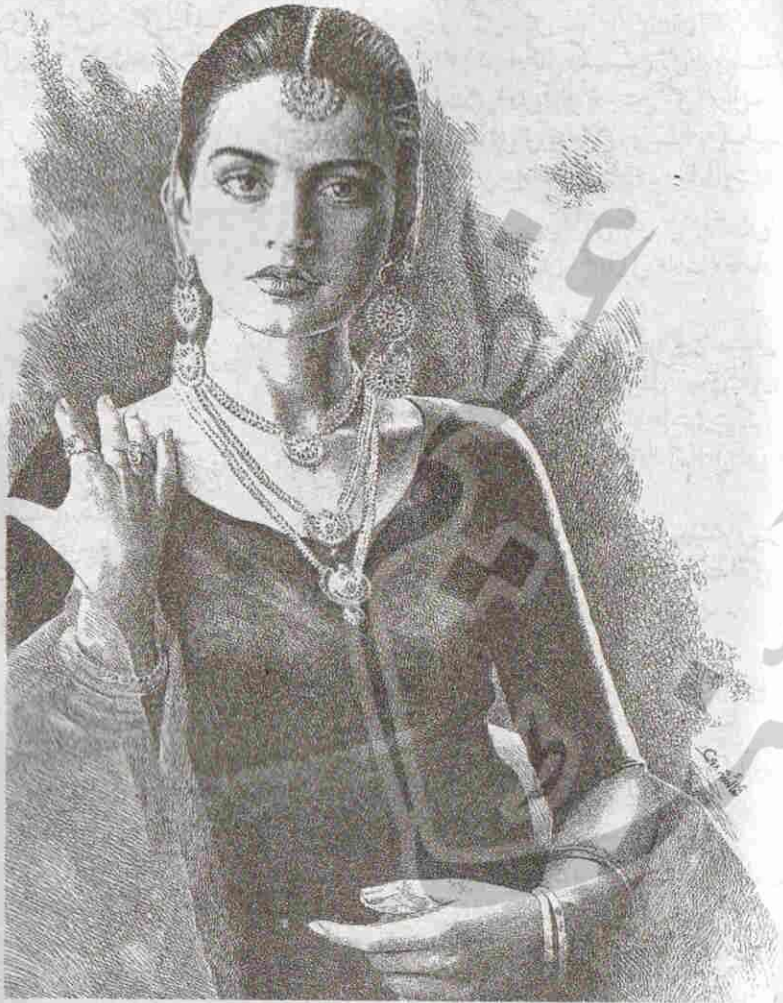
تھیں، دونوں دولہائے اپنی بیویوں کے ساتھ تھے، دو تصاویر دونوں بچوں کی تھیں، ایک بہت پرانی کھلونا گاڑی تھی جس کے تین پہیے نکلے ہوئے تھے اور ایک چکی ہوئی کینڈ، جس کا رنگ بھی اڑ چکا تھا۔ یہ دونوں چیزیں یا سرنے اور ظاہر کے بچپن کی یادگاریں تھیں، جب بیٹوں کی بہنات اور کھلونوں کی افراط نہیں تھی۔ وہ دونوں چند مخصوص چیزوں سے ہی کھیلا کرتے تھے۔

ہاتھ کا بنا ہوا ایک سویٹر جس نے کئی سردیوں یا سرنے کا ساتھ دیا تھا جس میں اولن کی گرمائی کے ساتھ ساتھ ماں کے احساس اور محنت کی حرارت بھی شامل تھی، گوئے کنارے سے جی ایک خوب صورت عملی ٹوپی جو ظاہر کی بسم اللہ پر بڑے اربابوں، چاؤ اور محنت سے بنائی گئی تھی، دو چھوٹے چھوٹے بدرنگ سے جھپٹے، ہاتھ کے ہی بنے ہوئے ایک جوڑی گلابی رنگ کے خوب صورت سے موزے، ایک ٹوٹے ہوئے بیٹ کا آدھا حصہ تھا، جو یا سرنے کی اسکول لائف کی یادگار تھا۔ اسی بیٹ سے اس نے ایک زوردار چھکارا تھا کہ بیٹ دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ ایک زنانہ رسٹ وایچ تھی، جو ظاہر نے اپنی پہلی تنخواہ ملنے پر ماں کو لا کر دی تھی۔ کروشیے کی بنی ہوئی سفید ٹوپی جو اب پہلی ہو چکی تھی اور چار خانے والا نیلا رومال، یا سرنے اور ظاہر کو اچھی طرح یاد تھا کہ یہ ٹوپی اور رومال باجی استعمال کرتے تھے۔ سب سے آخر میں ایک لفافے میں دو رسیدیں تھیں جس کے مطابق چیلر کو کچھ زیورات فروخت کر کے دوسرے نئے زیورات خریدے گئے تھے۔ ان رسیدوں پر جو تاریخ درج تھی وہ ان دونوں کی شادی سے ایک ماہ پہلے کی تھی۔

کمرے میں گہری چپ کاراج تھا، نرگس اور طلعت خاموش تھیں اور یا سرنے اور ظاہر کے اندر کوئی شور مچا رہا تھا، دونوں کی آنکھیں خشک تھیں مگر اندر ہی اندر کوئی طوفان سا آ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو پڑے، انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے آج ہی، ابھی ابھی اماں کا انتقال ہوا ہو۔

کھانے میں سب سے زیادہ سینڈویچ پسند ہیں؟ کیوں؟

پہننا، اوڑھنا، سنانورنا آتا ہی نہیں۔ اب بچیا کی
 خالی کی بیٹی کو بھی دیکھ لیں۔ اس کی اے میں بڑھتی
 ہے۔ کتے ہیں طلبہ و اساتذہ میں یکساں مقبول ہے، مگر
 فٹے تو کچھ بوقت کی گئی۔ جو قمیص پانچوہ خنوں کو چھو
 ہی تھی اور دوپٹے کی ہلکیوں ماری تھی جس طرح



پچھو کی نواسی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اندھے پھسکی رہنے کو ہاتھ اٹھایا۔ وہ مصافحہ لینے کے لیے ہاتھ ہوا میں لہرائی رہ گئی۔ سچی کو شرمندگی سے بچانے کے لیے میں نے جھٹ جوالی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ محترمہ رکوع میں چلی گئیں، پھسکی لینے کے لیے۔ لاجل والا۔ بھی اوب و آداب، میل ملاقات کا بھی تو کوئی طریقہ سلفہ ہونا۔

دو چار اور بھی دیکھیں جو زور لے رہے اپنی عمر سے بڑی ہی لگیں۔ نہ بھی۔ ایک آدھ بچے کے بعد علی کی بیوی کم خالہ زیادہ لگنے لگیں گی۔
”یا اللہ! کوئی تو چھوٹی موٹی سی لڑکی سامنے آئے۔ جس پر آنکھ اور دل دونوں ٹھہر جائیں۔“ میں نے بہت دل سے دعا مانگی تھی اور شاید وہ گھڑی قبولیت کی ہی تھی۔

”بجیا! یہ لڑکی بھلا کون ہے؟“
بلابالغہ میں نے اس لڑکی کو کوئی تیسری بار دیکھا تھا اور تینوں ہی مرتبہ وہ مجھے میرے پسندیدہ رنگوں کے ملبوسات میں دکھائی دی تھی۔
پہلی بار مہندی پر۔ شوخ، بھڑکیلے رنگوں کے بجائے سیاہ رنگ کے لباس میں۔
میں فون پر علی کو کھانے پینے کے بارے میں سخت قسم کی پدایات دے کر پٹی تو اچانک ہی اس لڑکی سے ٹکرائی تھی۔ اس کا پاؤں میرے پاؤں تلے آگیا تھا۔
وہ بے چاری سسکاری سی لے کر قریبی صوفے پر گری اور فوراً ہی جو تار کر اپنے پیر کا جائزہ لینے لگی۔
سفید کبوتروں جیسے پیر سیاہ ڈوروں والے سینڈل میں مشید تھے، میری نظر ٹھہری گئی۔

خوب صورت اور خاص طور پر صاف ستھرے ہاتھ پاؤں میری کمزوری تھے۔
زیادہ چوٹ تو نہیں آئی تھی، مگر ازراہ مروت ہی میں نے معذرت کرنا چاہی، تو اس نے بڑے سہاؤ سے مجھے خاموش کرادیا۔

”ارے نہیں۔ بالکل چوٹ نہیں آئی، ویسے بھی رش زیادہ ہے، مجھے خیال کرنا چاہیے تھا۔“ وہ مسکراتی ہوئی اٹھ گئی تھی۔

دوسری ملاقات بار بار تو اگلے دن ہوئی۔
سب انتظام ہال میں تھا، مگر بات کے آنے پر جو افرا تفری سی پھیلتی ہے، وہ یہاں بھی دکھائی دے رہی

تھی۔ پارٹیوں کے استقبال کے لیے بیشتر کرسیاں خالی ہو گئی تھیں۔ میں نے آنکریوں ہی ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، تب وہ گلابی رنگ کے چوڑی وار پاجامے اور فرائ میں بلبوس قریبی نشست پر بیٹھی نظر آئی۔
بہت ہلکی سی جیولری اور برائے نام میک اپ۔ آنکھوں پر سیاہ لائنز اور پلکوں پہ مسکارا البتہ نمایاں تھا۔ مجھے اس کی یہ ادا بھی اچھی لگی، کیونکہ میں اب تک میک اپ میں آنکھوں کی سجاوٹ کو خاصا وقت دیتی ہوں۔

مجھ سے نظریں چار ہوئیں تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر فوراً مجھ تک آئی۔ دعا سلام ہوئی، تب ہی میزبان اور یارقاتی ہال میں داخل ہوئے۔ زیادہ بات چیت تو نہ ہوئی، مگر اس کا سنبھا ہوا رکھ رکھاؤ والا انداز دل میں جگہ کر گیا۔

اور آج تیسرا دن تھا کہ پستی رنگ کے لباس میں وہ روشنی سی بن کر سامنے کی سیڑھیوں سے اتری اور ویسے پر آئے مہمانوں میں کہیں کھوسی گئی۔
اور میں، بجیا سے پوچھتے بنا نہ رہ سکی۔
”میری مندی کرن کی بیٹی ہے حوریہ۔“ بجیا نے بتایا۔

اور پھر کھانے کے دوران میں دانستہ اس لڑکی کی تلاش میں کھانے کی پلیٹ لیے گھومتی رہی اور جب نظر آئی تو سکون کا سانس لیا۔

سلاد اور ذرا سے چاول۔ پلیٹ میں ڈالے۔ وہ پیپسی کا گھونٹ لے رہی تھی۔
بہت زیادہ کھانے والی پٹو لڑکیاں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔

میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا اور بجیا کو حوریہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کا کتے ہوئے میاں جالی کو فون کھڑکادیا۔

”گلتا ہے۔ بات بننے والی ہے۔ میں لڑکی کے گھر سے ہو آؤں۔ پھر آپ کو بتاؤں گی۔“
میں نے بجیا کی طرف چند روزہ قیام کا ارادہ کیا۔ اور

ایک روز ہوتا ہے ہی حوریہ کے گھر جاؤں گی۔ ماضی میں وہ محترمہ بھی غالباً میرے ہی قریب سے تعلق رکھتی ہوں گی، جو بسو کی کھوج میں گھر گھر جاکر کوڑا جمع کرتی رہیں۔ اب اس زمانے میں، میں جمعدار کا بسوپ تو بھرنے سے رہی، بس ان کے گھر کے قریب گاڑی خراب ہونے کا ہمانہ ہی کافی تھا۔

بجیا کو ساتھ لے کر گئی تھی کہ ان ہی سے جان پہچان تھی ان کی۔ جوں ہی گھر میں داخل ہوئے۔ پرنیٹ انداز میں استقبال ہوا۔ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پذیرائی کے اچھی نہیں لگتی۔ میں دل ہی دل میں خوش، مطمئن بڑی تسلی سے بیٹھ رہی، بس ابھی چند اسٹکان اور پانی تھے۔ بچہ۔

مے بھی تو پینا بھی تو ساتی بھی تو، محفل بھی تو ساوگی سے سجا ہوا گھر تھا۔ آرائش پر بہت زیادہ خرچ نہیں کیا گیا تھا۔ سبز بیلوں اور رنگ پرنگے پھولوں سے ہر سوئی دیوار اور ستون کو آباد کیا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں کین اور بیو کا فرنیچر، ہر دور کے فیشن میں ان۔

حوریہ کی امی کسی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ والد صاحب کالج میں لیکچرار۔ حوریہ چائے لے کر آئی تو براؤن رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ ایک بار پھر میرا پسندیدہ رنگ۔

”اف خدایا! اس لڑکی کو جانے کیسے خبر ہو گئی کہ میں براؤن رنگ پہرتی ہوں۔“ وہ چائے لینے گئی تو میں نے بجیا کے کان میں سرگوشی کی۔ چائے کے ساتھ جو لوازمات آئے انہیں دیکھ کر میں تو میں، خود بجیا کا بھی حیرت سے منہ کھل گیا۔

میکونیزر کا باؤل۔ کباب۔ کیک۔ تینوں چیزیں اوم میڈ۔

خود میرے گھر میں اچانک آجانے والے مہمانوں کی تواضع ان ہی لوازمات سے کی جاتی ہے۔ اور وہ بھی میرے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی۔ بازاری چیزوں سے میں طالع الجاہل ہوں، ہمیشہ گھریلو پکوان قلیل ترجیح، پینگ

گلے نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آئے، میں جھوم جھوم گئی۔
تھاجس کا انتظار۔

میں فخریہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔

ماپوں، مہندی، بارات۔ لیجئے سارا کھیل بس یہیں تک۔ ساری بھاگ دوڑ ختم، دلن گھر آگئی، من کی مراد پوری ہوئی، میاں نے سر ہار شتہ داروں نے ستائش کی، سب انتظام بخیر و خوبی اپنے انجام کو پہنچا۔
لوگ بے باک ابھی تک دولہا، دلہن کو گھیرے بیٹھے تھے، لڑکیوں کا جوش و خروش دیدنی، سب رکیں ہو گئیں۔ آخر میں نے ہی زبردستی سب کو اٹھا کر خواب گاہوں کی راہ دکھائی، حوریہ کو اس کے کمرے تک پہنچایا۔ سرخ گلابوں سے سجائیڈ روم اپنے کمرے کی آرائش و سیاحت، سب علی مہران نے خود کروائی تھی۔ ہم لوگوں نے تب ہی دیکھا جب حوریہ نے کمرے میں قدم دھرا۔

میرا بیٹا اتنا رومانٹک مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں شمع دان۔ مسہری چنبیلی اور گلاب کی خوشبو سے مہکی ہوئی۔ دیواریں گلاب کی لڑیوں سے آراستہ، حوریہ کو بیڈ پر بٹھا کر پھر میں نے زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا ویسے بھی مہران صاحب بیڈ روم میں جلد آنے کا اشارہ دے گئے تھے، مجھے سوچ کر ہنسی لے لگی۔

”ہاں ابھی باپ اتنا رومانٹک ہے تو بیٹا بھی وہ باتھ آگے ہی ہو گا۔“

کمرے میں آتے ہی مجھے یاد آیا حوریہ کی منہ دکھائی گئی تھی، تو اب میں نے علی مہران کو یاد ہی نہیں، زیورات کے ساتھ علی مہران نے وہ ڈبہ بھی مجھے ہی دیا تھا۔

”بہت ہی بھولا بیٹا ہے آپ کا۔ اتنا اہم کام بھی یاد نہیں۔“ میں نے مہران صاحب کو بتایا۔ غلٹ میں وہ ڈبہ نکالا اور علی مہران کے بیڈ روم کی طرف لپکی۔

علی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نظر آیا۔ جتنی دیر میں میں نے پکارنا چاہا وہ دروازہ بند کر چکا تھا۔
”یا ہوسے۔“ ہم جتنا کہنے سے بلند ہوا اور ہوا

کے دوش پر لہراتا میرے کانوں تک پہنچا۔

”فیس بک۔ زندہ باد۔“
”ہائیں۔“ میں ذرا سا ہلکی۔
”یہ علی مہران کو کیا ہوا؟“

”اچھا۔ اچھا۔ فیس بک یعنی کتابی چروہ۔ چلو شکر ہے۔ علی مہران کو حوریہ پسند تو آگئی، لیکن بھی اتنے نعرے بازی کی بجھلا کر ضرورت ہے؟ بس یہ آج کی نسل بھی نا؟ اب ایسے وقت میں خواجواہ دروازہ بجا کر انہیں ڈسٹرب کیا کرنا واپس ہی چلنا چاہیے۔“
ہے جوش گل ہمار میں

”اوہ میرے خدا! اس جتن سے یہ دن آیا ہے، جی چاہتا ہے ہوا میں اڑوں، آسمان کو چھو لوں، یا پھر دو چار جستوں میں سمندر ہی پھلانگ جاؤں، حوریہ سے دوستی کو ایک سال بیت گیا تھا۔ فیس بک پر فریڈ شپ ہوئی، بعد میں معلوم ہوا دو در پرے کی رشتہ دار بھی لکتی ہے، لیجئے کام آسان ہو گیا، اس دور پرے کو قریب ترین میں بدل دینے کی خواہش دل میں بھٹکنے لگی۔

ان ہی دنوں مہرا میرے رشتے کی کھوج میں نکل پڑیں۔ کبھی کسی زمانے میں، شاید بچپن میں کسی بھلے انسان نے پوچھا تھا۔

”کیسی دامن لاؤ گے؟“
میں فٹ بولا تھا۔ ”ماما جی۔“

اور ماما نے کمرہ میں باندھ لی یہ بات، ایسی کی مضبوط گرہ کہ وقت آنے پر ہی کھلی، اور میں منہ ہی دیکھتا رہ گیا۔

”فلاں لڑکی منہ پھاڑ پھاڑ کر بنتی ہے۔“
”فلاں کے ہاتھ میں ڈانقہ نہیں، اہلی ہوئی گو بھی لاکر سامنے رکھ دی۔“

ایسی پرفیکشنسٹ میری ماما۔ بات بنے تو بنے کیے؟

میں کیا جانوں خود کھانا کیسا بناتی ہے؟
مجھے کیا خبر کہ حوریہ کو پہننا توڑھنا آتا ہے کہ نہیں؟

طریقہ سلیقہ کتنا ہے میری جانے والا۔ مجھے تو بس اتنی خبر تھی کہ حوریہ کی سوچ، اس کے خیال، اس کے معیار اس کا ذہن، مجھ سے ہم آہنگ ہے۔
تو پھر؟

”بابا! اتنے بڑے بڑے کونسلر جن مارک۔ کہ بابا کو پکارے بنا نہیں رہ سکا۔
اور بابا۔ دی گریٹ۔
”مہندی پر بلیک سوٹ۔“ بابا کا حکم ہوا۔

”کیا؟“ حوریہ چیچی۔
”وہ تو لیمے۔“
”نہیں۔ صرف مہندی پر۔“

”شادی پر پنک۔“
”پنک سوٹ؟ لیکن کہاں سے؟ میرا تو کوئی سوٹ پنک نہیں، اچھا کرکو، تھمو، خولہ، خولہ، تمہارا پنک سوٹ۔“

اور پھر جو جو پہنا، کماؤ، وہ ہم نے کیا اور آج اپنی محبت کو پالنے کا شہ بھی چکے لیا۔
لیکن مجھے حیرت ہوئی تھی۔

”بابا! آپ ماما کو اتنا جانتے ہیں؟“ ایک روز کھانے کی میز پر میں نے یوں ہی پوچھ ڈالا۔

”ہمارے پاس کوئی اور جو اس نہیں بیٹھے۔ ہم نے اسی فیس بک کو بڑھنے میں ایک عمر گزار دی ہے۔“

”ہائیں۔ فیس بک؟“ ماما سالن کا ڈونگا رکھتے ہوئے چونکیں۔

”فیس بک کیا بلا ہے بھی۔ آپ دونوں باپ بیٹے اسی پر فدا ہو گئے؟ اس روز علی بھی۔“

مما جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ حوریہ تو سٹپٹا کر کھڑی ہی ہو گئی۔

”مما! آپ بیٹھے نا، کھانا میں سرو کرتی ہوں۔“
وہ ان کے ہاتھوں سے ڈونگا لینے لگی تھی۔
اس کی بوکھلاہٹ پر ماما، ان، جبکہ میں اور بابا کھل کر مسکرا دیے تھے۔

☆

چاہ اور مکتبہ

سیل فون پر نگاہ پڑتے ہی علیشا چو کی ہانچ بچ کر تیس منٹ ہو چکے تھے۔ پورے گھنٹے بھر کاسٹر کے بھر گھر کی صورت نظر آئے گی۔ اس نے پانی کا ٹھہراں، خالی پیج بکس اور ہینڈ بیگ اٹھایا اور کرسی سے اٹھتے وقت کولنگ کو اگلے روز کے اسائنمنٹ کی بریفنگ دے کر بس اسٹاپ کا رخ کیا۔

راستے میں ایک بار پھر خوابوں سے اس کی مڈ بھیڑ ہو گئی۔ جدید ترین فیشن اور رجائوں کے فریجری وکانوں کی روشنیاں جل چکی تھیں۔ مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ کسی دکان پر لبرر کے فریجری تو نہیں ساگولی اور شیشم کی لکڑی کا چینیو اسٹائل کا خمدار صوفہ سیٹ، کہیں دائیں جانب جلتے ہوئے ٹیبل لیپ کی روشنیاں اسے اپنے دل کے معبد خانے میں ٹمٹماتے چراغ سے لگتی تھیں۔ روزانہ وہ اس طویل شاہراہ سے گزرتی اور سوچتی کہ اس پارینک میں پندرہ ہزار روپے جمع ہوئے ہیں۔ چار ہزار عید کی ملا کے کل ہو گئے 19 ہزار صرف چھ ہزار اور جمع ہو جائیں گے تو وہ نیا صوفہ ضرور خرید لے گی۔

اس کا ڈرائنگ روم بھی ایک مشہور فرنیچر شاپ کے دیے ہوئے ایک ویب سائٹ کے ایج کے مطابق جج جائے گا۔ یہ ڈرائنگ روم میرے اور میرے خاندان کے ذوق کی عکاسی کرے گا۔ ٹھیک ہے کہ گھر مکینوں سے بنتا ہے اور مالی حیثیت ان کی کیسی ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنی علمی بصیرت اور اخلاقی اقدار سے بچانے جاتے ہیں مگر اس کے باوجود سماج کے معیار مختلف ہو گئے ہیں۔ جس گھر کے لاؤنج اور ڈرائنگ روم سے

مستے یا انتہائی منفرد فرنیچر اور آرائش کا شاہیہ نہ ملے وہ گھر گھر نہیں لگتا۔ جس طرح ہم عورتیں میک اپ کے اطمینان اور اعتماد محسوس کرتی ہیں اسی طرح گھر کی آرائش کر کے وہی اعتماد قطرہ قطرہ اپنے اندر اتارتی ہیں۔

اسی اثنا میں اس کی بس آگئی اور وہ خوش دلی سے اس میں سوار ہو گئی۔ ”میں واپسی پر آج قیمہ لے جاتی ہوں مشاورد آلو تو گھر میں ہیں۔ اظفر اور زین دو دن چاول پسند کرتے ہیں تو بس ٹھیک ہے قیمہ چاول اور پچھلے سپر کی وال نئے بھار کے ساتھ اچھا کوہنیشن رہے گا۔ اس ماہ کیا بڑا کام کرنا ہے؟ بلوں کی ادائیگی وقت پر ہو گئی یا نہیں، موسم بدل رہا ہے اظفر کو اسکول یونیفارم کا سونٹ بھی لے کر دینا ہے۔

اظفر کو چنگ سینٹر سے آکر اسٹینکس کھالے گا؟ جلیبیاں، سموے، ٹکٹس یا شاہی کباب گھر میں کچھ تو ہونا چاہیے۔ ہاں کوئی کولڈ ڈرنک بھی فریج میں رکھا ہو تو کیا برا ہے؟ ہمارے گھر میں سب چیزیں محفوظ رکھی جاسکتی ہیں ماسوائے کولڈ ڈرنک کے۔ لے جاتی ہوں پھر بھی۔“

وہ بڑبڑاتی رہی۔ لمبا سفر تھا اور دن بھر کا تھکا ہوا دماغ۔ اوگٹھ سی آنے لگی مگر ہمارے ہاں کی بسوں میں اس قدر آباوہالی ہوتی ہے کہ اوگٹھتے وقت بھی اپنا خیال خود رکھنا پڑتا ہے۔

”اعصابی تھکن کیوں ہونے لگی مجھے، میں تو صحت مند ہوں۔“ اس نے خود کو دلاسا دیا۔ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔ دفتر میں معصومیت صحیح جاتے تو گھر پر کوئی نہ

ہے آج کیوں دل ڈوب رہا ہے؟ کچھ زیادہ دباؤ تھا شاید کام کا۔“

وہ سبزی خریدنے خواجواہ رک گئی، حالانکہ فیصلہ کر کے چلی تھی کہ قیمہ آلو پکانا ہے۔ قیمہ تو لے لیا۔ اب کیا رہ گیا، اگلے روز کے لیے بھنڈی اور نمائے ہاں یہی بہتر ہیں۔ مرکزی شاہراہ پر کھڑے کھڑے دلغ باؤف سا ہونے لگا تھا۔

”کیا حساب ہے بھنڈی؟“ علیشا نے سبزی والے



سے پوچھا۔

جواب ملا ”چالیس روپے بی بی۔۔۔“ اور وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
”اے کوئے آدھا کھوٹا تو دل دو۔“

سبزی لے کر وہ اوپر اپنے فلیٹ میں آئی۔ اظفر اس کے بیٹے کا یوٹر آیا ہوا تھا۔ وہ بچن ہی میں بیگ اور سبزی کا تھیلہ لے گئی۔ بائیں جانب سلیب پر انہیں دھر کر چائے بنانے لگی۔ قیہ تھوڑی دیر کے لیے اس نے پیچھے رکھ دیا تھا۔ مبادا چائے میں اس کی منک نہ آجائے۔ یوٹر کو ایک پیالی دے کر وہ قیہ چڑھانے لگی سارے سالے اکٹھا ڈال کر ڈھکن ڈھک کے وہ راہداری سے ہوتی ہوئی بیڈ روم میں چلی گئی۔

”بیٹا! کبھی بیٹی جیسا کھوٹا دل نہیں رکھتا۔“ اس کی سہیلی روانے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔ اب یہی منظر اس کے گھر میں اترا ہوا تھا۔ بے ترتیب چھوٹے اور پھیلی ہوئی اشیاء شری ”پتا نہیں کیا تلاش کرنا چاہتا اظفر نے“ اس نے ایک ایک کر کے چیزیں سمیٹنا شروع کیں۔ اس سے پہلے کہ زین دفتر سے لوٹیں وہ چاہتی تھی کہ ہر کمرہ ترتیب سے آراستہ ملے۔ چند لمحوں ہی میں یوٹر کی رخصتی کا وقت ہو گیا۔ وہ جاتے جاتے علیشا کو اظفر کی تعلیمی کارکردگی پر بریف کیا کرتے تھے۔ اظفر کے بلانے پر وہ باہر گئی۔ اتنے میں وہ موبائل آن کر کے اب تک کے آئے ہوئے میسجز اور مسد کالز دیکھنے لگا۔

”برخوردار! تشریف لائے آپ بھی۔“ علی رحمن، اظفر کے یوٹر نے اسے آواز دی اور وہ تیزی سے موبائل میز پر دھر کے ان کے قریب آکھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر ان تینوں میں معمول کی گفتگو ہوئی۔ یوٹر رخصت ہوا تو علیشا بچن میں قیہ بھونے اور آٹا گوندھنے میں مشغول ہو گئی۔

بیل فون پر میسج ٹیون آئی تو اس نے آٹے میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں کو صاف کرنے کے بعد پرہا۔ لکھا تھا ”میرا سسری سلمان نکال دینا۔ مجھے لاہور جانا ہے رات کی فلائٹ سے۔ پر سول رات واپسی ہوگی۔“

زین العابدین ایڈورٹائزنگ میں فری لانس پروڈکشنز کرتے تھے۔ پچھلے چند برسوں سے یہ گھرانہ مالی مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ چند اداروں کی قسیمی فائیں اور اسکرپٹ تکمیل کو نہیں پہنچ سکے تھے اور کئی ایک نے اب تک معاوضہ ادا نہیں کیا تھا۔ مالی تنگی کو دیکھتے ہوئے علیشا نے سبز اور مارکسٹنگ کے بھولے بسرے سبق پھر پڑھے اور ملازمت کرنی تاکہ گھر کی کھوکھلی ہوئی ہوئی معیشت کا سہارا بن جائے۔ گراہی روز افزوں بڑھتی چلی جا رہی تھی اور نہ زندگی آسانی سے گزر سکتی تھی اب لائف اسٹائل بھی ایسا ہوتا چلا جا رہا تھا کہ جس میں اپرٹل اور ٹرل دونوں ہی طبقے مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ وہ بھی سوچتی تھی کہ دنیا میں ہر کوئی تو سونے کا چچرے کر نہیں پیدا ہوتا، پھر زین ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ ہم پیچھے رہ گئے ہمارے پاس دنیا کی ہر آسائش ہونی چاہیے تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے زین کا اچانک لاہور جانا بہت کھلا۔ رات گئے وہ لوٹے تو اپنا بیگ دیکھ کر مسکرائے۔

”آج نہیں نکل صبح جانا ہے۔ پروگرام بدل گیا ہے۔ کلائنٹ کا موڈ ہوتا ہے ناں! اسے شاید مار میں رقص فلانا ہے۔ بسکٹ کا اشتہار ہے اور ناچ کے بسکٹ بیچنا ہے۔“

علیشا سنجیدہ تھی مگر زین بلکے بھلے خوٹکوار موڈ میں تھے۔ اس نے زبردستی مسکرا کر ”اوکے“ کہا۔

”کھانا لگاؤں کیا؟“ رات کے بارہ بجے تک وہ ان کا انتظار کر رہی تھی جبکہ اظفر کے اسکول کے لیے چھ بجے بیدار ہونا بہت ضروری تھا۔ چاہتی تھی کہ جلد فراغت ہو جائے تو وہ بھی بستر میں جاسکے، لیکن وہ صرف بچے کو کھلا پلا کے سونے پر آمادہ کر سکی۔ بچہ بھی ایسا تھا کہ باپ کے آنے تک تھیل کو دین میں گمن رہتا چاہتا تھا تاکہ ان کے آنے پر ہی سوئے علیشا کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ گھر کے نظام الاوقات متعین ہو جائیں۔ بھی اس کا زور چلتا تو کبھی نہیں۔ اسی اثنا میں زین بولے۔

”کھانا رہے دو، چائے بنا دو۔“ وہ پھرتی سے مڑی اور

بچن سے چائے کی محسوس کن منک آنے لگی۔ چائے گرم کرتے ہی وہ بولے۔

”یار! ذرا سرسوں کا تیل لیتی آنا اور تکیے کو ایک اور لٹاف پہنا دو ورنہ تمہارا لایا ہوا نائیکہ روغنی روٹی کا نقشہ بن جائے گا۔“ وہ مسکرا رہے تھے۔ علیشا کو یہی آگئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ان کے سر کی مالش کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ کرا سینے لگی۔ بلکے ہوئے اخبار پھیلے ہوئے جوتوں کے جوڑے، کمپیوٹر ٹیبل کی صفائی وغیرہ۔

جب رات وہ سونے کے لیے لیٹی تو زین نے لائٹ گل نہیں کی بلکہ کہا۔

”میں سوچ رہا تھا اب اظفر سمجھدار ہو گیا ہے۔ ہمیں کمرہ علیحدہ کر لیتا چاہیے۔“

اسے حیرت ہوئی تھی لہذا اس نے ایک لمحے کو اپنے اندر ارادے کی کمزوری سی محسوس کی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو بھئی؟ کیا کہہ دیا میں نے؟ آج کل کچھ کیا نہیں جانتے۔ ہماری اخلاقی اور سماجی اقدار شرم و حفاظت والی ہیں۔ ہماری تہذیب۔۔۔ وہ کتنے کتنے رک گئے۔“

علیشا نے اپنا تکیہ اٹھایا اور لائونج میں بچھے صوفہ کم بیڈ پر آؤتر چھا خود کو گولیا۔ سارے دن کا تھکا ماندہ جسم مل بھر میں نیند کی دایوں میں کھو گیا۔ علی الصبح اذانوں کے وقت آنکھ کھلی تو گردن میں دھکن سی محسوس کی مگر ہماری تہذیب۔۔۔ اس سے آگے وہ پتا نہیں کیا یاد رکھنا چاہتے تھے۔

وہ چائے لے کر کمرے میں گئی تو وہ فون پر اپنے اسٹنٹ کو کچھ سمجھا رہے تھے۔ سینئر ٹیبل پر چائے رکھ کر وہ جانے لگی تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روکنے کو کہا۔ بات ختم کر کے وہ بولے۔

”اظفر کی فیس دے دی ہے کیا؟“
”جی! دو تارن ہی کو دے دی تھی۔“
”یو لہ لہی بلز ہو گئے کیا؟“

”بجلی کا بل ہی باقی ہے۔ گیس اور پانی کے تو ادا ہو گئے۔“

”آج ایک عرصے بعد انہوں نے گھر کے معاملات میں دلچسپی لی تھی۔ اسے وہ بہت اچھے لگے۔ ورنہ تو اسے یاد تھا کہ بھی اظفر کے یونیفارم ذاتی استعمال کی اشیاء گھر کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے کبھی بنا کے چند روپے پھیلی پر رکھے ہوں اور وہ ہر یار کی سوچتی کہ ہر مرد کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ کوئی اتنا ڈومیسٹک نہیں ہوتا اس لیے دوسرے مردوں کے ساتھ زین کا مقابلہ کرنا ہرگز صحیح نہیں ہوگا۔ علم و دانش رکھنے والے افراد ذرا مشکل پسند بھی ہوتے ہیں اور ان کی فلاسفی بھی اور طرح کی ہوتی ہے۔“

اشفاق احمد اور انور قاسم نے ساری حیاتی محبت کے اسی فلسفے کی گہری کھولیں اور ہر یار کی بتایا کہ محبت میں اتنا فنا ہوتی ہے تو محبت ہوتی ہے ورنہ یہ ہوتی ہی نہیں ہے۔ جب اتنا اور غور کی مٹی سے پیر بھرے رہیں تب تک راستہ نہیں نکلتا۔ مٹی راستہ عبور نہیں کرنے دیتی۔ اتنا کوئی لباہہ کوئی پردہ نہیں رکھتی۔ صاف دل شفاف نیت اور ایمان داری سے سپردگی کا عالم، یہ ہوتی ہے محبت کی فضا۔

اندر سے آواز آئی ”ہائے فی علیشا! تیرا لیا شہر بھنھو تو نے نہ پانی محبت۔ اب تو کپڑے دھو برتن مانجھ کر اور چاکری کر کے ہی تجھے دنیا کے روپو سہاگن کا سواگت بھرتا ہے۔ وہ سالہ بھونتی جاتی اور خود کو دلاسا دیتی جاتی۔ آج میں یہ پکلاؤں، آج میں بستر کی ٹی چادر لے آؤں، آج میں پردے دھو کے ٹانگوں، آج میں نئے برتنوں میں کھانا لگاؤں، آج میں ڈھنک سے پال سنواروں، کوئی صاف ستھرے نئے گلے سے کپڑے پہنوں گی۔ کچھ تو التفات ہو میری جانب بھی۔ میری ذات بھی توجہ چاہتی ہے۔ کوئی ایک جملہ حوصلہ افزا سا، میرے اندر امنگ جگا دے جنے کی۔ کیا میں زہر نگنے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ کیا میں نے اس شخص سے اس لیے شادی کی تھی کہ یہ اپنا اور ہر سا کر لے برف تو پھر جذبے کی حرارت سے پل

ہالی ہے۔ پھر سے میرا وجود ٹکرائے گا تو زندہ بھی مجھے ہی پہنچے گی۔ میرے معصوم جذبولں، چاہتوں اور احساس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

اس نے بچن سے فارغ ہوتے ہی نہادھو کے کپڑے بدلے کمرے کو از سر نو سنوارا۔ جھاڑا ہوا بستر لگایا ہی تھا کہ لائٹ چلی گئی۔ لوڈ شیڈنگ ہمارے جیسے مقروض ملک کے مقدر میں لکھی گئی ان مٹ خرچ ہے ہم اس لیے اندھیرے میں رہے جاتے ہیں کہ کہیں روشنی ہماری آنکھوں کو چندھیا نہ دے۔

”امی۔۔۔ کہاں کھوئی ہوئی ہیں؟ سٹیں! میں سیل فون کا کارڈ لے آؤں؟ کیا آپ کو بھی چاہیے؟“

”نہیں چندا! اچھے نہیں چاہیے۔۔۔ لیکن باپ کے گھر آنے کا وقت ہے، ایسے میں تم نیچے دکان پر نظر آؤ گے تو انہیں اچھا نہیں لگے گا۔ صبح لے لیتا۔“

”امی! صبح اسکول جانا ہے۔ مجھے تو ابھی دوستوں سے باتیں کرنی ہیں۔ ٹیسٹ کی تیاری کی کچھ پراہموز ہیں امی!“

”اظفر نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ علیشا نے اسے جانے دیا۔“

”نیکھو! میرا سیل فون احتیاط سے لے جاؤ۔ زینے پر بے پناہ اندھیرا ہے۔ نارنج روشنی کر لیتا۔“

”اچھا امی! لیکن آپ نے ابو سے اپنے کارڈ کاہی کہتا ہے ورنہ میں دو گھنٹے لیکچر سنوں گا کہ مجھے رات کے وقت کارڈ کیا کرنا ہے۔“

”ابھی سوچ لیں کچھ اور چاہیے تو۔“ اظفر نے جیکٹ پہنتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، کچھ اور نہیں چاہیے۔ آپ جلدی سے جاؤ اور لے آئیں جولا نا ہے۔“

”امی! آؤں کریم بھی۔۔۔ وہ کم سن بچوں کی طرح فرمائش کرتا تھا یا اسے پتا تھا کہ ماں کا دل نرم ہے وہ جھٹ سے سو سو روپے پڑا دے گی۔“

”صرف ایک چاک بار۔ کیا سمجھے؟“

”نہیں! میں لیٹر ایک لاؤں گا۔ مجھے دوسرے میں بھی چاہیے۔“

علیشا پھر سوچنے لگی۔ ”یہ آج کل کے بچوں کو کیا

ہو گیا ہے۔ ہر وقت تفریح ہر وقت تعیشات، ہر لمحے سہولتوں کی طلب، ہم ان کے بچے ہیں یا یہ ہمارے باپ ہیں، کچھ فرق کیوں نہیں رہ گیا۔ ہمارا بچپن کیسے قناعت پسندی سے گزرا۔ جوں باپ نے کھلایا، پستایا، اوڑھایا، خوشی سے کھاپی لیا۔ آج کل کے بچوں کے تو مطالبے ختم ہی نہیں ہوتے۔“

تھوڑی دیر بعد لائٹ آئی اور وہ کپڑے استری کرنے لگی۔ تیل بجی تو وہ چوکی۔ ”یہ لڑکا پھر چالی لے کر نہیں گیا۔“ اس نے دروازہ کھولا تو پتا چلا زین آئے ہیں۔ وہ اخلاقاً ”مسکرائی“ جواب نہیں ملا۔ اُدھی مسکراہٹ ہونٹوں میں قید کر کے وہ بولی۔

”کھانا کھائیں؟“

ایک پرانا گھاسا سوال نظر انداز کر کے وہ بولے۔

”نہیں! صرف چائے دے دو۔“

”صاحبزادے! نظر نہیں آئے نیچے؟“ اس نے چائے کپانی چولہ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”پھر عجب ہے۔ اب کیا ختم ہو گیا تھا گھر میں؟“ انہوں نے پڑے بدل لیے تو پوچھا تھا۔

”اس کے سیل فون میں میٹس ختم ہو گیا تھا۔ بہانہ بنایا آؤں کریم کا۔“

”اچھا میں سمجھا کہ پھر ہر ادھنیا، نمک یا شکر ختم ہو گئی ہوگی۔“ انہوں نے گلاس میں پانی اتدیا۔ اتنے میں اظفر گھر میں داخل ہوا۔

”کیوں صاحبزادے! بیٹوش ٹھیک چل رہی ہے آپ کی؟“ انہوں نے چائے کا پہلا گھونٹ بھرا۔

”جی! سر تو آ رہے ہیں مگر بس یہ سو سو ہی ہیں؟“ اس نے کارڈ اسکرین پر کرتے ہوئے کہا۔

”یہ سو سو کیا ہوتا ہے؟“ انہوں نے علیشا کی طرف دیکھ کر کہا۔

”یہ ان کی کوئی اسپیشل لغت ہے، جہاں سے اونگے ہوئے لفظ تخلیق ہوتے ہیں۔ استاد کی عزت نہ کرنے والا کبھی علم حاصل نہیں کر سکتا بد تمیز۔“ علیشا نے اپنے بیٹے کی طرف غصے سے دیکھا۔

”یہ لڑکا پتا نہیں کب محنت کرے گا۔ میں تو اس

سے باپس ہوں بھی۔“ زین نے اسے لاپرواہی سے ہیل فون پر پیغام رسائی کرتے دیکھ کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ بیڈ روم میں سونے کے لیے گئی تو زین نے کہا ”دراصل غلط وہ نہیں ہم ہو۔ تمہیں فرصت ہی نہیں کہ گھر اور نیچے کی فکر ہی کرلو۔ اسے کمپیوٹر، لپ ٹاپ اور سیل فون دیوں دے رکھے ہیں تم نے؟ اسی لیے دل نہیں لگتا اس کا پڑھائی میں؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر ہم دونوں گھر سے باہر ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے In touch رہنے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔“ علیشا نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا اور اپنے صوفہ کم بیڈ کو کھول کے لیٹ گئی۔

آنکھوں سے بہتے پانی کی شدت اور احساس کو محسوس کرنے کی فرصت شاید کسی کو نہیں تھی۔ رات کے کسی پہرہ تھک کر سو تو گئی مگر ایسا لگا جیسے تنہائی کا زہر رگ و پے میں اتر رہا ہو۔ لوگ اس کیفیت کو ڈپریشن کا نام دیتے ہیں لیکن وہ اعصابی طور پر کنزورنہ بننا چاہتی تھی۔ اظفر کو دو چار باتیں سن کر اس نے دل کا کر لیا تھا۔ صبح زین کو لایا اور جانا تھا۔ دفتر والوں کی گاڑی آٹھ بجے آجالی تھی۔ اظفر نے سات بجے ہی اسکول کی تیاری کر لی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وین آگئی۔ وہ بھاگ بھاگ اسے اور زین کو ناشتہ کروانا چاہتی تھی۔

”آپ سلاکس مکھن لیں گے یا مغنز کے ساتھ چائے؟“

”صرف چائے۔“ زین کی سادہ سی فرمائش تھی۔

”پاپا نے تو آج جہاز کی باسی ڈبل روٹی اور سوکھا سا جیم کھانا ہے مجھے دے دیں مغنز۔“ اظفر نے اس کے قریب آکر سرگوشی کی۔

”تم بھی لے لو۔“ علیشا نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔ وہ جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی اظفر نے مغنز کھانا شروع کیا اتنے میں زین کپڑے بدل کر آچکے تھے۔ وہ بھی چائے پی رہے تھے۔ ان کے بریف کیس میں سی ڈیز، بیڈ فون، اے لی ایم کارڈ،

دیر کا رڈ سب کچھ جو اسے یاد تھا وہ رکھ چکی تھی۔ ایک ہینڈ بیگ میں نائٹ سوٹ، ٹی شرٹ، ایک جینز اور موزے وغیرہ رکھ دیے تھے۔ وین آئی اُدھر زین کی گاڑی بھی آگئی۔ دونوں نے ساتھ ساتھ ہی گھر چھوڑ دیا۔

بہت دیر تک وہ گیلری میں کھڑی باپ بیٹے کو جاتے دیکھتی رہی۔ پھر واپس آگئی۔ ابھی ڈانگنگ ٹیبل سمیٹنے، اظفر کے لیے دوسرے کھانے کا انتظام اور خود دفتر جانے کے لیے لباس کی تیاری اور شام کے کھانے کے ساتھ ساتھ ماسی سے گھر کی صفائی کرانے تک ایک نہیں، کئی کام تھے جو کرنا باقی تھے۔ ایسا لگا جیسے گھوڑے کو چابک ماری جائے تو وہ سرپٹ دوڑنے لگتا ہے۔ اپنے مالک کا ہر علم بجالانے کی تیک و دو میں لگ جاتا ہے۔ غریب سرپٹ دوڑ ہی سکتا ہے ناں!

اس کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس نے ملتان میٹھی کا چرے اور گردن پر لپ کیا۔ بستر کی چادریں تبدیل کیں، ڈانگنگ ٹیبل کو تورا بدلا، کٹن جھاڑے، ڈسٹنگ کی اور گھر کو سجا ہوا اظفر کے بچ کا انتظام کیا۔ میٹھی سوکھی تو چہرہ دھو کے کپڑے بدلے۔ لٹچ بکس اور اپنے بریف کیس کو کھائے گھر سے نکل گئی۔

ہر روز کی یہ روٹین تھی اور گھر سے جڑے ہوئے محبت کے اس رشتے میں کس قدر مٹھاس اور اپنائیت تھی۔ ان نظروں کے ساتھ چلتے ہوئے وہ اندر سے گنگنائے لگتی تھی۔ غرت کو دھونے کے لیے گھروں سے نکلنے والی محنت کش عورتوں کے چروں پر جھکتے ہوئے پسینے کو کچھ کر وہ مسکرائی تھی۔

راستے بھر وہ کوچ کی دھکم پیل اور گرمی کو برداشت کر لیتی، یہ سوچ کر کہ اس کی محنت کی کسی کو ضرورت ہے۔ اس کے اپنے گھر کی دیواریوں پر جی غرت کی گرو جھاڑنے کے لیے اس کی ٹیبل کی اس کی ضرورت ہے آنکھیں دھوئیں سے سسکتی بھی نہیں پانی چھلکتا بھی تھا تب بھی وہ اجالے تلاشنے کی خواہش میں اپنی بیٹائی کو بجا کے رکھتی تھی۔ نشوونما کا سارالے کر آنکھوں کو گرد سے بچاتی جاتی۔ دل میں دھڑکنیں

رسم نہ بھی کرتیں تب بھی زین کا کوئی والہانہ پن اظہار کیا اور ان تینوں کے درمیان محبت اعتبار اور یقین کا رابطہ اسے ٹھکنے نہ دیتا تھا۔

ریشی پوشاک، نائی اس بوتیک پر وہ ڈیرا ٹنگ سے لے کر ماینگ تک سب ہی کچھ دیکھتی تھی۔ جب خوشبوؤں میں مہکی ہوئی کوئی دوشیزہ لباس خریدنے آئی تو اس کی آنکھوں میں دیے جلتے دیکھ کر اسے اپنی ساری مہکل اتارتی نظر آتی۔ یہ حوصلہ ہوتا ہے جو ایک نظر سے دوسری میں منتقل ہوتا ہے۔ خاموش نگاہوں میں گیت گاتے ہوئے وجود۔ آئینوں کے سامنے لہرا کر وہ جب اپنی فٹنگز دیکھتیں تو وہ ناز و دم ہو جاتی تھی۔

منہ مانگے داموں پر بکنے والے ان ملبوسات کو دیکھتے ہی علیشا کے جسم میں توانائی کی جولاہا تھی وہ گھر جا کر اسے روٹ بنائے رکھتی۔ گھر جیتے ہی اس کا استقبال گھر کی بے ترتیبی ہی کیا کرتی تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنی طاقت کو ذخیرہ کر کے کام کرتی رہتی تاکہ زین کے آنے سے پہلے کھانا تیار ہو جائے۔ زین کے آنے جانے کا کوئی ایک وقت مقرر نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ سرشام آجاتے اور وہ دن ہو تا دہری شامت کا۔

”میں کب سے چائے کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ بیگم صاحبہ ہیں کہ آگے ہی نہیں دیتیں۔“ وہ شکوہ بھی پیار سے کرتے لیکن سمجھ میں نہ آتا کہ کتنا حصہ پیار ہے اور کتنا حصہ برہمی کا۔

”ابھی بنائے دیتی ہوں۔“ وہ اپنا بیگ رکھ کر فوراً کچن میں چلی جاتی۔ اس برہمی کا بھی اپنا ہی مزاج تھا۔ وہ بھی چائے کا ایک کھونٹ بھر خود کو اطمینان دلاتی۔

”دیکھو! تمہیں کتنی فریڈم دی ہوئی ہے۔ اپنی مرضی سے کام کر رہی ہو اور آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ بچہ اکلارہتا ہے اس کے پاس کون آتا ہے کون جاتا ہے؟ یہ کیسے کھانا پیتا ہے، تمہیں اس کی کوئی فکر نہیں۔“ کھانے میں صرف سات منٹ کی دیر ہوئی تو ازادات کی بھرمار شروع ہو گئی۔

”میرا خیال ہے انسان دن بھر کام کرنے کے بعد گھر

لوٹ کر چند لمحے پر سکون رہ کر کچھ کام کرنا یا کچھ سوچنا چاہتا ہے۔“

”تم نے کیا سوچنا ہے۔ تم جیسی عورت کو صرف اپنے بار سنگھار اور کھانے کی فکر ہوتی ہے۔“

ہر چیز جو ممکن ہو مہیا کر کے جاتی ہوں۔ گھر میں کوئی آتا جاتا نہیں ہے۔ آپ کا بچہ یا تو کمپیوٹر پر ہوتا ہے یا سیل فون کے میسج پر یا پھر کتابوں کی دنیا میں۔ ہر آدھے پونے گھنٹے بعد میں فون کر رہی ہوتی ہوں۔ پڑوسیوں سے آنے جانے پر نظر رکھنے کے لیے کہا ہوا ہے۔ آپ کیوں اتنے چرچا یا ہو رہے ہیں؟“

علیشا نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا تو زین اسے کھلی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔



وہ لاہور میں تھے اور وہاں پہنچنے کے اظہار کو میسج آ چکا تھا کہ ”میں خیریت سے ہوں اپنا اور ماں کا خیال رکھنا۔“ اسی امرت کو قطرہ قطرہ اپنے وجود میں اتارتے ہوئے وہ گھر کے چھوٹے بڑے کام بناتی رہی۔ اسے ایک رات اور ایک پورا دن تیار نہ تھا۔

”چلو! الماریاں صاف کرتی ہوں۔“ اس نے ایک ایک کر کے صفائی کا کام شروع کیا۔ چند بڑے سائز کے شاپر ز سائے رکھ کر وہ غیر ضروری چیزوں کو علیحدہ کرنے لگی۔ زین شلوار قمیص کبھی کبھار ہی پہنتے تھے مگر اکٹھے آٹھ سوٹ دیکھ کر وہ سوچنے لگی کہ کون سا رکھے اور کون سا باسی کو دے دے۔ ہر اچھی بیوی کی طرح اس نے ہر قمیص کی جیب بھی ٹٹولی کیونکہ چھ مہینے پہلے ایسی ہی ایک قمیص دھوئے وقت سو روپے کا نوٹ چھي دخل گیا تھا مگر شکر تھا کہ پہنا نہیں تھا۔ آج کوئی نوٹ نہیں ملا مگر ایک سیل فون مل گیا۔

”یہ کس کا ہے۔“ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی مگر خود کو علم ہوتا تو وہ سوال ہی کیوں کرتی۔

”ظفر کا تو ہو نہیں سکتا کیونکہ اس کے پاس تو کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہتی تھی۔ ایک سستا موبائل اسے دے رکھا تھا اور زین کے نزدیک اظہار کی تمام تر

امور اور بد تمیزیوں کا سبب ہی موبائل فون تھا۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر ایک طرف رکھ باقی کام نبھانے لگی۔

رات گئے فراغت ہوئی تو وہ سیل فون کی طرف متوجہ ہوئی۔ بہت مہنگا اور شاندار قسم کا موبائل تھا۔ بالکل ویسا جیسا اخبار کے رنگین اشتہار میں چھپا تھا اور لیوی کے ہر چینل پر اس کا اشتہار چلتا تھا۔ شاید کسی کو دینے کے لیے خرید آیا ہو یا کسی نے تحفہ دیا ہو گا۔

”کھول کے دیکھیں، کیسے چلتا ہے۔“ وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی جیسے وہ کوئی کھلونا ہی نہ ہو۔ موبائل فون میں اس کو دلچسپی اور حرا دھڑ آنے جانے والے میسج سے ہوتی تھی وہ اسی طرف راغب ہوئی اور اب ایک ایک کر کے آنکھوں سے پردے ہٹنے لگے تھے۔ ایک اداکارہ نے زین سے برلا اظہار پیش کیا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ ”ایسی ہی ہوتی ہیں یہ نئی نئی اداکارائیں۔“

ایک نو آموز ڈرامہ نگار نے انہیں اپنا ایڈیٹل مان کر اپنے لیے کامیابی کی دعا کی استدعا کی تھی۔ ”ویل ڈن زین صاحب! وہ مسکرا دی۔“

ایک صحافی نے اپنے سنجیدہ کالم کا عنوان تجویز کرنے کی فراش کی تھی۔ اس نے انہیں اپنا استاد مانا تھا۔ علیشا کو زین پر فخر ہوا۔ آٹھ دس ایسے خیالات گزر گئے تو وہ سوچنے لگی کہ اب سیل فون بند کر کے واپس رکھ دے کہ ایک مشترکہ دوست حبا کے خیالات بھی آنے لگے۔ یہ کیا لکھا تھا۔

”میں نہ جانے کب سے آپ کے جواب کی منتظر ہوں۔ آپ نے علیشا کے بچن میں جانے کے بعد میری تعریف کی تو مجھے بہت اچھا لگا۔ میں رات بھر نہ سو سکی۔ سوچتی رہی کہ کاش علیشا کی جگہ میں آپ کے ہمراہ رہتی۔ آپ کی خدمت کرنی جی جان سے، اپنا سب کچھ مان کے۔“

”جائے۔ کیا یہی اپنی حیا بائیں کے دماغ میں کیسے جھکڑ جاتے۔“ ہوا بھی گرم تھی اور بدن میں چنگاریاں بھی

جھباؤ اکثر گھر میں آتی تھی۔ کبھی زین سے صلح مشورے کرنے تو کبھی اس کے ساتھ دوستی نبھانے۔ کتنے ہی راز دنوں نے شیئر کیے تھے۔ وہ اپنے والدین کے کچھ فیصلوں سے نالاں رہتی تھی۔

”میں آپ کی بھلائی چاہتی ہوں۔ علیشا تو آپ کی شہرت سے جلتی ہے جب ہی تو خود کو کیہر دو من بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہی۔ ہر وقت فیشن ڈیزائنرز کے ہاں آتی جاتی ہے۔ کتنے غور سے ونیزہ احمد، نبیلہ، امین بے اور منامشا ق سے ہونے والی ملاقاتوں کا تذکرہ کرتی ہے۔ کتنے آرٹسٹوں کے ساتھ تصاویر کھینچواتی ہے اور فیشن کے رسالوں میں اسے شائع کرائی ہے۔ کتنے ادیبوں اور شعرا کو گھر بلا کر ضیافتوں کے بہانے اپنے تعلقات استوار کر رہی ہے اور آپ گھر پر بہت ہی بھولے، اس کی دیکھاؤں میں آگئے ہیں۔ آپ اس کی عادت سے واقف نہیں وہ آپ کو اور مجھے بھی کئی مرتبہ نیچا دکھانے کی کوشش کرتی ہے۔“

وہ کچھ آگے بڑھی تو ایک میسج میں زین کہہ رہے تھے۔ ”ص میں ص چھوڑنا تو میں اسے کئی برسوں سے چاہتا ہوں مگر اظہار کا خیال آتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے جوان بیٹا۔“ آگے کی سطور شاید delete ہو گئی تھیں۔

”آپ کو کوئی فیصلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ امی ابو کب سے انتظار میں ہیں۔ کسی ایسے ویسے سے شادی نہیں کرنے والی۔ میں تو آپ کی لونڈی باندی ہوں اور بس!“

انتا پڑھ کر علیشا کا دماغ چکرانے لگا۔ کیا وہی جیا ہے جو اپنے دفتر کی کونیز کے عشق کی کامیابی سنایا کرتی تھی۔ کبھی اسے فرحان ویلنٹائن ڈے پر سرخ پھول بھیجتے تو کبھی کوئی کراچی کی مہنگی ترین بوتیک سے خریداری کی آفر کرتا۔ زین سے اس کے اس نوعیت کے تعلقات؟ شمالی رنگت اور لانا قدر رکھنے والی اس دلی پتلی سی لڑکی کے اس نئے روپ کو سنا کچھ آسان بات نہیں تھی۔ وہ زین سے

کیا چاہتی تھی۔ ٹیلی ویژن کی ابھرتی ہوئی پروڈیو سر تھی، اسکرپٹ رائٹرز اور دیگر چینلوں پر ایک نہیں، ہزاروں پروڈیو سر اور تکنیکی عملہ اس سے واقف تھا۔ ایک میڈیا پرس کے طور پر اس کا پزیرا کیونٹی میں بھی اٹھنا بیٹھا تھا اور وہ آداب محفل جاننے والی لڑکی تھی۔ اگر چاہیں گے سن کو بھی پہنچ رہی تھی تب بھی اس کا ساتھ نبھانے والوں کی ایک طویل فہرست موجود تھی پھر وہ کیسے ایک شادی شدہ مرد کے گھر کو ڈسٹرپ کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ اب اسے یاد آ رہا تھا کہ ہر تہوار پر ایک آدھ دن کے لیے وہ ان کے گھر میں موجود ہوتی۔ ہنگے ہنگے تھے رونا دلانا، سالگرہ وغیرہ پر باہر کھانے کے لیے آنا جانا، انظر سے چپٹنگ کرنا، زین سے گھنٹوں حالات حاضرہ پر بات چیت کرنا، کبھی کسی سیاستدان سے انٹرویو کرنے کے لیے مختلف زاویوں سے سوالات کرنا یہ سب عام معمول کی باتیں تھیں۔ کبھی شائبہ تک نہ پڑا کہ وہ ایسا کیلے زین بھی اس کے ساتھ مل کر اسے دھوکا دے رہے تھے۔

اب اسے رفتہ رفتہ یاد آ رہا تھا کہ وہ کیوں کبھی اس کے تھکے ہوئے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی اسے گھورنے لگتے اور کبھی جب وہ ہلکے ہلکے زور اور میک اپ کر کے ان کے ہمراہ باہر جانے کے لیے تیار ہوتی تو وہ زہر آلود لہجے میں کہتے تھے۔

”اوس ہوں تم پر کچھ بھی چتا نہیں۔“

وہ کیسی بے وقوف تھی، کتنی تھی۔

”ہاں ایس نے عرصے سے نہ فیشل کیا ہے نہ ہیل پچ ہی کیا ہے اور یہ فنکشن بھی تو اچانک نکل آیا۔“

آج سے دس بیس برس پہلے زین کسی اداکارہ، ماڈل یا پروڈیو سر سے شادی کر لیتے تو بات سمجھ میں آتی تھی مگر اب... برہانے کی دہلیز پر ایسا کوئی اقدام کیا معنی رکھتا تھا۔ اپنی بے عزتی اور ذلت کا احساس ستائے جا رہا تھا۔ وہ ٹھٹھکا چاہتی تھی تاکہ کوئی حقیقی فیصلہ کر لے۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ کیوں ہر یار میکے سے واپسی پر زین کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ کیوں اس نے اس وقت مسئلہ کی ٹوہ نہ لی۔ وہ تو یہی سمجھتی رہی کہ مالی تنگ

دستی کی وجہ سے گھر میں سکون برپا ہو رہا ہے۔ جب ہی تو اس نے بونیک پر ملازمت کی تھی لیکن وہ نہیں سمجھ پائی کہ کام کرنے کے بعد بھی گھر میں سکون اور خوشی کیوں نہ آسکی۔ زین کیا اس وقت سچ بول رہے تھے کہ میں الیکٹرانک میڈیا میں رہ کر بھی دیگر لوگوں کی طرح کا لائف اسٹائل نہیں رکھتا کیونکہ یہ سراسر عیاشی ہے۔ لیکن اس سیل فون میں آنے اور جانے والے میسجنگی رازوں سے پرہ اٹھا رہے تھے۔ زین نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ حمہ کے ساتھ مطمئن اور خوش باش ازدواجی زندگی گزار سکیں، لیکن انہیں اظفر کا خیال ستارہا تھا جبکہ جانے باور کرایا تھا کہ وہ اس بچے کو گھر سے نکالے گی نہیں مگر یہ اس کی مرضی پر چھوڑا جائے کہ وہ کس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے اپنی ماں کے ساتھ یا اپنے والد کی بیوی کے ساتھ؟

صبح ہوتے ہی علیشا نے حمہ کے سیل پر کال ملائی۔

فون بند جا رہا تھا۔ پھر اپنی حماقت پر غصہ آ گیا۔

”یہ کیا کیا ہیں؟“ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے وہ کہاں جا گئی ہے۔ چلو مسئلہ کال دیکھ کر کال بیک تو شاید یہی

لے۔ میں نارمل رہوں گی۔ ابھی اس پر کچھ بھی واضح نہ کروں گی؟ میں زین کو بھلا نہیں سکوں گی۔ کم از کم اتنی جلدی... وہ بیمار رہنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر نے کان اور

ناک کے انفکشن کا واحد حل سرجری بتائی ہے۔ مجھے

اس موقع پر انہیں تباہ چھوڑ کے نہیں جانا چاہیے۔

عقل کی تھنی منی سی چیز دانش کے ایک باب کو

کھولے سبق پر بھانے لگی۔ ”انہوں نے کون سا

تمہارا خیال کیا۔ تم سے محبت کے دعوے کیے، ساری

زندگی ساتھ نبھانے کے وعدے کیے مگر کیا انہوں نے

ان کی پاسداری کی؟“

اندر چھڑی ہوئی جنگ کو جیتنا بہت کٹھن ہونے لگا۔

اس گھر کو بنانے سنوارنے کے جتن کرنے والی ہینڈ

کی آغوش میں ایک دیا جلا کر خوابوں سے بشارت لینے

والی علیشا بری طرح نڈھال ہو گئی تھی۔ ایسا ہی ہوتا

ہے بے بسی اور ذلت موت سے پہلے مار دیا کرتی ہے۔

نئے صوفے کا آؤر منسوخ کر کے، نئے برتنوں کی

فرست پھاڑ کے، گھر کے سووے سلف کی فہرست بھی

لہ پرزہ کر کے وہ خوب روٹی مگر اس کے ہاتھ میں دیا

فل فون ایک بار پھر جاگا۔ حمہ کا۔ آیا تھا۔

”جان جی، علیشا کا فون ساڑھے آٹھ بجے آیا تھا۔

سوچا آپ کو بتا دوں اب میں کل بیک کروں یا نہیں؟

کیا بات کرنی ہے اس سے؟ کبھی کیا نہیں اتنی صبح

میری فلاٹ سینسل ہو گئی ہے۔ آج لاہور نہیں پہنچ

اول کی۔ آئندہ پروگرام کے لیے فوراً رابطہ کریں،“

کے روانہ ہو گئی۔

اب اس کے ایک اور سوال کا جواب مل گیا تھا۔

راستے میں اظفر کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

”بٹا! بابا! لاہور میں کچھ زیادہ مصروفیت ہو گئی ہے،

اس لیے ہم دو روز کے لیے ٹالی جان کے ہاں ہو آئے

ہیں۔ میں وہیں سے اسکول لے جاؤں گی۔ بابا کو کچھ

وقت چاہیے، اپنے لیے اور مجھے بھی آپ کے لیے کچھ

وقت چاہیے، اس لیے ہمارا الگ الگ رہنا ضروری

ہے۔“

پتا نہیں اظفر کو یہ فلسفہ سمجھ میں آیا یا نہیں، مگر وہ

اس خیال سے خوش تھا کہ اس کے ماموں کے پاس

ایپ ٹاپ ہے۔ دو گاڑیاں، ہر کمرے میں ایسے سی

کشاہ اور وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ان اور زندگی کی ہر

سولت مہیا ہوگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ابتدا میں تو

بچے انہی ساروں سے بہل جاتے ہیں مگر عمر کے ساتھ

ساتھ شخصیت میں رہ جانے والے خلا کو مادی

سوایات کیسے پُر کر سکتی ہیں؟

چند دن بعد زین سمجھ گئے کہ علیشا نے سیل فون

سے نفرت کا اسرار منکشف کر لیا ہے، اسی لیے وہ گھر

بھڑو گئی ہے۔



کلی برس بیت گئے ہیں۔ علیشا اب بھی کام کر رہی

اظفر کلج جانے لگا ہے۔ زین اسے پکار پکار کے

تھک سے گئے ہیں مگر علیشا اپنی جنگ کو زیادہ شدید

سمجھتی ہے۔ چراغوں کو ہوا کے رخ پر رکھ کر جلا رہے

کی ضد کر رہی ہے۔

وہ کہتی ہے اس کا اعتبار یقین اور بھروسہ، بسھی کچھ

ہوا برد ہو گیا ہے۔ وہ نفس کی ہوسنا کیوں، ذہنی بیماریوں

اور مکاریوں کو پرہنہ آنکھوں سے دیکھ چکی ہے۔ اعتبار

کا موسم کھو جائے تو انسانوں سے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

اب وہ ایک رولٹ ہے جس میں جذبات نہیں

ہوتے۔ جب تک موت اسے پرواز کا روانہ نہ دے گی،

وہ اسی طرح زندگی کے چھوٹے بڑے کام کرتی رہے گی۔

جانبے زین سے شادی نہیں کی۔ وہ دراصل کیا

چاہتی تھی اس کا اور زین کا رشتہ صرف ضرورت کا تھا

یا عشق کا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا جبکہ زین نے کہا ہے

کہ وہ اتھار کس چاہتے تھے؟

علیشا سوچتی ہے کہ زندگی کے نصاب میں دکھ کو

اختیاری مضمون کیوں بنایا جائے؟

آخر دنیا کو یہ اختیار بھی کیوں دیا جائے کہ کوئی اٹھے

اور ہمیں کم فکرمندی دھند میں جب چاہے گم کر دے۔

علیشا چاہا اور مومہ کے پھندے کی گرہ میں ابھی ضرور

ہے مگر تھکی اور مری نہیں ہے یہ بتانے کے لیے وہ

آج بھی، بستر کل کے لیے جنگ کر رہی ہے۔ یہی جیت

کا خواب اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ سمجھ گئی ہے کہ

”زندگی کوئی افسانہ نہیں ہوتی مگر کبھی کبھی کوئی

افسانوی کردار زندگی کو ردیدر بھی کر سکتا ہے، خوابوں کو

روند سکتا ہے۔ یوں زندگی افسانہ بن بھی سکتی ہے۔“



دکڑی کی

ہے، جیسے ہر رات، کامران کے چہرے کے تاثرات چھپا لیتی ہے جب وہ اپنے گھر سے نکلتا ہے اور تیسرے گھر کی دالین پر قدم رکھتا ہے۔
زہرہ اس کے قدم گن سکتی تھی۔ اب وہ لاؤنج سے ہوتا ہوا میڑھیوں سے اوپر جا رہا ہو گا۔ میڑھیوں کے ساتھ والے بچوں کے کمرے کو وہ باہر سے لاک کر دے گا اور پھر۔
آہٹیں، آوازیں بن جائیں گی اور نگاہیں، سرگوشیاں۔

زہرہ بیڑ پر چٹ لیٹی اندھیرے میں گھور رہی تھی۔ اب وہ فجر کے وقت ہی آئے گا۔ یہاں شے کے بعد۔
”تایا! ابو! آپ کب آئے؟“ ہائل شامل، تایا! ابو کو صوفے پر آڑا ترچھا دیکھ کر جھٹکنے لگیں گے۔ ”ہما! تایا! ابو سے کہیں ٹالنا شے ہمارے ساتھ کر کے جائیں۔“
اور وہ اپنے کیلے بال لیے ایسے اٹھائے گی جیسے وہ مورنی ہو اور اس کے پروں میں ایک اور پر کا اضافہ ہو گیا ہو۔ پکن کے دروازے کے پاس رکھے اپنے ”را“ طوطے کو وہ بلا وجہ بار بار ہلانے کی۔
زہرہ نے اپنی پھلکی آنکھوں کو تختی سے بند کیا اور آستینیں اوپر کرتی واٹس روم میں چلی آئی۔ ڈنگ گاتے قدموں سے وہ بہ مشکل کھڑی ہو پائی اور پھر پلٹ کر لاٹ آن کی۔ وہ اندھیرے میں وضو کر سکتی تھی لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی لاٹش وہ خود کو دیکھتا چاہتی تھی۔ اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں کو وہ جتنا پھیلا سکتی تھی، اس نے پھیلا کر ان میں جیسے سیلاب کو دیکھا۔ وہ خود کو

اس نے اپنے قریب سر سر ہٹ سنی، بے آواز، آواز سنی، یہ وہی آواز تھی جو واقع ہونے سے پہلے دل کی نیت پر سن لی جاتی ہے، جو صرف زہرہ سن سکتی تھی یہ آواز اسے گہری نیند سے بھی جگانا کرتی تھی، یہ سن سن کی آواز تھی جو شیطان، تنہو ڈسے کی طرح ہر سائے چلا جاتا ہے۔

سن سن۔ اٹھو۔ سن سن۔ دیکھو میدان صاف ہے، پیش قدمی کرو۔ شیطان بوزن، دن میں ہزاروں لطف جگا کر ترغیب کا راستہ صاف کرتا ہے۔ جو ایسی آگ جلاتا ہے جسے سمندر بھی ٹھنڈا نہیں کر سکتے۔
زہرہ نے کامران کے دل کی یہی ”سن سن“ سن لی تھی۔ وہ لمحے گنتے لگی۔ اسے معلوم تھا، وہ ابھی اٹھے گا اور وہ پھر ایسے ہی اٹھا جیسے اٹھتا آیا تھا۔ نڈر، لیکن ڈرا ہوا۔ بے خوف۔ لیکن سما ہوا۔

اس کے قریب سے گزر کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ زہرہ پہلو کے بل ویسی ہی لیٹی رہی جیسے وہ پہلے لیٹی تھی اور اسے سوتا سمجھ کر کامران آرام سے اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ اسے اس کے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے بھی جان سکتی تھی کہ کامران ایک بار ضرور پیچھے پلٹ کر دیکھے گا۔ اس کی چال بے آواز ہوئی۔ اپنے پیچھے وہ گھر کا مین گیٹ باہر سے لاک کرے گا اور پھر ایک گھر چھوڑ کر تیسرے گھر کے مین گیٹ کو اندر سے۔ اس کے پاس دونوں گھروں کی چابیاں ہیں۔ وہ دونوں گھروں کا کھولا ہے۔ رات کی ایک خونی ہے کہ یہ بے شمار عیب چھپا لیتی

آئینے میں دیکھ کر خود پر ترس کھانا چاہتی تھی شاید۔
اپنے چہرے پر بی بار بار ہاتھ پھیرنے کے بعد اس نے الٹی
ہتھیالوں سے آنسو صاف کیے اور ایک بار پھر خود کو
آئینے میں گھورنے لگی۔
وہ قیام میں تھی۔ رکوہ میں تھی۔ سجدے میں تھی،
لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ ہر یاری طرح اس بار بھی اس
کی نظروں میں وہی چہرے تھے۔



اکثر وہ اپنے طوطے کو لیے آجاتی، انداز وہی جیسے
کوئی سادوں کی پہلی پھوار میں بیگنا آٹھلایا اور بل کھایا
چلا جاتا ہے۔
”بھائی! میرے طوطے کو آج کے لیے رکھ لیں، مگر
خیال رکھیے گا، بلی کی تو آہٹ سے بھی سسم جاتا ہے۔
چھپیں کرنا بھول جاتا ہے۔ خوف سے آنکھیں دنوں
نہیں کھلتیں، الوں کی طرح شکل لنگ جاتی ہے۔
آپ کے گھر تو بلایاں بھی بہت آتی ہیں۔ ہر ایک کو تو
دودھ دلانے بیٹھ جاتی ہیں۔“

”لوگ تو بانی کا خون پی جاتے ہیں۔ یہ اف نہیں
کرتیں۔“ وائپر لگاتے لگاتے بھی رضیہ جواب دینے
سے نہ چوکی۔

زہرہ بدستور پودوں کو پانی دیتی رہی، پانی مگلوں سے
بھر کر باہر نکل رہا تھا۔ پر وہ پھر بھی دیے جا رہی تھی۔
نساء کی آواز سن کر وہ ایسے ہی بے ربط ہو جاتی تھی۔
آگے پیچھے دائیں بائیں بکھر جانے کے لیے تیار۔
”میں بھائی صاحبہ دیکھوں تیار ہونے کہ نہیں۔
اکثر دیر کرتے ہیں تیار ہونے میں۔“ وہ اپنی جھک کار جیسی
آوازیں بولتی ہوئی اندر چلی گئی۔

دور تک رضیہ نے اس کی پشت کو دیکھا۔ پودوں کو
پانی دے کر زہرہ نے بیچ پکڑ لی۔

”باجی! نماز سن، وظیفہ ہی کرتی رہیں گی یا زبان سے
بھی کچھ بولیں گی؟ زیادہ نہیں تو زائد بھائی کو ہی فون
کر کے کہہ دیں کہ اس بلا کو واپس بلا لیں۔ اچھی بھلی
تھی وہاں میاں کے پاس نہ جانے کیوں بھیج دیا یہاں۔“

میاں کا بھی نہ معلوم کتنا ناک میں دم کر رکھا ہوگا۔ کیا
کیا نہ دیکھا ہوگا انہوں نے کیا کیا نہ چھاتے ہوں
گے۔ اب دیکھ لیں بھائی صاحب کو پوچھنے گئی ہیں یا
انہیں تیار ہی کرنے بیٹھ گئی ہیں۔ پانچ وقت اذان کو بجتی
ہے، پُر کیا جمال جو ان کے دلوں کا شیطان بھاگ
جائے۔“

زہرہ تخت پر بیٹھی بیچ بڑھ رہی تھی۔ وہ بیچ کے
دانے نہیں، وقت کے لمحے گن رہی تھی۔ وہ ایک
ایک لمحے کے لیے مبر کر رہی تھی۔ کتنی دیر ہو گئی تھی
نساء کو اندر گئے۔

آج اسے اپنے میکے کے کسی فنکشن میں جانا تھا،
اسی لیے وہ پہلے بھائی صاحب کو تیار کروانے آئی تھی۔
وہ انہیں کپڑے، جوئے اور وقت بتا کر جلدی آنے کا
کہے گی۔ پھر وہ الماری کھولے بھائی صاحب سے ان کی
پسند کا لباس پوچھے گی۔ بھائی صاحب اس کی نظروں
کے زاویوں کو پڑھتے ہوئے کپڑوں کو دھو دھو کر اس
کے باہر نکال کر جانچیں گے، لگا کر دیکھیں گے۔ پھر

بھائی صاحب اسے لے کر جائیں گے۔ رات دیر
ہو جانے کی وجہ سے انہیں مجبوراً ”وہیں سونا پڑے گا۔“
پھر صبح بچے انہیں لاؤنج میں دیکھیں گے اور چلا جاتا
کرنا یا ابو، نانا ابو کہتے ہوئے ان کے اوپر نیچے لوٹ
پوٹ ہونے لگیں گے۔

زہرہ وہیں تخت پر بیٹھی پھسکی سی بڑھی۔ اسے اپنی
کمر پر چھین ہونے لگی۔ کمر پر اس کے لمبے بالوں کی
اجڑی ہوئی چوٹی تھی، جنہیں پہلے پہل وہ سہلا سہلا کر
بانہا کرتی تھی۔ گھٹنوں مساج کیا کرتی تھی۔ لمبی چوٹی
کو کمر پر لہراتے ہوئے اسے ہر بار یہ احساس ہوتا کہ ان
بالوں سے کسی کو کتنی چاہت ہے، دوپٹے پہلے پہل تو
گردن کے نیچے تک ہی پھیلا رہتا، پھر وہ مستقل سر پر
ٹھہر گیا۔ کیونکہ اس کے لمبے بالوں نے لہرانا چھوڑ دیا
تھا۔ ایسے ہی جیسے اس کے گھر کے بیوں پودوں نے۔
ان میں سے تو خوشبو آتا بھی بند ہو گئی تھی۔ وہ جو کمرے
کی کھڑکی سے پودوں کی پھولوں کی آیا کرتی تھی۔

ہر سو گھر میں پھیلی رہتی تھی۔ وہ خوشبو آتا بند
اگلی۔ اسے کوئی اور ہی خوشبو آنے لگی تھی اب۔
کتے ہیں گناہ کی بھی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ یہ وجہ
میں دیتی۔

پتا دیتی ہے۔ جیسے سر ہوا مردہ گوشت۔
زہرہ کی روح اس بو کو سونگھ کر جھپٹنے لگی تھی۔ وہ
اپنے انتلائے حال میں بھاگی پھرتی تھی، کبھی حاجت
کے لیے اور کبھی توبہ کے لیے۔



گھر کے ساتھ والا پلاٹ کسی اود کا تھا لیکن اس کے
ساتھ والا پلاٹ کامران نے زائد کو اس کے کہنے پر لے
دیا۔ تین سال پہلے۔ ”نساء“ یہاں آئی تھی کامل اور
شامل کے ساتھ، ”بھائی صاحب، بھائی صاحب“
کرتی۔ گھر کے بڑے دروازے سے لے کر اپنے
کمرے تک وہ بالوں کی لٹوں کو جھٹاتی بھائی صاحب کو
بتاتی جاتی کہ اسے کس جگہ کیا چاہیے، کہاں الماری
بنے گی، کہاں صوفہ رکھنا ہے، کہاں اسے قالین
چاہیے اور کہاں دروازے۔

عورتوں کے کیا ڈھب ہوتے ہیں، زہرہ نہیں جانتی
تھی۔ وہ ایک عورت کو جانتی تھی، جو کامران کی بیوی
اور ایک بیٹا اور بیٹی کی ماں ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا
کہ عورت نساء جیسی بھی ہوتی ہے۔ وہ تو جانتی تھی کہ
زہرہ کامران کی بیوی اور نساء ”زائد کی بیوی“ تو نساء
اور کامران کون۔ وہ جانتی تھی۔ یا شاید نہیں۔

”بہت چاہ، بہت لگاؤ ہے آپ دونوں میں۔ ایسے
لگتا ہے، ابھی بیاہ کر لائے ہیں زائد بھائی آپ کو۔“
نساء کے آنے کے سال بھر بعد وہ ہفتوں کے لیے
زائد آیا تھا اور رضیہ ان دونوں کے لگاؤ پر حیران ہوا کرتی
تھی۔

”زہرہ باجی! یہ عورت آپ کے وارے کی نہیں۔
یاد رکھیے گا! آسمان سے مارے مرد ایسی ہی عورتوں
کے لیے توڑ لانے کو تیار رہتے ہیں۔ یہ سب کو خوش

رکھنا جانتی ہیں دو لفظ نہیں سنیں گے زائد بھائی اس
کے خلاف۔ آنکھوں میں دیکھ لیا تو یہ کچھ نہ کچھ عجوبہ
ہی بنادے گی، پکڑ نہیں دے گی اپنی۔“
زہرہ کو لگتا تھا اس کا دم گھٹ جائے گا۔ وہ پکن میں،
کمروں میں، اندر باہر ان کی سرگوشیاں سنتی اور پھر بھی
اسے لگتا اسے وہاں نے گھیر لیا ہے، بات وہ نہیں۔
آنکھوں دیکھایا کالوں سا شک ہے، وہم یا پھر یقین۔
اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، وہ کس کدوٹ یقین
کرے۔

”میں آتا ہوں۔ تم گھبراؤ نہیں۔“
راتوں کو اکثر نساء کے فون آتے۔ زائد کے رہنے
تک کچھ سکون تھا لیکن پھر۔
”کہہ رہی ہے، ڈر لگ رہا ہے۔ شاید گھر میں کوئی
آیا ہے۔ دوبار پھلانگنے کی آواز سنی ہے۔ تم سو جانا
آرام سے، دیکھ بھال کمر میں لاؤنج میں سو جاؤں گا۔“ یہ
شروع شروع کے خوف تھے۔ پہلے پہل نساء کے
خوف سے زہرہ بھی ڈر جاتی۔ زائد فون کرتا، شرمندہ
ہوتا۔
”بھائی! بھائی جان سے کہیں ایک بار دیکھ آئیں۔“

نساء کے گناہ ہے۔ آپ کے پاس آجائے اگر زیادہ ڈر لگ رہا ہے تو لیکن سنی ہی نہیں ہے۔
زہرہ فوراً "کامران کو اٹھا کر بھیجتی خود فون کرتی تلی دیتی۔ اکیلے ڈرتی ہے تو سچے باہر والوں کے لیے پاکستان میں رہنا ہی باعث خوف ہے۔

"ارے بھابھی! آپ بھی تو محورت ہی ہیں۔ کہتے ہیں بھابھی کو اپنے پاس مثلاً لیا کرو۔ آپ میرے پاس آئیں یا میں آپ کے پاس" اب گھر میں جو مرد کا جلال ہے وہ تو مرد کا ہی ہے نا۔
جب میکے سے بھائی آکر رہنے لگے تو یکدم اس کا خوف غائب ہو گیا۔

"کسے گھر میں کیا ڈرنا۔ وہ تو شروع شروع کے دن تھے۔ نئی جگہ، نیا گھر اور پھر بیوی والے آئے دن کی نیت نئی خیریں، زائد نے تو سارے خاندان کو پریشان کر رکھا ہے۔ اور بھائی صاحب ہیں نا یہ ساتھ والا گھر ہی تو ہے۔ ایک ہی تو گھر ہے۔ جب چاہے ہالو۔"
پھر بھی کبھی چھوٹا بھائی چلا آنا لہ کسی بڑا کبھی بہن تو کبھی ماں۔

"ہر کوئی چلا آتا ہے یہ کہہ کہہ کہہ کہہ نساء اکیلی ہے" ارے بھی کس نے کہا میں اکیلی چوں عاجز آئی ہوں میں ان مہمان نوازیوں سے بھائی صاحب آپ زائد سے کہیں مت کیا کریں میرے خاندان والوں کو فون۔ اکیلی اکیلی میں کہاں کی اکیلی آپ جیں نا۔
زہرہ بچوں کو قرآن پاک کا سبق دے رہی تھی اور رضیہ سبزی بنارہی تھی بھائی صاحب شاید اخبار پڑھنا چاہ رہے تھے اور نساء۔

"بابی! آپ پہلی عورت ہیں جو میکے والوں کی مہمان نوازیوں سے تنگ ہیں۔" رضیہ خود کو روک نہ سکی۔ وہ صبح سے شام تک زہرہ کے ساتھ رہتی تھی۔ کام والی نہیں گھر کا فرد ہی لگتی تھی۔

نساء نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ سنی اپنے مطلب کا تھی یا صرف بولتی تھی۔ یا اپنی چٹکتی، دکتی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی۔
"تھ۔ پیش و؟" کامل اس سے سبق پوچھ رہا تھا۔

سدرہ سپارہ گود میں رکھے اپنے ناخن چبا رہی تھی اور وہ ان پانچ چھ بچوں میں
پیشی اخبار کے پیچھے ہونے والے واقعہ کو دیکھ رہی تھی۔

"تائی امی! اہ! پیش۔ و؟ تائی امی! کامل مسلسل پوچھ رہا تھا۔

وہ اخبار کا صفحہ پڑے بھائی صاحب کے ساتھ کوئی خبر پڑھ رہی تھی۔ دونوں ایک ہی خبر پڑھ رہے تھے۔ دونوں کا ہاتھ ایک ہی خبر تھا۔

"صوفی" رضیہ نے زہرہ کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد خود ہی بتا دیا۔ زہرہ کی سچ بٹا بند ہو گئی تھی۔ وہ اپنا ورد بھول گئی۔ اسے ان دونوں کے پیچھے دیوار پر سائے لرزے دکھائی دے۔ ان سایوں کو دیکھتے ہی وہ کھوکھلی سی ہو گئی۔ راکھ اور کوڑے کا ڈھیروں گئی۔

جبکہ اس کے بال لمبے تھے نساء کے پھوٹے تھے۔ اس کا قد دراز تھا نساء کا چھوٹا تھا۔

اس کا رنگ دو دوھیہ تھا نساء کا گندمی تھا۔ اس کی آنکھیں سموری تھیں نساء کی کالی تھیں۔

اسے لوگ خوبصورت کہتے تھے اور نساء کو قبول صورت۔

پھر؟
کتی ہی بار اس نے خود کو جانچا تھا۔ شروع کے دنوں میں وہ یہی کام کیا کرتی تھی۔ شیشے کے سامنے کھڑی آئینے میں پھیلا کر خود کو دیکھا کرتی۔ کبھی بالوں کو آگے رکھتی، کبھی پیچھے، کبھی پشت دیکھتی، کبھی رخ کیا ہے جودل میں سما جاتا ہے۔

صورت؟ تو وہ تو اس کے پاس تھی۔ اسے تو نساء کی صورت بھی بہت اچھی لگتی تھی۔

اسے تو یہ بھی بہت اچھا لگتا تھا کہ وہ اس کے گھر کے قریب آگئی ہے۔ اسے اچھا لگتا تھا نساء سے باتیں کرنا۔

اس کے ساتھ بازار جانا۔ بازار جاتے ہی وہ چھا جاتی تھی۔ دونوں میں ہر دکان، ہر دکان کے خواص اسے ازیر ہو چکے تھے۔ بلکہ بازار کی کہیں بہت اندر اور کہیں بہت دور ٹکڑی بہت سی دکانیں اسی نے دریافت کیں۔

اگر بازار کے رش میں بھی وہ اس ممکنیت سے چلتی کہ اسے دل لہ لوگ راستہ صاف کرنے لگتے۔ وہ ہر دکان میں ایسے جاتی جیسے اس دکان کا افتتاح کرنے آئی ہو اور وہ تلخ ہنسی کرتی کہ اس کا استقبال ایسے ہی کیا جائے۔ اور کیا جاتا بھی تھا۔ وہ نساء بھی زہرہ نہیں۔ وہ گھروں کے ڈیزائن دیکھتی یا برتنوں کے اس کا ہر انداز خاص ہوتا۔ وہ جس دکان سے ایک بار چیز خریدتی اس دکان پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتی وہ ان ہزاروں خریداروں میں سے نہیں تھی جو آتے جاتے ہیں۔ وہ ان میں سے تھی جو سالوں بعد بھی آتے ہیں تو پہچان لیے جاتے ہیں۔

"ان چکن کڑائی اور تندوری روٹی وہ بھی نمیہی مزے آئے گارات کے کھانے میں۔"

کھانا وہ کچھ بھی لپکتی ہاں اس کا اہتمام اور ذکر اس انداز سے کرتی جیسے کسی دعوت عظیم کا لیا جاتا ہے۔ وہ ہر چیز سے مزاحیہ کرتی، ہر چیز کو خاص بناتی یا کو شش ضرور کرتی۔

"ارے۔ میں تو بس کھانا ہی۔" کامران فون رکھ کر اس کی طرف بٹھے۔

"نساء کہہ رہی ہے کچھ خاص پکایا ہے آج۔ جا کر دیکھیں تو سہی۔ تم کھلاؤ بچوں کو۔ میں آتا ہوں ابھی۔" ہاتھ میں چاہے نوالہ پکڑا ہوتا نساء کانون آتے ہی کامران نوالہ چھوڑ کر فوراً "چل بڑے ساتھ ساتھ ایسے مسکراتے جاتے جیسے کسی کی دلکش لوار پر مسکرایا جاتا ہے۔

رضیہ بھی بہت قدر دان رہی تھی نساء کی، اس کی چال کی اس کے انداز کی اس کے رکھ رکھاؤ کی۔

"یہ بڑے بڑے گلاس بھر بھر دودھ، جوس، شیک دیتی ہیں اور اتنے نئے نئے کپڑے جوتے دے دے ہیں۔ جس چیز پر ہاتھ رکھوں، قسم سے ہاتھ میں پکڑا دیتی ہیں۔"

ظاہر ہے نساء سب کو خوش رکھنا جانتی تھی۔ وہ گھر سے لے کر حد نظر تک سب کو اپنا گریدہ رکھتی۔ وہ ہر چھوٹے بڑے، بوڑھے جوان، لڑکی، عورت، مرد اور

بچوں پر فردا رہتی۔ کیا انسان کیا جانور، وہ انہیں پالتو بنانے کا شہرہ جانتی تھی۔ وہ تھکتی ہی نہیں تھی اسے ہر شخص خود میں مبتلا چاہیے تھا۔ اسے ہر شخص درکار تھا، کیا مالک، کیا نوکر۔ وہ دونوں نہیں، لمحوں میں قیمت پیدا کرتی۔

"بہت حسرت تھی ان عورتوں کو دیکھنے کی جو تخت و تاج تہ وبالا کروایا کرتی تھی۔ جنہیں اشاروں کے ناچ پسند تھے۔ پوری ہو گئی وہ حسرت بھی۔"

رضیہ آئے دن نساء کی شان پر بھائی رہتی۔ نساء کے لیے کبھی رضیہ بھی "رضیہ چندا" تھی۔

"رضیہ بے شک بہت اچھا کام کرتی ہے، لیکن یہ کیا ادھر ادھر کی بات کرنی۔ کل اس نے مجھے بتایا کہ آپ میں اور بھائی صاحب میں لڑائی ہوئی ہے۔ یہ کام ٹھیک نہیں، ہم دونوں گھروں کے لیے کہ ہم ایک دوسرے کی بات کسی تیسرے سے نہیں۔ میں نے اپنے لیے کام والی کا انتظام کر لیا ہے۔" نساء نرمی سے کہہ کر خاموش ہو گئی اور رضیہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

اس نے صرف ایک دن پہلے نساء کو طعنا "جتایا تھا کہ پہلی بار بھائی جان اور زہرہ بچی میں لڑائی ہوئی ہے۔ اس کے طعنے کو نساء نے بہت اچھے سے استعمال کیا تھا۔ اس لڑائی کی وجہ بھی رضیہ ہی بنی تھی۔ وہ جیکے جیکے زہرہ کو نساء کے گھر کا حال سنایا کرتی۔ شام کو گھر بھائی صاحب آئے، گھر ان کا فون آیا۔ کچن میں بیڈروم میں، باہر میز پر وہ جیکے جیکے ان کی گھرانی کرنے لگی، نساء کو غصہ تھا کہ اتنا گھر کتنی رضیہ اس کی نہ بنی پر مجال ہے جو اس نے ذرا بھی غصہ ظاہر کیا ہو، خود کو سادگی سے سارے قصے سے بے کر لیا۔ وہ بے تو اس کا جب دل چاہتا، اپنی سادگی کی آرائش کرتی، اپنی مرضی کے رنگ اوڑھتی تھی وہ۔ رضیہ سے بات کرتے ہوئے بھابھی کے لیے بچوں کے لیے، اپنے پیارے طوطے کے لیے، زائد سے فون پر بات کرنے کے لیے اور بھائی صاحب کے لیے چھوٹے نئے انداز اور رنگوں سے سجارتا شاید وہ ایک مورت ہے۔

اور کیا کسی صورت کی پوجا کا حق ایک ہی پجاری کو
یقیناً نہیں ہے۔
ساعت حشر کی اذیت تک
اور کتنی اذیتیں ہوں گی
اس قیامت سے پیشتر یا رب
اور کتنی قیامتیں ہوں گی
☆ ☆ ☆
پھر بہت سی راتوں — کی طرح اک بار پھر
ویسے ہی کامران اس کے قریب سے گزرنے لگا۔
قریب آتے ہی زہرہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کامران کے
لبے یہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ ڈر گیا۔
”کیسے انسان ہو تم؟“
زہرہ اٹھ کر سامنے آکھڑی ہوئی، لیکن وہ ایسے کھڑی
تھی جیسے درود کر قدموں میں گر جائے گی۔
”میں تمہارے لیے توبہ کے نفل پڑھتے پڑھتے
تھک چکی ہوں اور تم ہو کہ تمہیں ہی نہیں۔ کیوں حلال
چھوڑ کر حرام کی آگ میں جل رہے ہو؟“ کامران نے
اندھیرے میں اسے گھور کر دیکھا شاید وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ
زہرہ ہی ہے یا اس کا ہم۔
”کیا بکواس کر رہی ہو؟ چھوڑو میرا ہاتھ۔ پتا نہیں
کیا الٹا سیدھا بولو جا رہی ہو۔ آئے دن کا تمہارا یہی
مسئلہ ہے۔“
”میں تمہیں وہ الٹا سیدھا سنارہی ہوں جو تمہیں
نظر نہیں آ رہا۔ تمہیں وہ شیطان نظر نہیں آتا جو
تمہارے قدموں کے نشان چوستا ہے۔ اسے ایسا کرتے
میں نے دیکھا ہے۔ جو تمہارے ساتھ جھومتا ہے اور
تنبائی کی سیاہی میں رقص کرتا ہے۔ تمہیں اپنے
قدموں سے اپنی آگ نظر نہیں آتی یا۔“
”جی عبادتوں نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تم
خود کو دیکھتے گئی ہو۔“ اس نے مسخر اڑایا۔ ”اپنے
اس خیالی دماغ میں کوئی اور مجھ سمجھو یا سو جاؤ۔“
”تمہیں کیا لگتا ہے؟ وہ کون ہے؟ وہ زہد کی بیوی

ہے۔ تمہاری بیوی میں ہوں۔“ زہرہ نے جیسے سرگوشی
کی۔
کامران نے گھور کر اسے دیکھا۔ شاید اس نے سنا
نہیں تھا۔
”ہونہہ! پرے ہٹو۔ اپنی یہ اول فول باتیں کسی اور
کو سناؤ رات دن تم اپنی باتوں کو سوچ سوچ کر جھپٹی
ہو گئی ہو اور مجھے بھی کر دو گی۔“
وہ کمرے سے نکل گیا ہمیشہ کی طرح۔
زہرہ کی سانس پھر کھنکھنے لگی، اس کا وجود ہاڑیں مار مار
کر رونے لگا۔ کامران اس کا شوہر تھا، اس سے محبت
کرتا تھا۔ کبھی اس پر خواب میں بھی شک نہیں کیا
جاسکتا تھا۔ لیکن وہ سب ”کبھی“ تھا۔
پتا نہیں انسان کے نفس کے وہ کون سے سوراخ
ہیں جو کبھی بند نہیں ہوتے۔ وقت اور موقع ملنے ہی
ان میں سے ”پپ“ کیوں رنے لگتی ہے۔
وہ جس کے بارے میں کہتے ہیں وہ زخیوں کا
مشروب ہوگا۔ اسی رستے ہوئے غلوی کو ہی شاید فرشتے
جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اور پھر نہیں گے۔ لے
لی یہ تیرے ہی گناہ سے جمع کیا گیا ہے۔
☆ ☆ ☆
اس کے لیے وہی وحشت بھرے دن تھے اور اذیت
بھری راتیں تھیں۔ وہ دن رات کے اس کھیل سے
اتنی تکلیف میں تھی کہ اکثر دیواروں سے سر ٹکراتی
رہتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کامران کے
لبے آنسو بہائے یا اپنی بد قسمتی پر۔ آنکھیں چھلک
چھلک جاتیں۔
”بچے اب سمجھ دار ہو رہے ہیں ہمارے بھی
اور نساء کے بھی۔ کم از کم اتنے تو وہ سمجھ دار ہیں کہ اکثر
ولنے لفظ بہ لفظ سنانے لگتے ہیں۔“
شام کی چائے پیتے ہوئے کامران کے ہاتھ زہرہ کو
رکے۔ اس نے تیز نظروں سے زہرہ کو دیکھا، لیکن
اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ طفر تھا یا تنبیہ۔ پھر حسب
عادت جیسے اس نے سناہی نہیں رکے ہاتھ اور پتے

پھرے کو بحال کر کے وہ پھر سے مگن ہو گیا۔
وہی نساء والا انداز۔ نہ لفظوں کی کہانی بناتے ہیں،
نہ چہرے کی تحریریں پڑھتے ہیں۔ اپنے چہرے پر نت
نئے رنگ سجاتے ہیں اور دوسروں کے چہروں سے خون
نچوڑ لیتے ہیں۔ نہ سنتے ہیں نہ بولنے دیتے ہیں۔
کامل اور شامل کتنی بار کمرے کے دروازے کا رونا
رو چکے تھے۔ کتنی ہی بار وہ بند کمرے کی کہانی سناتے
تھے۔
”بادل اتنے زور سے گرجے تھے کہ میں رونے لگا۔
میں نے شامل کو بھی اٹھایا لیکن یہ اٹھایا نہیں۔ ماما کو
آوازیں دیں۔ دروازہ بھی نہیں کھل رہا تھا۔ اتنا زور
لگایا میں نے۔ پتا نہیں اکثر دروازے کو کیا ہو جاتا ہے۔
ماما کہتی ہیں مجھے کھولنا نہیں آتا ٹھیک سے۔ آپ
بتائیں ماما ای! کیا میں دروازہ بھی نہیں کھول سکتا؟ اتنا
زور لگتا ہوں۔ اتنا بڑا ہو گیا ہوں میں اب۔“
”اکثر دروازے نہیں کھلتے بیٹا! تم تو بچے ہو۔ مجھ
سے بھی نہیں کھلتے۔“ زہرہ اس کو جانی۔
وہ اس کا بھی رہتی اور جب بھی۔ اسے مستقل
روگ نے جکڑ لیا تھا۔ یا وہ نفل پہ نفل پڑھتی یا گھنٹوں
بیٹھی تسبیح کے دانے پر دانے گرائے جاتی۔ اس کی
عبادت کا وہی حال ہو گیا تھا کہ کبھی رکوع نہیں کیا اور
کبھی سجدہ، کبھی تین سجدے کر لیے اور کبھی ایک ہی۔۔
بھی وہ بیڈ روم کا دروازہ کھولے لیے لے کر دیا
کرتی اور دائیں طرف ایک گھر چھوڑ کر نساء کے گھر کی
طرف منہ کر کے پھونکنیں مارا کرتی۔ اسے لگتا تھا یہ
پھونکنیں ”میں صراطِ مستقیم“ پر لے آئیں گی۔
اکثر وہ اتنی جی ٹنگی یا باندھ نساء کے گھر کی طرف
دیکھتی رہتی کہ اسے گمان ہونے لگتا کہ گھر نے چلنا
شروع کر دیا ہے۔ یا گھر زلزلے کی زور پر یا گھر زمین
میں دھنسا چلا جا رہا ہے۔ اسے گھر سے بلا میں نکلتی نظر
آتی۔ اس وقت اسے یقین ہونے لگتا کہ وہ پاگل
ہو چکی ہے۔
”نئے پاؤں آدھی رات کو اندھیرے میں ادھر ادھر
گھورنا یہ کن کے کام ہیں؟ پاگلوں کے ہیں نا۔“

کامران بھی اسے یہی سمجھتا تھا۔
”جھپٹی۔ جو آئے دن وہ ہوں کا شکار رہتی ہے۔“
ہر وقت کی تکرار۔ سوال جواب۔
یہ کامران کا خیال تھا۔ اور اس کا یہ خیال کون بدل
سکتا تھا بھلا۔ اور کون اسے سمجھا تاکہ اگر وہ اتنی صابر
اور نیک نہ ہوتی تو ہر وقت درود دیوار سے آگ برکتی۔
وہ بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے۔
نساء بھی اس کے گھر نہ آسکتی۔ خاندان والے اس کے
ارد گرد ہوتے اور وہ نساء کے لیے عدالت لگواتی
۔ لیکن کامران اتنا سمجھ دار ہی کہاں تھا جو یہ سمجھتا کہ
زہرہ صرف اتنا ہی چاہتی ہے کہ وہ اپنے نفس کی اصلاح
کر لے۔
زاہد نساء کو یا کامران کو بتا رہا ہو تو الگ بات تھی پر
جب وہ آیا تو زہرہ کو معلوم ہوا کہ وہ وہاں سات آٹھ ماہ
سے بیمار تھا۔ شوگر کا مریض تو وہ تھا ہی اور اس کے
ساتھ کیا کیا چلتا رہا اسے دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا
تھا۔ کندھے بوڑھوں کی طرح جھک گئے تھے۔ جسم کے
ہر عضو سے بیماریاں جھلک رہی تھیں۔ زاہد کے آنے
سے اسے سکون ملا تھا مگر اسے دیکھتے ہی زہرہ مر رہی
ہو گئی۔
پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر زہرہ کو اندر رہی اندر ابھام
سماہونے لگا۔ شاید ایسے پل کے لیے جس کی طلب نہ
ہو۔
رات کے انہی پہروں میں سے ایک پر تھا جن میں
زہرہ اٹھ کر نساء کے گھر کی طرف منہ کر کے پھونکنیں
مارا کرتی تھی۔
زہرہ جاگ رہی تھی۔
کامران بھی جاگ رہا تھا۔ اپنی مخصوص کرسی
پر بیٹھے وہ اپنے دفتری کوئی فائل پڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھ
کر اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ وہ سو گوار زیادہ ہے یا
صابر۔ اسے زاہد کی موت کا دکھ زیادہ ہے یا اس میں
ضبط زیادہ ہے۔
”نساء کی عدت ختم ہو جائے گی کچھ دنوں میں۔“
آج سے پہلے کبھی زہرہ نے اتنی مستحکم آواز اور لمبے

میں بات نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھوں سے غلٹ عیاں تھی، پردہ سہمی ہوئی بالکل نہیں تھی۔
 ”ہوں۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔
 ”وہ کچھ دنوں کے لیے میکے جانے کی پھر واپس آجائے گی۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی کامران کچھ تو ظاہر کرے۔
 لیکن کامران کیا سوچتا ہے اس کا چہرہ کبھی نہیں ظاہر کرتا تھا۔ وہ ویسے ہی رت بنا بیٹھا رہا جیسے جانتا ہی نہیں کہ وہ کس کی اور کیا بات کر رہی ہے۔
 ”اس کے والدین اسے لے کر چلے جائیں گے۔ ابھی وہ یہیں موجود ہیں۔ عدت ختم ہونے سے پہلے ہی آپ ان سے بات کر لیں۔“
 ”کیا بات؟“
 ”نساء سے نکاح کی۔“
 کامران نے اپنی آنکھیں اندر کی طرف سکیڑیں جیسے دیکھ کر پہچاننا چاہتا ہو کہ ”وہ زہرہ ہی ہے۔“
 ”یہ سب تمہیں کس نے کہا ہے کہ مجھ سے کہو۔ اباجان نے یا تایا علاؤ الدین نے یا نساء کے گھر والوں نے؟“ کامران غصے سے جیسے بھڑک اٹھا۔
 زہرہ کو بے انتہا حیرت ہوئی۔
 ”مجھ سے زیادہ کون چاہے گا کہ تم نساء سے نکاح کر لو۔ تمہارے ہی نکاح میں آنا چاہیے اسے۔“ زہرہ نے قطعاً ”ظن نہیں کیا تھا مگر کامران کو لگا جیسے آگ لگا دی ہو اس نے۔
 ”یہ بات اگر تم نے کسی بڑے کے کان میں ڈالی تو میں تمہیں گھر سے نکال دوں گا یا درکھنا! چپ چاپ صرف اپنے کام سے کام رکھو۔“
 زہرہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ان پہلوں میں بے چین رتا تھا ناوہ۔ ایک نساء تھی۔ ایک بھائی صاحب تھے اور اب۔
 زہرہ کے چہرے کی سفیدی زرد پڑ گئی۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی، لیکن چپ رہی اور پھر۔
 پتا نہیں کیا کیا اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔

کی گئی ہر سرگوشی اسے سنائی دینے لگی۔
 کئی راتوں کے کھیل تھے جو اسے دکھائی دینے لگے۔
 اس نے صرف ایک نظر کامران پر ڈالی۔
 ”تمہیں اس سے نکاح کرنا ہی پڑے گا۔ تمہیں اپنا یہ راستہ سیدھا کرنا ہی ہو گا۔ یہ پچھلے دروازے والا کھیل مزید برداشت نہیں کروں گی۔ میں خاندان کے بیویوں سے بات کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کسی کو اعتراض نہیں ہو گا جب مجھے اعتراض نہیں تو۔“
 ”تم کون ہوتی ہو اعتراض کرنے والی؟ جب مجھے اعتراض ہے تو۔“ کامران کا چہرہ ابھی بھی بے تاثر تھا لیکن پھر بھی اسے دیکھ کر زور لگ رہا تھا۔
 زہرہ کے لیے مقام حیرت تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نکاح والا خیال کامران کے دل میں پہلے سے ہی ہو گا۔
 ”یہ وہی نساء ہے جس کے پاس تم بھاگ بھاگ کر جاتے تھے۔ میں نے تمہارے قدموں میں اپنا سر تک رکھا لیکن۔۔۔ یہ وہی نساء ہے جس کی وجہ سے میں روتی اور تم تڑپتے رہے ہو یہ راتوں کا کھیل اور سیاہ کاری میں مزید برداشت نہیں کروں گی نکاح تو ہو گا۔“
 ”تم کرواؤ گی نکاح؟ ہمت ہے تم میں اتنی؟“
 کامران کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس سے خوف آنے لگا جیسے وہ جو اس کو بیٹھا ہو۔
 ”دو کوڑی کا سمجھ رکھا ہے کیا مجھے جو اس بد کردار ذلیل عورت سے نکاح پڑھوا کر اس کے ساتھ شری ناتا جوڑ لوں؟ وہ اس گھر تک ہی ٹھیک ہے۔ سنا تم نے وہ اس گھر تک ہی ٹھیک ہے۔ اتنا بے وقعت نہیں ہے میرا نام جو اس کے نام کے ساتھ جوڑ دوں۔“
 کامران غصے میں پتا نہیں کیا کیا کہتا رہا اس نے سنا ہی نہیں۔ اس نے تو صرف یہ سنا۔
 ”دو کوڑی کا سمجھ رکھا ہے کیا مجھے جو اس بد کردار۔۔۔ دو کوڑی۔۔۔ بد کردار۔۔۔
 اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں جیسے آتش فشاں پھینکے۔
 وہ چپ چاپ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

ارحمتہ کریمہ

”صاحب! باہر بیٹھی لی لی پوچھ رہی ہیں کہ اگر آپ مصوف ہیں تو وہ پھر کسی دن تشریف لے آئیں۔“ کرامت نے کمرے میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

ہادی نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ محترمہ کو ڈیڑھ گھنٹہ تو انتظار کروادیا تھا۔ جانے والی ہوتی تو اب تک جاچکی ہوتی۔

”ٹھیک ہے بار! ابھی جوا نہیں۔“ ہادی نے فائل بند کر کے میز پر پٹی تھی۔ ”ایک تو یہ بابا جان میری سمجھ سے باہر ہیں۔ ہر دوسرے دن کسی نمونے کو اٹھا کر بیچ دیتے ہیں پھر آج کل کی لڑکیاں جانے اخبار کی نوکری میں انہیں کیا کشش لگتی ہے خالی خولی ڈگری لے کر جھپتی ہیں کہ صحافت کی دنیا میں انقلاب برپا کریں

گی۔“ آج اسے صبح معنوں میں بابا جان پر غصہ آ رہا تھا۔ کل رات کے کھانے پر انہوں نے سرسری سا ذکر کیا تھا۔

”محب کے جانے کے بعد جو سیٹ خالی ہوئی ہے اس پر ایک بچی کو بھیج رہا ہوں تمہارے پاس شاید کل صبح انٹرویو دینے آئے، اچھی ٹیلنٹڈ لڑکی ہے، رسمی سا انٹرویو کر لیتا؟“

”رسمی سا انٹرویو۔ گویا آپ نے پھر کسی محترمہ کو بلا ہی بالا منتخب کر لیا ہے۔“ اس نے خفگی سے انہیں دیکھا۔

ابھی اتنی مشکلوں سے تو اس نے مابین ہدائی سے چھٹکارا پایا تھا۔ موصوفہ کسی ریٹائرڈ یورو کریٹ کی صاحب زادی تھیں اور بابا جان کے تعلقات کی

مکمل ٹاؤل



Saba 2008

وسعت کے لیے شیطان کی آنت سے زیادہ کیا فقط مناسب ہو سکتا تھا۔ تیس برس تک صحافت کی وادی کارزار میں جو کامیابیاں انہیں ملی تھیں اس میں بڑا ہاتھ ان کی پبلک ریلیشننگ کا بھی تھا۔ وہ چھپاتے وہی تھے جو چھپنا چاہتے، لیکن یہ سچ وہ اپنے ذاتی تعلقات کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیتے تھے اور جب وہ سارے اختارات ہادی کو سونپ کر عملی طور پر ریٹائر ہو چکے تھے پھر بھی کبھی کبھار اس کے کاموں میں ایسی دخل در معقولات کر دیتے کہ وہ جھجھکنا بغیر نہ پاتا۔

”مے آئی کم ان سرا“ مدہم سی آواز پر اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا، اپنی جھنجھلاہٹ برحق الامکان قابو پاتے ہوئے اس نے لڑکی کو اندر آنے کی اجازت دی۔ ”جی! فرمائیے کس لیے جوائن کرنا چاہتی ہیں آپ ہمارا اخبار۔“ اس کے ہاتھ سے فائل لے کر سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور یہ سلا سوال ہی اس انداز میں دانا کہ محترمہ حیران رہ گئی تھیں۔

”یقیناً“ یہ آپ کا پیشین ہے ایم آئی رائٹ؟“ اس کے جواب کا انتظار کیے بنا اس نے پھر سوال لڑھکا دیا تھا۔ حسب توقع جواب میں اب بھی خاموشی ہی ملی۔

”دیکھئے بی بی! بات یہ ہے کہ صحافت کے شعبے کو نوجوان نسل پیش نہیں بلکہ افیشن سمجھ کر جوائن کرنا چاہتی ہے۔ حالانکہ جب آپ اس شعبے میں داخل ہو جاتے ہیں تب اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر مشکل شعبے کا انتخاب کیا ہے آپ نے پھر جس سیٹ پر آپ نے اپنائی کیا ہے وہ تو آموز اور نا تجربہ کار لوگوں کو تو وہی ہی نہیں جاسکتی۔ محب ہاشم کا تو نام سنا ہو گا آپ نے۔ اس جگہ وہ کام کرتا تھا۔ بہت کمینڈ اور ٹیلنڈ شخص تھا۔ اب نیرو دی وی کی طرف نکل گیا، لیکن ہم۔“

”سزا اب میرا وی وی دیکھ بیجئے۔“ اس نے ہادی کی بات کاٹی تھی۔

”دیکھ لوں گا آپ کا وی وی بھی مگر بات یہ ہے بی بی! کہ ضروری نہیں آپ کے پاس ڈگری ہے تو وہ

صلاحیت بھی ہوگی جو اس باب کے لیے ضروری ہے اور پھر رامت مانیے گا، صلاحیت لوگوں کو سفارش کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بانی داوے بابا جان میرا مطلب ہے رضا ہارون صاحب سے کیا واقفیت ہے آپ کی؟“ اس نے اس کی فائل کھولتے ہوئے پچھتے ہوئے انداز میں دریافت کیا تھا۔

”موری سرا! میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔“ جواب دینے کے بجائے وہ یک نکتہ کھڑی ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی اپنا سی وی لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”بیٹھے پلیز میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ ہادی جیسے ایک دم ٹھنڈا پڑا۔ موصوف اگر کسی بڑی شخصیت کی رشتہ دار تھیں تو بابا جان سے کھجانی ہونا لازمی امر تھا۔ ”میرا مقصد آپ کی دل آزاری کرنا ہرگز نہیں تھا۔ یہ باب آپ کو مل سکتی ہے۔ آپ اس کی اہل بھی ہیں میں تو صرف یہ۔“

اس کی بات ابھی لیوں میں تھی کہ وہ اس کے سامنے سے اپنی فائل اٹھا کر سلام کرتے ہوئے کمرے سے باہر بھی نکل گئی۔ ہادی صرف کندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔



”یہ وقت ہے تمہارے گھر آنے کا؟“ وہ رات ایک بجے ایک آفیشل ڈرائیو کر کے گھر لوٹا تھا۔ بابا جی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

”آپ شکی مزاج بیویوں کی طرح آدھی رات تک میرا کیوں انتظار کرتے ہیں۔“ وہ ہنس پڑا تھا۔ بابا جان بھی مسکرا دیے۔

”تمہیں واقعی ایک شکی مزاج بیوی کی اشد ضرورت ہے۔ بہت بگڑ گئے ہو تم۔“

”کھانا کھالیا آپ نے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

”ظاہر ہے ایک بجے تک تمہارے انتظار میں بھوکا تو بیٹھنے سے رہا۔“ وہ خفگی سے بولے۔

”اچھا ناراض کیوں ہو رہے ہیں، کہیں آوارہ گردی کر کے نہیں آ رہا۔ ڈنر کا بتایا نہیں تھا آپ کو۔“ وہ ٹالی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بولا۔

”ڈنہ داریوں کا یہ طوق آپ نے ہی میرے گلے میں ڈالا ہے بابا جان! آج کل کمپینشن کا دور ہے۔ اپنی بٹاک کے لیے وقت اور محنت کی قربانی تو دینی پڑتی ہے۔ آپ کا وقت اور تھا، گئے چنے دو تین اخبار ملک کی اخباری صنعت پر راج کر رہے تھے، اب تو بہت سخت مقابلہ ہے۔“

”بہت تھک جاتے ہو ناں۔“ بابا جان نے اسے محبت بٹاش نگاہوں سے دیکھا۔

”تمہیں میں سگریٹ نہیں پیتا۔“ وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔

بابا جان توبہ لگا کر ہنس دیے تھے۔ وہ بھی ان کی ہنسی میں شریک ہو گیا تھا۔



”دور ساؤ کیسا کام جا رہا ہے۔“ بابا آج بہت دن بعد آفس آئے تھے اور اب آرام سے صوفے پر بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ وہ تفصیل سے انہیں مختلف وقتی امور سے آگاہ کرتے لگا۔

”سننے کے آنے سے تمہارے اوپر کام کا بوجھ کچھ تو ہلکا ہو گیا ہو گا۔ کیسا لمسٹ کر رہی ہے تمہیں؟“ انہوں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے اچانک دریافت کیا۔

”کون سننے گا۔“ وہ واقعی کچھ نہ سمجھ پایا۔

”جو موت، بلکہ بلواؤ اسے۔“ جی بات تو یہ ہے کہ میں آج خاص طور پر اس سے ہی ملنے آیا تھا۔ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں کام کرتے ہوئے اسے کوئی پرائیم تو نہیں، تم سا اٹھ مزاج باس کہاں بھگتا ہو گا اس بے چاری نے۔“

”کس کی بات کر رہے ہیں آپ بابا جان! اس نے اللہ کر پوچھا۔

”کیا مطلب سننے کے جوائن نہیں کیا؟“ انہوں نے اچھے سے پوچھا۔

”کہیں آپ اس لڑکی کا ذکر تو نہیں کر رہے جو کچھ دن پہلے انٹرویو دینے آئی تھی۔“ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

”یقیناً“ میں اسی لڑکی کا ذکر کر رہا ہوں۔“ انہوں نے کات دار لہجے میں کہا اور ان کی اس درجہ خفگی کم از کم اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

”انٹرویو تو میں نے لے لیا تھا، مگر شاید سلیری بھیکچ اس کو پسند نہیں آیا تھا، اسی لیے جوائن نہیں کیا۔“ ان کی ناراضی دیکھ کر اسے لہجے کو سرسری بناتے ہوئے

”خوب تو اسے تنخواہ کم لگی تھی، بانی داوے کتنی آفری تھی تم نے اسے۔“ بابا جان بال کی کھال اتار رہے تھے۔

”کم آن بابا جان! ایک غیر لڑکی کے پیچھے آپ مجھ سے جرح کر رہے ہیں۔ میں نے تو موصوفہ سے صرف یہ پوچھا تھا کہ آپ سے ان کی جان پہچان کیسے ہے مگر اس ذرا سی بات نے ان کی انا کو خاصی گھیس پہنچائی اور سوری بابا جان! میں آپ کے تعلقات مزید نہیں نبھا سکتا۔ پہلے آپ نے ماہین ہدائی کو چکا دیا تھا۔ اپنی جانب سے زیادہ مجھ میں دلچسپی لینے لگی تھیں محترمہ۔ کتنی مشکل سے اس سے پیچھا چھڑایا ہے۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔ اب آپ ایک اور موصوفہ کو پیچ رہے ہیں جانے۔“

”سننے کو ماہین ہدائی سے کمپیز کرنے کی کوشش مت کرو بابا جان! بابا جان نے درستی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔“ وہ بچی بہت مختلف ہے۔ بہت پیاری اور بہت ہی ٹیلنٹڈ۔ تم اسے نہ رکھ کر بہت بچھتاؤ گے۔“ انہوں نے جیسے اسے وارننگ دی تھی۔ ”باصلاحیت لوگوں کو سفارش کی بیسیاکیوں کی ضرورت نہیں ہوتی بابا جان!“ اس بار وہ بھی قدرے چڑ کر بولا تھا۔

”بہت خوب، ویسے بیٹا جان! آپ اس وقت جس کرسی پر براجمان ہیں اس میں آپ کی اپنی صلاحیتوں کا کتنا دخل ہے؟“ بابا جان کا لہجہ سراسر طنز تھا۔ ”تو وہ لڑکی آپ کے لیے اتنی اہم ہے کہ آپ اس کے لیے مجھے میری اوقات یاد دلارہے ہیں۔“ بابا جان کے انداز پر اسے ہسی اٹھی تھی۔

”ہاں وہ مجھے بہت عزیز ہے، میرے عزیز ترین مرحوم دوست کی بیٹی۔“ انہوں نے قطعیت سے جواب دیا۔

”آپ کا ایسا کون سا دوست ہے جس سے میں واقف نہیں۔“ وہ حیرت سے پوچھ رہا تھا۔ ”نام بتانے سے کیا حاصل، تمہارے حافظے میں وہ

نہیں ہوگا اور پھر اسے دنیا سے گزرے ایک مدت ہو گئی۔ عرصے بعد اس کی بیٹی سے رابطہ ہوا ہے۔ میں نے اسے کتنے یقین سے تمہارے پاس بھیجا تھا۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا بابا جان! کیا سوچ رہی ہو گی وہ بچی اور خود رات اتنی ہے کہ مجھ سے تمہارے رویتے کی بالکل شکایت نہیں کی۔ کل شام کو بھی میری اس سے فون پر بات ہوئی۔ میں اسی گمان میں اس سے بات کیے گیا کہ وہ تمہارے پاس آ رہی ہے اور اس نے ہرگز بھی میری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی، بس ادھر ادھر کی باتیں کر کے فون رکھ دیا۔“ بابا جان کو از حد قلق ہو رہا تھا۔

”سوری بابا جان! غلطی ہو گئی۔ آپ اسے ایک بار پھر بھیج دیجئے گا۔ میں اسے ایڈجسٹ کر لوں گا۔“ بابا کم ہی اتنے ناراض ہوتے تھے، اس نے عافیت اسی میں جالی کہ غلطی تسلیم کرے۔

”کوشش تو کروں گا، لیکن مشکل ہی ہے کہ اب وہ میری بات مانے گی۔“ بابا جان نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔ وہ خاموش ہی رہا۔

اور دو دن بعد وہ پھر اس کے سامنے موجود تھی۔ ”جی تو مس سننے کا کام سمجھ لیا آپ نے۔“

روایتی پیشہ ورانہ انداز میں اس نے سننے کو گائیڈ لائن دی تھی۔ وہ سنجیدہ سی صورت بنائے بیٹھی تھی۔ بابا جان کو اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ نہ ہو پایا کہ کام اس کی سمجھ میں آیا بھی ہے یا سرب سے گزر گیا ہے۔

”اینی کونسجن مس سننے! بابا جان نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے استفسار کیا۔

اس دن کی ملاقات تو بہت مختصر ہی تھی۔ جانے کیوں آج اس لڑکی کے نقوش بہت مانوس اور دکھے بھالے سے لگ رہے تھے لیکن بہت غور کرنے پر بھی وہ اندازہ نہ لگایا تھا کہ سامنے بیٹھی لڑکی کس کی شناخت لیے ہوئے ہے۔ خیر دنیا میں بہت سے چہرے ملتے جلتے لگتے ہی ہیں۔ اس نے اس کے نقوش کو جانے کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا۔ سننے کے چہرے پر تنذیب کے

آثار نمودار ہو رہے تھے جیسے وہ کچھ کرنا چاہ رہی ہو مگر کہہ نہ پا رہی ہو۔ ”جی مس سننے! بابا جان نے اسے بات کرنے کا حوصلہ دیا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ سروسہ میں پہلی بار انٹرویو دینے آئی تھی، تب رضا انکل نے مجھے بتایا تھا کہ ویکسینز لگی ہوئی ہیں، میں بھی اپلائی کروں۔ آئی ایم سوری، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھے خاص طور پر بغیر کسی ضرورت کے بھیجا گیا ہے، اب بھی مجھے رضا انکل کی وجہ سے مجبوراً آنا پڑا ہے۔ ان کے حد درجہ اصرار کے سامنے مجھے اپنا متکسر انکار بدتمیزی لگانا پڑا۔ کئی جگہوں پر اپلائی کر رکھا ہے، میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ جیسے ہی۔“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بابا جان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ محترمہ ضرورت سے زیادہ لمبی ناگ کی مالک تھیں۔

”بات یہ ہے مس سننے! کہ اگر آپ کا کام ہمارے معیار کے مطابق ہو تو آپ چاہیں گی بھی تو ہم آپ کو نہیں چھوڑیں گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”میں کوشش کروں گی سروسہ! وہ بھی دھم سے مسکرا دی تھی۔



”یار صابر! بندہ سارا دن کا تھکا ہوا شام کو گھر آتا ہے۔ کچھ دھنک کا پکایا کرو۔“ بدتمیزا سارا سن کھاتے ہوئے وہ صابر سے شکوہ کیے بنانہ رہ پایا۔

”صاف پانچ سال پہلے صابر اس گھر میں ڈرائیور کے طور پر آیا تھا۔ اب صابر کھانا بھی پکاتا ہے۔ ملازمہ کے سرب کھڑے ہو کر صفائی بھی کروا تا ہے۔ لائڈری سے کپڑے بھی دھو تا ہے اور آپ دونوں گھر میں نہ ہوں تو گھر کی چوکیداری بھی کرتا ہے۔ یعنی صابر ڈرائیوری کے علاوہ ہر کام کرتا ہے تو جس ہندے کے سر اتنے کام ہوں تو وہ کھانا ایسا ہی بنا سکتا ہے۔“

پشتو لہجے میں اردو بولتا سرخ و سپید رنگت والا صابر آج کافی ناراض سا تھا۔

”خیر ہے خان صاحب اتنی برہمی۔“ بابا جان نے مسکراتے ہوئے پوچھا، جبکہ بابا جان خلاف توقع کھانے میں کوئی نقص نکالے بغیر بڑی رغبت سے کھانا کھا رہے تھے جیسے اس گفتگو سے انہیں کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

”نہ آپ اپنے بابا جان سے پوچھو۔ صابر اس گھر کے لیے چوبیس گھنٹے جان مارتا ہے۔ اس بڑا حرام پنو سے چیخ کر سارے گھر کی صفائی کروا تا ہے اور آپ کا بابا صاحب کالونی کے بچوں کو بلا کر گھر میں کرکٹ کچھ کروا تا ہے۔ سارے گھر میں بچے وہ اودھم مچاتے ہیں کہ اللہ توبہ! فریج میں گھس کر پیس جٹ کر جاتے ہیں۔ لائن کا سٹیاناں کر دیتے ہیں، اب آپ ہی بتاؤ صابر غصہ نہ کرے تو کیا کرے۔“

”بالکل کرے۔ غصہ کرنا صابر کا حق بنتا ہے۔“ بابا جان نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”غصہ کرنا صابر کا حق بنتا ہے اور اپنے حقوق و فرائض کا کچھ خیال ہے میاں۔“ بابا جان تنگ کر بولے۔

”کیوں غم نہیں نے کیا کر دیا؟“ اس نے بے چارگی سے پوچھا۔

”کب سے کہہ رہا ہوں شادی کرو تو تم بڑھے ہوئے جا رہے ہو اور میں بڑھا ترین۔ پوتے پوتیاں کھلانے کی آرزو لیے ہوئے۔ تمہاری ماں دنیا سے رخصت ہوئی، اب تم چاہتے ہو کہ میں بھی یہ حسرت لیے مر جاؤں؟“ وہ جذباتی ہوئے تھے۔ صابر مسکراتے ہوئے واپس مڑ گیا، اس نے بڑے صاحب کو ان کی مرضی کی پیروی کر کے دے دی تھی۔

”اللہ کا نام لیں بابا جان! امی کے انتقال کے وقت میری عمر بمشکل انیس بیس سال تھی، وہ کہاں سے میری شادی کی حسرت لیے رخصت ہوئی ہیں۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”اچھا تو اب تو تمہاری عمر انیس بیس سال نہیں ہے نہ شادی کے لیے یہی عمر مناسب ہوتی ہے۔ کتنا

عرصہ ہو گیا ہے تمہیں مجھے ٹالتے ہوئے اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ انہوں نے دو ٹوک لہجے میں یاد رکھوایا۔

”شادی تو میں کر لوں بابا جان! لیکن شادی کے لیے ایک عدد لڑکی کا ہونا بھی ضروری ہے اور مجھے فی الحال کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جس کو ایک نظر دیکھنے کے بعد میں اپنا دل دے بیٹھوں۔“

”پناہ! اپنے پاس سنبھال کر رکھو وہ شادی کے بعد بھی دیا جاسکتا ہے اور حیرت ہے کہ اتنے میچور ہو کر بھی تم پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتے ہو۔“

”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ وہ چیخ کر بس پڑا۔ ”خیر تمہارا مطلب جو بھی تھا میرا مطلب صرف یہ ہی ہے کہ اب تم سنجیدگی سے شادی کے متعلق کوئی فیصلہ کر لو! اتنی ڈھیر ساری لڑکیوں سے تمہاری علیک سلیک ہے۔ کیا کوئی بھی بھلی نہیں لگتی۔“ وہ اب دوستانہ انداز میں پوچھ رہے تھے۔

”میں نے کسی کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔“ وہ صاف گولی سے بولا۔

”تو اب دیکھ لو اور مجھے لگتا ہے کہ تمہاری نزدیک کی نظر کچھ کمزور ہے۔“

”کیا مطلب بابا جان! آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔“ اس نے الجھ کر پوچھا وہ مسکرایا۔

”میں فی الحال تم سے یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ اگر تم اپنی زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تو کیا مجھے اختیار دو گے کہ میں تمہارے لیے کچھ سوچ سکوں؟ باپ ہوں تمہارا آخر جو سوچوں گا تمہارے بھلے کا ہی سوچوں گا۔“

”آف کورس بابا جان! آپ میری زندگی سے متعلق تمام فیصلوں کا اختیار رکھتے ہیں میں نے کب آپ کو انکار کیا۔ کوئی لڑکی آپ کو اچھی لگی ہے تو مجھے بتائیں کون ہے وہ میں ضرور اس کے بارے میں سوچوں گا۔“ وہ بابا جان سے لڑکی اگلوں اچھا رہا تھا، مگر وہ بھی اپنے نام کے ایک تھے۔

”لڑکی تمہارے آس پاس ہی ہے اسے تمہیں خود

کھوجنا ہے۔ میرے خیال میں تو ایک عورت میں تین خوبیاں ہوں تو اسے شریک سفر بنایا جاسکتا ہے۔ تعلیم یافتہ ہو، باشعور ہو اور پروقار ہو۔ اور جو لڑکی میں نے تمہارے لیے سوچی ہے، ان تین خوبیوں کے ساتھ خوب صورتی اس کی ایک اضافی خوبی ہے بہت سچے گی وہ تمہارے ساتھ۔“

”آخر آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔“ اس کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔

”کہا تو ہے اپنے آس پاس دیکھو کچھ تو داغ لڑاؤ، ناکام ہوئے تو میں بتا دوں گا۔“

”تو کیا آپ میرے ساتھ کوئی کھیل رہے ہیں۔“ وہ ہنسا۔

”جو بھی سمجھ لو۔“ بابا جان مسکرائے۔

”اوکے پاس! کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ وہ مسکراتا ہوا دوبارہ صابر کے بنے بد مزہ کھانے کی جانب متوجہ ہو گیا تھا کہ خالی پیٹ تو داغ بھی کسی قسم کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔

☆ ☆ ☆

”ایک کمبوزی سرائے میگزین کے لیے

مقابہ مراد کا فیئر ایجی تک نہیں پہنچا ہے۔“ سمنیہ اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”ہاں مقابہ قانون آیا تھا ایسی تھوڑی دیر میں فیئر سمیت پہنچ رہا ہے۔“ اس نے لیپ ٹاپ سے نگاہیں ہٹا کر ایک لمحے کو اسے دیکھا تھا۔ وہ جواب سن کر واپس پلٹ گئی۔

”مس سمنیہ۔“ اس نے اچانک ہی اسے پکارا۔

”جی۔“ وہ پھر مڑی۔

”آپ یہاں سیٹ ہیں تا، میرا مطلب ہے کوئی پرابلم تو نہیں۔“ وہ شاید اپنی تسلی چاہ رہا تھا۔

”جی تو یہ تھا سمنیہ نے چند دنوں میں ہی اپنا ٹیلیفون ثابت کر کے دکھا دیا تھا۔ بظاہر چپ چاپ کام کیے جانے والی اس لڑکی میں بے پناہ صلاحیتیں تھیں۔ چند ہی دنوں میں اس کی زیرک نگاہوں نے یہ صلاحیتیں

ماہیابی تھیں۔ اسے آج بھی افسوس تھا کہ پہلے دن وہ اس سے مس ملی ہو کر گیا تھا، یوں تو وہ خود کو زیادہ تصور وار نہ گردانتا تھا کہ بابا جان کی سفارشی لڑکیوں کا اکثر و بیشتر فرسٹ فلور خالی ہوتا تھا۔ البتہ سمنیہ کا کیس بالکل مختلف تھا۔ شاید پہلی بار بابا جان نے کسی کی تعریف کرتے ہوئے مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ اس تعریف کی حتمی دار تھی۔

”نہیں سر! مجھے یہاں کوئی پرابلم نہیں ہے۔“ وہ شائستگی سے جواب دے کر پلٹ گئی تھی۔

وہ لڑکیوں کی اس کلاس سے تعلق نہیں رکھتی تھی بہن سے کوئی فالٹو بات چیت کی جاسکے۔ ہادی دل ہی دل میں خود کو اس کے احترام کے لیے مجبور ہاتا تھا۔

سمنیہ جیسی باوقار لڑکی سے اس کا کم ہی پلا پڑا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والی، سختی اور اصلاحیت۔

”تھیں نکس بابا جان! زندگی میں پہلی بار آپ نے کسی ڈھنگ کے بندے کی سفارش کی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا پھر دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

”یہ ایس خان کون صاحب ہیں۔ دو دن سے کالم لگ رہا ہے ان کا مجھے تو کوئی سمجھا ہوا کالم نہیں لگتا ہے، لیکن نام پہلے کبھی نہیں سنا۔“ بابا ناشے کی میز پر اس سے مخاطب تھے۔

”پتا نہیں بابا! سمنی ہی نئے نئے کالم نگاروں کو دریافت کر رہا ہے۔ آفس جاؤں گا تو پوچھوں گا اس سے۔“ وہ بخار اور فلو کی وجہ سے نڈھال ہو رہا تھا۔ دو دن سے گھر پر ہی بست سنبھال رکھا تھا۔

”بہت شان دار لکھا ہے، طنز و مزاح کی آمیزش کی وجہ سے سنجیدہ موضوع بھی ہلکا پھلکا ہو گیا ہے، حالانکہ قلم میں کٹ بہت ہے۔“

بابا کی اتنی تعریفوں پر اس نے ان کے ہاتھ سے اٹھار لیا۔ ابھی تو سرسری سا ہی پڑھا تھا۔

چند دنوں سے اخبار میں نو آموز کالم نگاروں کے

لیے ایک گوشہ مختص کیا گیا تھا۔ روز ہی کوئی نہ کوئی نیا نام چھپ رہا ہوتا، مگر اس سلسلے کا فیڈ بیک کچھ خاص نہیں مل رہا تھا، نئے لکھنے والے کالم نویس کے تقاضوں پر پورے نہیں اتر رہے تھے۔ کالم کے بجائے مضمون کا گمان ہوتا، لیکن آج جس کالم کی بابا تعریفیں کر رہے تھے اس میں یقیناً کوئی خاص بات تو ہونی چھی اور واقعی غور سے پڑھا تو اب آپ ہی مسکرائے لگے، طنز و مزاح کی آمیزش لیے بہت پختہ انداز تحریر تھا۔

”اچھی دریافت ہے۔“ اس نے سمنی کے انتخاب کو سراہا۔

”آئندہ اس کالم کو نمایاں جگہ پر لگانا۔“ بابا نے ہدایت کی۔

”آپ کہیں تو ایڈیٹر یا جرنل تیج پر لگاؤں؟“ وہ ہنسا۔

”خیر وہ وقت بھی دور نہیں جب یہ ایڈیٹر یا جرنل تیج پر بھی آجائے گی۔“

”آجائے گی؟“ اس نے الجھتے سے دریافت کیا۔

”یار! بس مذکر، مونث کی غلطیاں نکالتے رہا کرو، صابر کے ساتھ رہتے اتنے برس بیت گئے زبان پر تو اثر پڑے گا نا۔“ بابا جان کچھ سنبھلے ہوئے بولے لیکن ہادی نے ان کی بات غور سے سنی ہی نہ تھی۔

”آج سوچ رہا ہوں آفس کا چکر لگاؤں، لیکن بہت نہیں پڑی۔“ سمنی سے اس کی یہ عادت نہیں بدلی تھی۔ ذرا سی بیماری بھی نڈھال کر دیتی تھی۔

”ایک دن کارسٹ اور کرلو۔“ بابا جان نے مشورہ دیا۔

”کرنا ہی پڑے گا، جسم ٹوٹ رہا ہے اور سر میں شدید درد۔“ اس نے خود پر نقاہت طاری کی۔

”اب بوڑھا باپ تمہارا سر ہانا اچھا لگے گا کیا۔ اسی لیے تو کتا ہوں شادی کرلو۔“ بابا جان کی تان آج کل اسی بات پر ٹوٹتی تھی۔ وہ بنا جواب دیے مسکرا کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

”السلام علیکم! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔“

سنعیدہ اس سے مزاج پر سی کر رہی تھی یہ اور بات کہ جملہ کے دوران ہی وہ دو دفعہ چھینک چکی تھی۔
”میں تو اب بہتر ہوں مس سنعیدہ، لیکن شاید اب آپ فلو کی لپٹ میں آگئی ہیں۔“ وہ مسکرایا۔
”فلو؟“ مس سنعیدہ کو پچھلے دو دنوں سے شدید ٹیبر چڑھ بھی ہے، کل بھی میں نے انہیں زبردستی ہاف بور گھر بھیجا تھا، ورنہ یہ تو قائد اعظم کے مقولے پر یقین رکھتی ہیں، ”کالم، کالم اور صرف کالم۔“ سبھی بھی اس وقت کمرے میں تھا اس نے گفتگو میں حصہ لیا۔

ہادی نے ایک نگاہ سنعیدہ کے چہرے پر ڈالی، اس وقت بھی اس کا چہرہ متمایا ہوا تھا شاید بخار اب بھی نہ اترتا تھا۔ ہادی دل ہی دل میں شرمندہ ہوا، وہ طبیعت خرابی کو جو زہنا کر تین دن گھر بیٹھا رہا اور یہاں یقیناً کالم کی زیادتی کی وجہ سے سنعیدہ کو آفس آنا پڑا تھا۔
”مس سنعیدہ، آپ ایک دو دن ریست کر لیں۔“ اس نے نرمی سے کہا۔
”آج تو آئی گئی ہوں سر! طبیعت نہ سنبھلی تو کل کا آف لے لوں گی۔“ اس نے نشو سے ناگ رگڑتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ ایک چھوڑے شک دو دن کا آف لیں، لیکن کالم کا آف پر زور نہ ہوگا، کالم تو آپ کو گھر بیٹھ کر بھی لکھنا پڑے گا۔“ سبھی نے گویا اسے پیٹنی لگا دیا۔
”کیا کالم؟“ ہادی کسی کی بات سمجھ نہ پایا۔
”سر! آپ نے مس سنعیدہ کا کالم نہیں پڑھا۔ بہت اچھا بلکہ حیران کن حد تک اچھا رسپانس ملا ہے ہمیں۔“ سبھی نے خوش ہو کر بتلایا۔

”ایس خان یعنی بس۔“ اس نے جملہ ادھر اچھوڑ کر بے یقینی سے سنعیدہ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر دھیمی سی مسکان پھیلی ہوئی تھی۔
”ایئرنگ سنعیدہ! آپ نے واقعی بہت اچھا لکھا۔“ کپ اٹ اپ۔“ اس نے دل سے اس کی تعریف کی تھی۔

”ایسی بھی کوئی بات نہیں سر! آپ لوگ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“

وہ جھینک گئی تھی اور پھر فوراً ہی اس نے دفتری امور سے متعلق کوئی بات چھیڑ کر موضوع بھی بدل دیا تھا۔ ہادی زیر لب مسکرا دیا تھا۔ اب اس لڑکی کی عاداتوں کے متعلق وہ کچھ سمجھ جانے لگا تھا۔

”مجھے لگتا ہے بابا! میں اس لڑکی سے متاثر ہوتا جا رہا ہوں۔“ رات کو کھانے کی میز پر اس نے بابا کے سامنے اعتراف کیا۔

”سنعیدہ ہے ہی اس قابل کہ اس سے متاثر ہوا جائے۔“
”آپ کو کیسے پتا میں سنعیدہ کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ حیران ہوا۔

”تم بے شک نہ کرو مگر میں تو سنعیدہ کی ہی بات کر رہا ہوں۔“ وہ مسکرائے۔
”آپ کو پتا ہے وہ کالم جو آپ کو بہت پسند آیا تھا، وہ سنعیدہ نے لکھا تھا۔“ اس نے اپنی دانست میں انہیں حیران کن بات بتائی۔

”میں نے ہی اسے مشورہ دیا تھا اس لڑکی میں بہت پوٹینشل ہے۔“

”یعنی کہ آپ اس روز مجھے بے وقوف بنا رہے تھے، یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے آپ کو پتا ہی نہیں کہ کالم کس نے لکھا ہے۔“ اس نے انہیں خفگی سے دیکھا۔

”ہاں! تمہیں بے وقوف تو بنایا، لیکن اس کالم میں مجھے زیادہ محنت نہیں پڑی۔“ انہوں نے اسے ہنستے ہوئے چھیڑا، وہ بھی ہنس پڑا۔

”ویسے بابا! سچی بات تو یہ ہے کہ یہ لڑکی ہرگز رتے دن کے ساتھ مجھے حیران کیے ذرے رہی ہے۔ ٹھنڈ تو ہے، مگر شخصیت میں عجب سا گر لیں ہے، دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔“ اس نے تسلیم کیا تھا۔

”اس کا مطلب ہے تمہاری قریب کی نظر میں بہتری آئی جا رہی ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

ہادی نے ایک دم سر اٹھا کر انہیں دیکھا، جو وہ سمجھا تھا اکیان کا مطلب وہی تھا۔
”بابا! آپ کیا ماننا چاہ رہے ہیں۔ اس روز آپ جو کسٹی کھیل رہے تھے کیا آپ مجھ سے سنعیدہ کی شخصیت بٹھو رہے تھے۔“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

”میں سالوں میں تو نہیں، لیکن بیس دنوں میں تم صحیح جواب تک پہنچ ہی گئے۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولے، لیکن وہ حیران پریشان سا بیٹھا رہا۔

اس روز بہت دیر لڑانے کے بعد بھی اسے اپنے قرب وجود میں کوئی ایسی لڑکی بھائی نہ دی، جس پر اسے گمان گزر تا کہ بابا اسے سوچے بیٹھے ہیں اس نے بابا کی بات کو سرسرا کر مذاق سمجھا تھا۔ شاید وہ اسے اپنے آس پاس جاننے والی لڑکیوں میں سے کوئی لڑکی ڈھونڈنے کی تحریک دلوانا چاہتے تھے اس دن اس نے بابا کی بات کو سنجیدگی سے ہی نہ لیا تھا۔ سوچ کے ٹھوڑے سے گھوڑے دوڑانے کے بعد اس نے ان کی بات کو مذاق کے کھاتے میں ڈال کر مزید سوچ بچار کی زحمت نہ کی تھی۔ اسے ہرگز اندازہ نہ ہوا کہ بابا اس روز سنعیدہ کا ذکر کر رہے تھے۔

وہ لڑکی جس کو اس کے آفس میں داخل ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے تھے، وہ اسے اس کی زندگی میں شامل کرنے کا پلان بنائے بیٹھے تھے۔

”کیا ہوا، کیا میری تجویز کو وہ شخصیت تمہیں پری لگی؟“ بابا اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہے تھے۔

”سچی بات تو یہ ہے بابا کہ ابھی میرا دماغ آپ کی تجویز کو وہ شخصیت قبول کرنے کو تیار نہیں۔ فی الحال تو میں صرف حیران ہوں کہ آپ کے ذہن میں یہ بات آئی بھی کیسے۔ آپ کب اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔“ وہ واقعی حیران تھا۔

”پہلی بات تو یہ ہے ہادی! کہ کسی کو جاننے کے لیے بعض اوقات عمر بھی کم پڑ جاتی ہے اور بعض اوقات وہاں ملاقاتیں بھی کسی کے متعلق درست اندازہ

لگانے کا سبب بن جاتی ہیں اور دوسری بات یہ کہ تم پر کوئی زور زبردستی نہیں۔ تم اپنا ہر فیصلہ کرنے میں خود مختار ہو، ہاں مجھے وہ بچی دیکھنے کے ساتھ ہی بہت اچھی لگی، دل چاہا کہ ایسی سلجھی ہوئی بچی کو ہی تمہارا شریک سفر بنانا چاہیے اور میں کون سا ابھی اس کے گھر تمہارا رشتہ لے کر جا رہا ہوں، وہ تمہارے ساتھ کام کر رہی ہے۔ دیکھو، کچھ دیر کھو، دل مانے تو مجھے بتاؤ اور اگر تمہیں کوئی اور لڑکی لائق پارٹنر کے طور پر پسند آتی ہے تو مجھے اس پر بھی قطعی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ بابا جان رسائیت سے بولے، وہ محض سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

اسے اے پی این ایس کی میننگ کے لیے ایک دو دن کے لیے کراچی جانا پڑا تھا اور آج آفس آکر آج کے اخبار کا تفصیلی مطالعہ کیا تو متین زبیری کے کالم کے اوپر اداریتی نوٹ پڑھ کر کابکارہ گیا۔

متین زبیری صف اول کا کالم نویس تھا اور شاید ان کے اخبار کا سب سے مزید کالم نویس بھی۔ بعض نام ایسے ہوتے ہیں جنہیں نہ چاہتے ہوئے بھی بھاری قیمت دینی پڑتی ہے اور متین زبیری ایسا ہی کالم نگار تھا۔

اس جہتوں سے روابط کی وجہ سے وہ انٹرنڈر کی بات باہر نکالتا تھا اور اسی لیے اس کا کالم شوق سے پڑھا جاتا تھا، ورنہ نظریاتی طور پر اس کا قبلہ کہاں جاتا تھا، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ غیر ملکی سفارت خانوں کی تقریبوں میں جن صحافیوں کو خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا، ان میں متین زبیری سرفہرست ہوتا تھا۔ سرحد کے دونوں اطراف کے نام نہاد دانشوروں نے جو ادبی تنظیم قائم کر رکھی تھی، وہ اس کا بھی روح رواں تھا۔

آج کے کالم میں اس نے حسب معمول پاکستان کی نظریاتی اساس پر اپنے مخصوص ڈھکے چھپے انداز میں سوال اٹھائے تھے، لیکن آج اس کے کالم کے اوپر جلی حروف میں درج تھا ”ہمارے“ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔“

ایک قد آور کالم نگار کے لیے یہ ایک بہت بڑا

طمانچہ تھا کہ اس کا اپنا اخبار ہی اس کے لکھے کی حمایت کرنے سے انکار کر دے۔ ہادی یہ کنیشن بڑھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ نئے اخباروں نے ہماری معاونوں کے عوض بہت سے کالم نویسوں کو پہلے ہی اپنی طرف بھیج لیا تھا۔ یہ دو چار نام بچے تھے جن کی وجہ سے اخبار کی سادہ برقرار تھی اور اب یہ کنیشن، جہاں گویا مینین زیری کو بھی بار اراض کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس نے فوراً "مشی کو بلا بھیجا۔

"مشی! یہ کیا حماقت ہے۔" اس نے اخبار مشی کے سامنے میز پر پھینکا۔

"مجھے بھی جب پتا چلا تو میری ہونچکی تھی سر! اور یہ بہت میں نے نہیں مس سنیعہ نے کی ہے۔" اس کا غصہ دیکھ کر مشی نے صاف صاف بتا دیا۔

"بلائے مس سنیعہ کو۔" وہ لب بلبھتے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دو منٹ بعد ہی وہ آگئی تھی بالکل پرسکون

"جی سر! آپ نے بلایا مجھے؟" وہ شاید جانے بوجھتے انجان بن رہی تھی۔

"مس سنیعہ! آپ نے جو حماقت کی ہے جانتی ہیں ہمیں اس کا کتنا خفا ہے۔ بھگتنا نہ سکتا ہے؟" ہادی نے اس کے چہرے پر نظریں جم کر کٹ دار کبجے میں مخاطب کیا۔

"سر! آپ کالم بڑھ کر تو دیکھیں کیا کیا ہو گئی ہے اس میں۔" سنیعہ کو اس کا رد عمل دیکھ کر افسوس ہوا تھا۔ اس نے اخبار کھول کر ہادی کے سامنے پھیلایا۔

"یہ دیکھیں سر! قائد اعظم کی گیارہ اگست والی تقریر کو لے کر اس شخص نے نہ صرف بانی پاکستان کی شان میں ہرزہ سرائی کی ہے بلکہ دو قوی نظریے کا بھی حکم کھلا مذاق اڑایا ہے اور دیکھیں تو سبھی معقود ڈھاکہ کا ذکر کتنے مسخر آمیز انداز میں کیا ہے۔ کالم بڑھ کر لگتا ہی نہیں کہ کسی پاکستانی صحافی کا نقطہ نظر بڑھ رہے ہیں بلکہ یوں لگتا ہے کہ یہ کسی پرو ہندوستانی شخص کا تحریر کردہ ہے۔ دل تو کر رہا تھا کہ اس کالم کا جواب بالکل اس کے سامنے والی جگہ پر کالم لکھ کر دوں لیکن پھر سوچا کہ فی

الحال تو اس کنیشن سے کالم چلائی ہوں کہ ادارہ مضمون نگاری کے رائے سے متفق نہیں بعد میں کالم۔"

"مس سنیعہ! آپ ادارہ نہیں ہیں۔" ہادی نے اس کی بات کاٹ کر حنا کے والے انداز میں کہا۔ سنیعہ نے ایک نگاہ اس کے برہم چہرے پر ڈالی اور نگاہیں جھکا لیں۔

"اب محض اس ادارے کی اسمبلی ہیں اور دو چار کالم لکھ کر آپ سمجھ رہی ہیں کہ آپ بہت بڑی انٹلیجنس کل بن گئی ہیں اور ہر معاملے میں آپ کی رائے حرف آخر ہو گئی ہے تو یہ غلط فہمی ہے آپ کی۔ ہمیں ہر نقطہ نظر کے لوگوں کو اہمیت دینی پڑتی ہے۔ صحیح غلط کا فیصلہ کرنا ہمارا نہیں۔ قارئین کا کام ہے آپ کی بہت مہربانی ہوگی اگر آئندہ آپ اپنی حجت الوطنی اور جذباتیت اپنے تک ہی محدود رکھیں گی۔ حد سے زیادہ اعتماد آپ کو تو نقصان پہنچائے گا مگر میں ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کا خمیازہ ہمارے اخبار کو بھگتنا پڑے۔" اس نے سنیعہ کو ٹھیک ٹھاک قسم کی جھاڑ پلائی تھی۔

"سوری سر! وہ بمشکل بولی تھی۔ شدید غصے اور بے عزتی کے احساس سے اس کا چہرہ دھبک اٹھا تھا اس کا چہرہ دیکھ کر ہادی کو بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا ہے۔

"جاسکتی ہیں آپ۔" اس نے کہہ کر ایک فائل کھول لی۔

سنیعہ ایک لمحے کا توقف کیے بغیر واپس پلٹ گئی تھی۔ کئی لمحوں تک اس کے متے ہوئے چہرے اور لرزتی ہلکیوں کا تصور ہادی کو مضطرب کر رہا تھا۔

"اس احقر لڑکی کو بلا میرے لیے سوچے بیٹھے ہیں۔" اس نے ہادی کی تجویز کو ناقابل عمل گردانا چاہا تھا لیکن وہ بیان بھٹک بھٹک کر سنیعہ کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں کی طرف جا رہا تھا۔ سنیعہ کو جو "دوڑ" ابھی پلائی تھی اس میں وہ خود کو حق بجانب سمجھتا تھا پھر جانے کیوں دل کچھ غلط ہونے کی تھنٹی بج رہا تھا دل و دماغ کی ان متضاد کیفیتوں پر وہ جھنجھلا سا گیا فائل ختم

کر اس نے ٹائم دیکھا۔ ذرا دیر بعد چیف منسٹر کے ساتھ مدیران کی میٹنگ تھی۔ اس نے ڈرائیور کو فون کر کے گاڑی نکالنے کا کہا تھا۔



"بیبا جان! عملی زندگی میں انسان کو جذبات کے ساتھ کچھ مصلحتوں اور مجبوروں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

وہ دو گھنٹے بعد لوٹا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے لگا تو بیبا جان کی آواز سن کر ٹھٹک کر رہ گیا، وہ کس کو سمجھا رہے تھے۔ ہادی اندازہ لگا سکتا تھا اور کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ بیبا جان کے پاس سنیعہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"خیریت بیبا جان! صبح تو آپ کے آنے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔" اس نے انہیں سلام کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"پروگرام بننے کی یادیر لگتی ہے۔" بیبا جان نے اسے خفگی سے دیکھا تھا، ہادی نے بمشکل مسکراہٹ دیا۔

سنیعہ کی روٹی روٹی آنکھوں اور گلابی ہونٹوں نے یہ حقیقت آشکار کر دی تھی کہ وہ اس کے بیبا سے اس کی شکایت کا فریضہ سرا ختام دے چکی ہے۔

"مس سنیعہ نے آپ کو چائے بھی پلائی یا منگواؤں؟" اس نے مسکراہٹ دیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بس میں چل رہا ہوں۔ احد کی طرف جانا ہے۔" نوحہ بھابھی نے ہادیوں کی شادی کے متعلق کچھ ڈسکس کرنا ہے۔ بیبا جان سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھ گئے تھے۔

"اور سنیعہ کو اس کے گھر ڈراپ کر رہا ہوں۔ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" انہوں نے اسے مطلع کیا پھر سنیعہ کو مخاطب کیا تھا۔ "ٹھوٹا!"

ان کی بات سن کر وہ ایک لمحے کو ہچکچائی تھی مگر پھر اٹھ گئی۔

"میں اپنا بیگ لے آؤں انکل؟" اس نے ہادی سے رسمی اجازت لینے بھی کی ضرورت محسوس نہیں کی

اور دھیرے سے کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

"آپ میرے آفس کا ڈپلن خراب کر رہے ہیں سر! اس نے مصنوعی خفگی جتاتے ہوئے بیبا جان کو مخاطب کیا۔ انہوں نے سگار سلگایا گویا اس کی بات کو سنا ہی نہ ہو۔ ہادی ان کی بے نیازی پر ہنس پڑا تھا۔



"کیا ہوا تھا صبح۔" شام کو آفس سے واپسی پر حسب توقع بیبا کی عدالت میں بیٹھا ہوا تھا۔

"صبح... ہاں چیف منسٹر کے ساتھ میٹنگ تھی۔ وہی اپنے کارنامے بتانے کے لیے بریفنگ کا اہتمام تھا، کوئی نئی بات۔"

"سنیعہ کو تم نے کیوں ڈالنا تھا۔" بیبا جان نے اس کی بات کاٹ کر خفگی سے پوچھا۔

"ڈالنے والی بات یہی ڈالنا تھا۔" وہ کچھ جڑ کر بولا۔

"اور بہت کو ٹیک سروس ہے محترمہ کی نمٹ آپ سے میری شکایت لگادی۔"

"اس نے کوئی تمہاری شکایت نہیں لگائی میں اتفاقاً وہاں جا نکلا تھا۔ زار و قطار رو رہی تھی بے چاری۔" مشی نے بتایا تھا مجھے۔" انہوں نے اس کی غلط فہمی دور کی۔

"تو آپ کو میرا ڈالنا نظر آیا۔" اس کی غلطی نظر نہیں آئی۔ آپ جانتے تو ہیں بیبا جان کہ دو سرے اخباروں کے مقابلے میں ہماری سرکولیشن کتنی محدود ہوئی جا رہی ہے۔ نام کا قومی اخبار رہ گیا ہے ورنہ مقامی سطح کا اخبار لگتا ہے۔ اپنے محدود ترین بجٹ میں ہم مینن زیری جیسے دو تین بڑے ناموں کو اکاموڈٹ کرتے ہیں اور محترمہ کی خواہش ہے کہ ہر لکھنے والا ان کی طرح تحریر کی آواز پر لبیک کر کے لکھے۔"

"ایسے ہی لوگ زمین کا سن ہوتے ہیں ہادی! سچے عمن کے اجلے" اور ٹنڈے اس کا باپ بھی ایسا تھا، ہم مصلحت پسندوں کی دنیا میں چند ایک ایسے سر بچھوں کی ضرورت ہے ہادی! بیبا جان کھوئے کھوئے سے انداز میں بولے۔

”آپ ریاض ہو کر گھر بیٹھ گئے ہیں اس لیے آپ کو ایسی باتیں سوچ رہی ہیں مگر میں نے اخبار چلانا ہے۔“ اس نے انہیں حقیقت بتلائی۔

”ہاں غلط تم بھی نہیں ہو۔“ بابا جان نے گہرا سانس لیتے ہوئے تسلیم کیا۔ ”لیکن پھر بھی میں یہ ہی کہوں گا کہ تمہیں منعہ کو اس درختی سے نہیں ڈانٹنا چاہیے۔ سچی ہے اور بہت حساس بھی۔“ بابا جان نے رسائی سے کہا۔

”مانتا ہوں بابا! مگر اسی کی وجہ سے ہی آج شام میں متین زبیری سے فیملی فونک جھڑپ بھی ہو گئی ہے۔ منعہ صبح کہہ رہی ہے یہ بندہ اب کو اس کے سوا کچھ نہیں لکھتا مگر۔ اور سچ بتاؤں تو اگر منعہ کے ہرٹ ہونے سے آپ کو تکلیف ہوئی ہے تو اس کی گلابی آنکھوں کو دیکھ کر کم ڈسٹرپ میں بھی نہیں ہوا۔“ اس نے جیسے بے پروائی سے اعتراف کیا تھا اور بابا جان تو خوشی سے بے حال ہو گئے۔

”تم کچھ رہے ہو ہادی؟“ اس کی خوشی چھپانے نہ چھپ رہی تھی۔

”کیا متین زبیری سے جھڑپ والی بات؟ آف کورس بابا جان!“

”فوفہ متین زبیری کو گولی مارو۔“ وہ جھنجھلائے۔

”ماری!“ اس نے مسکراہٹ دی۔

”منعہ تمہیں واقعی اچھی لگنے لگی ہے۔“ وہ فوراً سے پیشتر تقدیر چاہتے تھے۔

”لگتا تو یہی ہے بابا جان! لیکن میں نہیں چاہتا کہ وقتی پسندیدگی کے تحت کوئی قدم اٹھاؤں۔“ سمجھے ابھی کچھ وقت چاہیے زندگی کے اتنے بڑے فیصلے یوں اچانک نہیں ہوتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ لڑکی واقعی خاص ہے یا مجھے خاص لگنے لگی ہے یا پھر شاید یہ آپ کی برین واشنگ کا اثر ہے۔ اُئی ایم ٹوٹی کنفیوژڈ۔“ اس نے سچائی سے اپنے دل کی کیفیت بتا دی۔

”کچھ وقت گزرنے دو تمہارے دل کے جذبے خود بخود واضح ہو جائیں گے۔“ انہوں نے اسے محبت سے

دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھنک سی۔“ ہادی نے کندھے اچکا دیے تھے۔

آج ہمایوں کی مندی تھی۔ ہمایوں نہ صرف اس کا بہترین دوست تھا بلکہ اس کے مرحوم والد بابا کے بہترین دوستوں میں سے ایک تھے۔ یہ ہی دوستی اگلی نسل میں منتقل ہوئی تھی۔ نوشابہ آئی، ہمایوں، تانیہ، فراز پوری فیملی سے اس کی بے حد بے تکلفی تھی اور مندی کے فنکشن کو فضولیات گردانے کے باوجود وہ ان سب کے بے حد اصرار پر یہاں آنے پر مجبور ہوا تھا۔ البتہ بابا جان نے مندی کے فنکشن کو بچوں کا فنکشن کہہ کر شرکت سے معذرت کر لی تھی۔ ہاں شادی اور ولیمہ میں اس کی شرکت لازمی تھی۔

اس وقت ہمایوں دلا کے وسیع و عریض لان میں رنگ و بو کا سیلاب لٹا ہوا تھا۔ ہمایوں اس وقت اسٹیج پر بیٹھا اپنے سر ایلیوں کے نرسے میں تھا۔ وہ دور بیٹھا اس کی درگت بٹتے دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ اچھا جھلا فارن کوالیفائیڈ انجینئر گلے میں پیلا دیوڑھے والے عجیب بغلول لگ رہا تھا۔

”ہنس لیں ہنس لیں ہادی بھائی! یہ وقت کبھی نہ کبھی آپ پر بھی آئے گا تانیہ نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا۔ ہمایوں کی کچھوٹی بہن تانیہ اسے بھی ہنسون کی طرح ہی عزیز تھی۔

”ایسی حماقتیں میری پرستاشی سے میچ نہیں کرتیں یار! ہم صرف شادی اور ولیمہ کا فنکشن منعقد کر کے سنت مسنونہ پوری کریں گے۔“ وہ ہنسا تھا۔

”مگر یہ ڈیپلنٹ ہادی بھائی! آج پہلی بار آپ کے منہ سے شادی کا نام سنا گیا شادی پر راضی ہو گئے ہیں آپ۔“ تانیہ چکی تھی وہ اس کی چالاکی پر ہنس پڑا اور ہنستے ہنستے سامنے نگاہ پڑی تو مسکراہٹ کو بریک لگ گئے۔

وہ سو فی صد منعہ ہی تھی مگر اس محفل میں اس کی موجودگی نے اسے حیران کر دیا تھا۔ اس نے تانیہ کو

مخاطب کر کے اس سے پوچھنا چاہا تھا مگر اس سے پہلے ہی تانیہ کسی کے پکارنے پر چلی گئی تھی۔

ہادی دوبارہ منعہ کی جانب متوجہ ہوا، وہ کافی مختلف اور پیاری لگ رہی تھی۔ ہادی کو عموماً لڑکیوں کے چلے اور ڈرنک سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا کسی لڑکی کے ساتھ دو گھنٹے بیٹھنے کے بعد بھی وہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس نے کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے، لیکن منعہ پر ایک اچھتی نگاہ ڈال کر اس پر تپا چل گیا تھا کہ وہ آج زرد رنگ کے جوڑے میں ملبوس ہے۔ اس کے بالوں کی ڈھیل سی چٹیا اور ہاتھوں میں بجرے ہادی نے چند سیکنڈوں میں ہی اس کا ہر پور جائزہ لے لیا تھا اس کی مختصر ترین تعریف یہ ہو سکتی تھی خوب صورت مگر باوقار۔ بابا کی پسند کا جواب بھی۔ وہ اتنی دیر کس لیے کر رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا، تھوڑی ہی دیر میں وہ منظر سے غائب ہو گئی تھی ہادی کو تقریب کے رنگ مانند لگنے لگے لڑکیوں کے جھرمٹ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے تلاش کرنے بجائے ہادی نے تقریب سے رخصت ہونے میں ہی بہتری جانی۔ ویسے بھی رات کافی بیت چکی تھی اس نے اسٹیج پر جا کر ہمایوں سے ”اعطارد رودی“ کیا پھر رخصت کی اجازت چاہی۔

”ٹھیک ہے یار! مصروف بندے ہو، نہیں روکتے تمہیں۔“ ہمایوں اٹھ کر گلے ملا تھا۔

”جبار ہے ہو بیٹا؟“ متین میں نوشابہ آئی بھی ساڑھی کا پلو سنبھالتی ادھر آنکلیں۔

”جی آئی! اب چلوں گا۔“ اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

”مما! یہ فراز کا بچہ جانے کہاں چلا گیا۔ یعنی آپ کی کو چھوڑنے جانا تھا۔“ اتنے میں ہی تانیہ بولتے ہوئے قریب آئی تھی۔

”تو ہادی ڈراپ کروے گا تانیہ کو راسے میں ہی تو رہے گا یعنی کا گھر۔“ نوشابہ آئی نے اطمینان سے کہا تھا اور وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ رات کے اس پہر جانے کس محترمہ کو ڈراپ کرنے کی ذمہ داری سوچی جا رہی تھی۔

وہ انکار کے لیے مناسب الفاظ سوچ رہا تھا کہ نوشابہ آئی نے کسی کو پکار بھی لیا۔

”یعنی بیٹی بیٹا!“ اور چند لمحوں بعد جو صورت قریب آئی تھی۔ اسے دیکھ کر ہادی کو آج کی تاریخ میں حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا تھا۔

”اسلام علیکم سر!“ منعہ کی بھی اس پر نگاہ پڑ گئی تھی جب ہی سلام کیا، پھر نوشابہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”ہاں بیٹا! میں کہہ رہی ہوں کہ تم ہادی کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں یہ ڈراپ کروے گا تمہیں۔“ نوشابہ آئی کو منعہ کے سلام کرنے پر حیرت نہیں ہوئی تھی گویا وہ جانتی تھیں کہ منعہ اسی کے آفس میں کام کرتی ہے۔ لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ وہ نوشابہ آئی کی فیملی اور منعہ کے تعلق سے کیوں واقف نہ تھا۔ آج سے پہلے اس نے منعہ کو کبھی ان کی فیملی تقریبات میں نہیں دیکھا تھا اور نوشابہ آئی کے کہنے پر منعہ کے چہرے پر ایک لمحے کو تذبذب کے آثار نمودار ہوئے تھے لیکن پھر اس نے سر ہلا کر اقرار کر لیا۔

نوشابہ آئی اور تانیہ سے گلے مل کر وہ ہادی کی ہمرانی میں آگے بڑھ گئی تھی۔

گاڑی سبک خرابی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ایڈریس بتانے کے بعد منعہ نے چپ سا دھکی لی تھی۔ ویسے بھی اس روز والے واقعے کے بعد منعہ آفس میں کبھی چپ چاپ کام کیے جاتی ہے تکلفی تو آخر پہلے بھی کبھی نہ تھی لیکن اب اس کی خاموشی میں جھلکتی خفگی ہادی کو زیر لب مسکراتے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اگر بابا کی خواہش کے مطابق اس لڑکی سے کوئی رشتہ استوار ہوا تو روٹنے مٹانے کے سلسلے کی ریکش کرنی پڑے گی۔ اپنے پہلو میں منعہ کی موجودگی آج بہت سے لطیف احساسات کو بیدار کر رہی تھی۔ پندرہ منٹ بعد سفر کا اختتام ہوا تھا۔ ہادی نے اس کے گھر کے سامنے گاڑی روکی۔

سنائے اور تاریکی کی وجہ سے اس نے فوراً ہی گاڑی بھڑکے جانا مناسب نہ سمجھا منعہ بیل دے کر گیٹ کھلنے کی خاطر تھی اور ہادی اس کے اندر جانے کا دو تین منٹ کے انتظار کے بعد گیٹ کھل گیا تھا۔ ہادی نے مطمئن ہو کر گاڑی اشارت کردی لیکن حیرت انگیز طور پر منعہ دروازے کے اندر جانے کے بجائے واپس پٹی۔

”امی کہہ رہی ہیں، آپ چائے پی کر جائیے گا۔“ ہادی کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ کتنا تو چاہتا تھا کہ بی بی لگتا ہے آپ کی امی نے یہ مہنر زب کو نہیں سکھائے۔ وہ مسکراتے ہوئے گاڑی سے اترنا منعہ کی امی سے ملنے میں کوئی حرج تو نہ تھا۔ اس کے پیچھے گھر میں داخل ہو کر اس نے دائیں طرف کھڑی خاتون کو سلام کیا تھا وہ یقیناً ”منعہ کی امی تھیں۔“ ”وعلیکم السلام! جیتے رہو۔“ انہوں نے بہت شفقت سے سلام کا جواب دیا۔

”میں نے ابھی نو شاہ کو فون کیا تھا اس نے بتایا یعنی کو ہادی روپ کرے گا میں نے سوچا چلو اس بھانے تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ویسے تو بہت مصروف بندے ہو تم“ آنے کی فرصت نکالنا مشکل ہے۔

وہ اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی تھیں اور اب بٹتے ہوئے اس سے مخاطب تھیں۔ ان کے بے تکلف انداز پر ہادی نے حیرت سے انہیں دیکھا اور اندر روشنی میں آنے کے بعد اسے اس مانوس لب و لہجے والی شخصیت کے نقوش کھوجنے میں چند بل بھی نہ لگے تھے۔

”آمنہ آئی!“ وہ خوش گوار حیرت میں گھر گیا۔

”پہچان لیا؟“ وہ مسکرائیں۔

”آپ کو تو پہچان لیا لیکن حیرت ہو رہی ہے کہ میں ان محترمہ کو نہیں پہچان پایا۔“ وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

”چودہ پندرہ سال کم عرصہ تو نہیں ہوتا، تمہاری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو وہ بچپن کی بیٹی اور اب کی

منعہ کو پہچاننے میں غلطی کر جاتا۔ بلکہ اگر یعنی بھی تمہیں کہیں سرورادھی تھی تو ہرگز نہ پہچان پاتی۔ ماشاء اللہ کتنے بڑے ہو گئے ہو تم۔ بالکل رضا بھائی کی جوانی کا عکس۔“ وہ اسے محبت سے دیکھتے ہوئے مسکرائی تھیں۔

”لیکن آپ بہت بوڑھی ہو گئی ہیں آمنہ آئی! اتنی کمزور مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔“

”تمہارے سکندر انکل کے انتقال کے بعد میں نے اتنی تو ہمت کر لی کہ زندگی کو کھیت کر یہاں تک لے آئی۔ اگر عینی نہ ہوتی تو جینے کی کوئی امید ہی نہیں بچی تھی۔“ آمنہ آئی کی آنکھیں جھلکنا لگیں۔

ہادی ایک لمحے کو چپ ہو گیا، اس کے ذہن کے پردے پر سولہ، ستر برس پہلے والی آمنہ آئی کی شبیہ لہرائے گئی۔ خوب صورت، مسکراتے، زندہ دل اور ہنس مکھ ان کی اور سکندر انکل کی بے مثال جوڑی بھی ٹوٹ کر محبت کرتے تھے دونوں اسے سکندر انکل شدت سے یاد آئے بابا کے عزیز از جان دوست، انہیں پچھڑے ایک مدت بیت گئی تھی پھر بھی بابا کی یادوں میں وہ زندہ تھے۔

”بچے جوان ہو جائیں تو ماں باپ بوڑھے ہی لگتے ہیں۔“ اسے سوچوں میں گم دیکھ کر آمنہ آئی نے مسکرا کر پھر مخاطب کیا۔ وہ بھی جیسے ایک دم چونکا۔

”ناقابل یقین سی بات ہے آمنہ آئی! آخر آپ کی آمد مجھ سے کیوں چھپائی گئی اور کہاں ہے وہ آپ کی چالاک بیٹی۔ کتنا عرصہ اس نے مجھے بے وقوف بنائے رکھا۔“ اس نے ارد گرد نگاہ دوڑا کر منعہ کو کھوجنا چاہا۔

”ان بلیو ایبل۔“ (ناقابل یقین) اس نے ایک بار پھر خود کلامی کے سے انداز میں سر جھٹکا تھا۔ ”منعہ مجھ سے اتنی اجنبی اور انجان بن کر کیوں ملی آمنہ آئی! آپ لوگوں کی آمد کو خاص طور پر میرے لیے ہی راز کیوں رکھا گیا۔ ابھی ہم اہل انکل کی طرف سے آرہے ہیں۔ وہ لوگ بھی باخبر ہیں۔ بابا بھی یقیناً سب کچھ

جانتے تھے لیکن انہوں نے بھی مجھے صرف یہ ہی بتایا تھا کہ منعہ ان کے کسی مرحوم دوست کی بیٹی ہے۔ سکندر انکل! ”کسی مرحوم دوست“ کی فہرست میں نہیں آتے تھے آمنہ آئی! جن کا نام میری یادداشت سے محو ہونے کی بنا پر بابا نے ان کا تذکرہ ضروری نہ سمجھا ہو۔ سکندر انکل تو بابا کے بھائیوں جیسے دوست تھے۔ ان کے انتقال حتیٰ کہ آپ لوگوں کے ابو ظہبی شفٹ ہونے کے باوجود بھی بابا نے ہمارے سامنے یادوں کے سہارے انہیں ہمیشہ زندہ رکھا۔ میرے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ میرے آفس میں کام کرنے والی منعہ دور حقیقت سکندر انکل کی بیٹی ہے۔ سچ بتاؤں تو سکندر انکل کی بیٹی میرے ذہن میں ہمیشہ سات، آٹھ برس کی بیٹی ہی آتی تھی جس کا اصل نام منعہ تو شاید ڈاکو منٹس کے لیے ہی تھا۔ میرے ذہن سے یہ نام محو ہو چکا تھا لیکن اس نے اپنی شناخت مجھ سے کیوں چھپائی؟“

وہ حیران تھا قدرے ناراض اور الجھا ہوا بھی۔ ذرا دیر پہلے آمنہ آئی کو اچانک دیکھ کر ملنے والی خوشی پر حلقی کارنگ غالب آ رہا تھا۔

”میں تمہیں کیا بڈاؤ دی! بہت لمبی ناک ہے میری بی بی کی۔ وہ ہرگز کسی سفارش کے بل پر جواب حاصل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ وہ تو رضا بھائی سے بھی اس بات پر بھی ناراض ہو گئی تھی کہ انہوں نے اسے تمہارے سامنے اپنے کسی دوست کی بیٹی بھی ظاہر کیوں کیا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر وہ اپنی پہچان ظاہر کر دے گی تو اسے اپنی صلاحیتیں آزمانے کا موقع نہیں ملے گا۔ سکندر کا حوالہ اس کے لیے خود بخود آسانیاں پیدا کر دے گا۔“

”اور آپ اور بابا جان بھی اس کی بے وقوفی میں اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔“ اس نے کچھ حلقی سے انہیں دیکھا۔

”مجبوری تھی بیٹا! ایک بات ہم نے اس کی مانی تو ایک اسے ہماری مانی بڑی۔ ہمیں یہ تو طمینان ہو گیا کہ وہ ہمارا اخباری جوانن کر رہی ہے ورنہ جیسی سر بھی

اور جذباتی وہ ہے، جانے اس کی بے وقوفیوں کے کیا نتائج ہمیں بھگتنے پڑتے۔“ آمنہ آئی کے کہنے پر وہ مسکرا دیا وہ خود بھی تو اسے اس کی بے وقوفیوں سمیت بھگت رہا تھا۔ ”لیکن آج جب مجھے پتا چلا کہ تم اسے چھوڑنے آرہے ہو تو مجھ سے رہا نہیں گیا“ آخر کب تک تم سے نہ ملتی۔“ آمنہ آئی نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

انہوں نے منعہ بھی چائے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوئی۔ ہادی نے ایک نگاہ اس کے خفا سے چرے پر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس پیاری سی لڑکی سے کتنا قریبی تعلق نکل آیا تھا لیکن گزرے ہوئے ماہ و سال نے اتنا فاصلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ بے تکلفی سے اسے عینی کہہ کر مخاطب نہ کر پاتا۔

”بی بی تو مس منعہ! آپ سمجھ رہی تھیں کہ آپ کی شناخت مجھ سے چھپی رہے گی؟“ اس نے ہادی کو چائے کا کپ تھمایا تو وہ اسے مخاطب کرنے سے خود کو روک نہ پایا۔ وہ جیسے زبردستی مسکراتے ہوئے چپ چاپ ماں کے پرلوں میں جا کر بیٹھ گئی۔

”اتنے عرصے تک میں آپ کے کالم پڑھ کر ناحق متاثر ہوتا رہا۔ اب پتا لگا رہا ہے کہ آپ کا طرز تحریر کچھ جانا پہچانا سائیکوں لگتا تھا بالکل سکندر انکل جیسا انداز و بی اسلوب فقروں میں ویسی ہی کٹ۔ اب پتا چلا کہ اس میں آپ کا تو کوئی کمال نہیں بلکہ یہ تو سکندر انکل کی طرف سے آپ کو وراثت میں ملی صلاحیت ہے۔“ وہ اسے چھیر رہا تھا کچھ بولنے پر آسار تھا۔

”اگر آپ کو میرے طرز تحریر میں ابوی جھلک ملتی ہو تو اس آکھیلیمنٹ فارمی سرا“ منعہ نے اس کا داؤالٹ دیا تھا۔

وہ چائے کا سب لیتے ہوئے بے ساختہ ہنس پڑا، آمنہ آئی بھی مسکرا دی تھیں۔



رات گئے وہ گھر لوٹا تھا بابا کے کمرے میں جھانکا وہ

کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔
 ”نام دیکھا ہے آپ نے“ اب تک سوئے کیوں
 نہیں۔“ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکنا۔
 ”ہاں بس سوئے ہی لگا تھا۔ تم ساؤ بہت دیر
 لگاؤی پورا فکشن بھگتا کر آئے ہو کیا؟“ بابا نے حیرانی
 سے استفسار کیا۔ اپنے بیٹے کی طبیعت کا انہیں بخوبی
 اندازہ تھا۔ ایسے بنگاموں سے اس کی جان جاتی تھی۔
 ”نہیں بابا! فکشن سے تو جلد ہی اٹھ گیا تھا، پھر
 یعنی کوچھوڑنے گھر چلا گیا ہاں آمنہ آئی سے گپ
 شب میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔“ اس نے
 نارمل سے انداز میں جواب دیا تھا، لیکن بابا کا چوتنا
 فطری امر تھا۔
 ”وہ کے بابا! گڈ نائٹ آرام کریں رات بہت ہو گئی
 ہے میں بھی خاصا تھک چکا ہوں اب سوؤں گا۔“
 اس سے پیشتر بابا کوئی بات کرنے انہیں بولنے کا
 موقع دینے بغیر ہی وہ پلٹ گیا تھا۔ اس کا یہ نارمل انداز
 شدید ترین خفگی کا مظہر تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے سر
 کھجائے گئے۔ اب باقی رات بیٹے کو منانے کا طریقہ
 سوچنا تھا۔



رضا، احد اور سکندر تینوں بہت گہرے دوست
 تھے۔ بچپن عزیز اور جوانی وقت گزرنے کے ساتھ
 دوستی کا رشتہ مزید انوث ہو گیا۔ حالانکہ تینوں کی فیلڈز
 بالکل الگ تھیں۔ احد سول سروس میں چلے گئے۔
 رضا کے والد بیکس تھے، رضائے کاروبار میں نیا تجربہ کیا،
 مقامی سطح پر اخبار کا اجرا کیا جو جلد ہی قومی سطح پر
 چھپنے لگا تھا اور سکندر تو خیر پھر پور شایب میں ملک کی جالی
 پہچانی شخصیت بن گئے تھے۔ تین خوش قسمت
 دوستوں کی ٹولی میں وہ عزت اور شہرت کے لحاظ سے
 سب سے زیادہ خوش قسمت ثابت ہوئے تھے۔
 کھرے نڈر اور بے پاک صفائی لیکن اپنے وطن سے
 محبت کے معاملے میں حد سے زیادہ جذباتی جس اخبار
 میں جاتے اس کی سرکوشش بڑھ جاتی غمزدگیوں

منسوخ ہونے کا خطرہ ہو جاتا سو حکومتی دباؤ پر اخباری
 مالکان عوام کے اس بے پروا عزیز لکھاری کو اخبار بند کرنے
 پر مجبور ہو جاتے۔ رضائے بہت دفعہ انہیں اپنے پاس
 بلایا مگر وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتے۔
 ”دوستی کو آزمائش میں ڈالنا میں مناسب نہیں
 سمجھتا۔“
 ”تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں۔“ رضا انہیں آنکھیں
 دکھاتے۔
 ”تم پر تو بے غور نہیں، تھک گیا ہوں یا رہا جوانی
 میں جوش تھا، کچھ کر گزرنے کا جذبہ لیکن اب محض
 بہت بڑھ گئی ہے، یوپی چاروں طرف سے گھیر رہی ہے
 ۔ امید کا کوئی سرا ہاتھ نہیں لگ رہا۔“
 وہ آئیڈلسٹ تھے، ملک کے جن حالات کو
 سدھارنے کا عزم ہے کہ قلم تھا تھا ہر کوشش ہر
 کاوش رائیگاں جانی دیکھ کر دل برداشتہ ہوتے جا رہے
 تھے۔
 کتنے برسوں سے وہ ملک کے بنیادی ستونوں سے
 جو کچھ لڑ رہے تھے۔ کبھی طنز و مزاح کا سہارا لے کر
 کبھی کاٹ دار انداز میں، کبھی انتہائی دد مند ہی سے
 ملک کی باگ دوڑ سنبھالنے والے ہاتھوں کو سمجھا رہے
 ہوتے ان کے قلم نے انہیں عوام کے دلوں کی دھڑکن
 تو بتا دیا تھا لیکن ”خواص“ کے لیے وہ درد سر نہ
 جا رہے تھے۔ رضا اور احد دونوں انہیں سمجھانے کی
 کوشش میں ہلکان ہوتے رہتے۔
 ”دیکھو میاں! تم جوانی لیلیٰ کے لیے مجنوں بنے پھر
 رہے ہو، اس میں اتنی شہرت پسندی ٹھیک
 نہیں۔“ احد انہیں سمجھاتے۔ ”لیلیٰ“ سے ان کی مراد
 پاکستان ہوا تھا۔
 ”ملک کے حالات ٹھیک ہونا، صحیح قیادت
 ملنا، نظریاتی طور پر اسے درست ڈگر پر چلانا، نئی نسل کو
 نظریہ پاکستان سے روشناس کروانا، بہت غور طلب
 مسائل ہیں اور تم اپنے طور پر اپنا فرض ادا کر رہے ہو۔
 لیکن خدا کے لیے اتنی نیشن نہ لیا کرو۔“
 ”اور میں تو کہتا ہوں کہ تم جیسے دانش ور جو گیلی

لکری کی طرح سلگتے رہتے ہیں، یہ محض ناشکری کی
 علامت ہے۔ جب اپنا پیٹ بھرا ہوا ہو تو سزا دھڑا دھڑا
 کے مسائل پر سوچ بھی سکتا ہے اور کڑھ بھی سکتا ہے
 ۔ اللہ کا شکر ادا کیا کرو اتنی اچھی بیوی ملی جو تم جیسے خطی
 انسان کے ساتھ گزارا کر رہی ہے۔ اتنی پیاری بیٹی
 ہے۔ اگر گھر یلو سکون نصیب نہ ہوتا تو کاپے کو ملک کے
 مسئلوں کو لے کر آؤ آؤ جی رات تک ٹھٹھٹے سگریٹ
 پھونکتے۔“ رضا بھی ان پر گرم ہوتے۔
 ”کتے تو تم صحیح ہو۔“ وہ بہت محبت سے آمنہ اور
 بیٹی کو دیکھتے۔
 ”وہیے آمنہ بھابھی! اپنے شوہر پر کڑی نگاہ رکھا
 کریں۔ کہتا تو یہ اپنے آپ کو بڑھا ہے لیکن اس کی
 ڈاک چیک کریں عزیزیاں مرنی ہیں اس پر۔“ رضا
 انہیں چھیڑتے۔
 ”میری بیوی کو درد غلامت یہ جانتی ہے میں اس
 سے کتنی محبت کرتا ہوں۔“ سکندر ہنستے ہوئے ان سے
 مخاطب ہوتے۔
 ”جی! میں جانتی ہوں کہ آپ مجھ سے کتنی محبت
 کرتے ہیں۔ میں دنیا کی واحد بیوی ہوں جس کو لو میرج
 کرنے کے باوجود شادی کی پہلی رات یہ سننے کو ملا کہ تم
 میری دوسری محبت ہو۔“ آمنہ مصنوعی خفگی دکھاتے
 ہوئے شکوہ کرتیں۔
 سب ہنس پڑتے۔ جانتے تھے سکندر کی پہلی محبت
 کون ہے اور سکندر خان اپنی اسی پہلی محبت پر قربان
 ہو گئے تھے۔
 بظاہر یہ ایک کار حادثہ تھا لیکن ان کے چاہنے والوں
 کو یقین ہی نہ آ سکتا تھا کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے۔
 جس انداز میں ان کی کار کو ٹکرایا گئی تھی۔ شفاف
 توقیقات کی جاتیں تو شاید ملکی سطح پر ایک بڑے کرپشن
 اسکینڈل کے مرکزی ملزمان تک کھڑے جاسکتے رضا اور
 احد نے تو سازش بے نقاب کرنے کی ہیری کوشش کی
 لیکن آمنہ نے ساتھ نہ دیا۔
 ”رضا بھائی! میں اپنا سہاگ کھو چکی ہوں، مزید کچھ
 کھونے کی ہمت نہیں۔“ وہ غموں سے چور چور

تھیں۔
 پھر کچھ ہی عرصے بعد وہ اپنے والد کے پاس
 ابو ظہبی چلی گئی تھیں ایک ہسپتال گھریلو اجڑا تھا
 جیسے کبھی روئے زمین پر اس کا وجود ہی نہ تھا۔ رضائے
 پختہ دوست کی یادوں کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا۔
 زندگی یوں ہی اتنی ڈگر پر چلتی رہی۔ کبھی مذاق مذاق
 میں ایک دوسرے کو بڑھا کھانے والے سچ بچ بوڑھے
 بوڑھے سے لگنے لگے لیکن جب اولاد جوان اور
 سعادت مند بھی ہو تو بوڑھے وجود میں بھی جوانوں
 جیسی توانائیاں بھر جاتی ہیں۔ ان کا اثاثہ ان کا میٹا ہادی
 رضا ان کی ساری ذمہ داریاں خوشی اپنے کندھوں پر
 منتقل کر چکا تھا۔ چند برس پہلے اپنی رفیقہ حیات کو
 کھونے کے بعد دونوں باپ بیٹا ہی ایک دوسرے کے
 لیے سب کچھ تھے۔
 احد کے سچے بھی جوان ہو چکے تھے اور وہ بھی بہت
 قابل نکلے تھے لیکن احد بھی اولاد کی خوشیاں دیکھنے سے
 پہلے ہی دل کے دورے کے باعث دنیا سے منہ موڑ
 گئے۔
 تین دوستوں کی ٹکون تو کب کی ٹوٹ چکی تھی،
 لیکن اتنے چاروں کی جدائی کا صدمہ سننے کے بعد رضا
 کا خود بھی زندگی پر سے اعتبار اٹھنے لگا تھا۔ وہ جلد از جلد
 ہادی کا کھر سا کر اس کی خوشیاں دیکھنا چاہتے تھے اور
 ویسے بھی عملی زندگی کی ذمہ داریوں سے فراغت پا کر
 ان کے پاس کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ بوٹے، پوتیاں
 کھلانے کی خواہش پر گزرتے دن کے ساتھ قوی سے
 قوی تر ہونی جاری تھی، لیکن ہادی تھا کہ ہمیشہ سنی ان
 سنی کر دیتا۔ رضا جانتے تھے کہ وہ اپنے لیے لڑکی پسند
 کرنے کی فرصت بھی نہیں نکال پائے گا، سو یہ ذمہ
 داری انہوں نے از خود اپنے کندھوں پر منتقل کر لی،
 لیکن سچ تو یہ تھا کہ بیسیوں لڑکیوں کو اس نظر سے دیکھنے
 کے باوجود کوئی بھی لڑکی انہیں اپنے قابل بیٹے کے
 قابل نہ لگی، وہ بہت سلجھا ہوا شخص تھا اور یقیناً کسی
 بہت پیاری اور سلجھی ہوئی لڑکی کا حق دار تھا۔ اپنی
 تلاش میں ناکام ہونے کے بعد جب وہ مایوس ہونے

لگے تو قدرت ان کی مدد کو آئی۔

پندرہ برس بعد ان کے عزیز ازجان دوست کی بیٹی ان کے سامنے تھی۔ منعمیہ سکندر خان، جو ان سب کی پیاری بیٹی تھی۔

کھل کی بات لگتی تھی، جب وہ سرخ و سپید رنگت والی گول مول سی بیٹی جو اپنے رضا انکل کے کندھے سے جھول کر اپنی فرمائش پوری کراتی تھی۔ اپنے جگری دوست کی بیٹی کو اس کی نشانی کاتے برسوں بعد اپنے سامنے دیکھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے برسوں پرانے منظر بھرنے لگے تھے۔ کتنی بڑی، کتنی پیاری ہوئی تھی، اس کی شخصیت میں وہی وقار اور مملکت تھی جو ان کے چھڑے دوست کی شخصیت کا خاصہ

ابو ظہبی میں اتنے برس گزارنے کے بعد آمنہ بیٹی کو لے کر بلا خر وطن لوٹ آئی تھیں۔ ان کے شفیق والد طبعی عمر گزار کر اللہ کو پارے ہو چکے تھے۔ بھائی اپنی اپنی دنیاؤں میں مگن تھے۔ والد اپنی جائیداد کا بڑا حصہ بیٹی اور نواسی کے نام منتقل کر گئے تھے۔ جس کی وجہ سے بھائیوں کے رویے میں مزید بیگانگی از آتی تھی۔ اجنبی سرزمین ہرگز تیرے دن کے ساتھ اجنبی ترین ہوتی جا رہی تھی، پھر یعنی تھی جس کو وطن کی محبت وراثت میں ملی تھی۔ جیسے جیسے وہ شعور سنبھالتی گئی، وطن واپسی کا مطالبہ زور پکڑا گیا۔ آخر بیٹی کی ضد اور حالات کے جبر کے تحت آمنہ پھر پاکستان آگئی تھیں۔ والد کے ترکے میں ملے ہوئے مکان میں منتقل ہوئے اور ازسرنو اس سرزمین پر سیٹ ہونے میں انہیں کس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑا، اگر احد کی بیگم نوشاہی ان کے بچوں اور خصوصاً ”رضا صاحب“ کا تعاون شامل حال نہ ہوتا۔

رضانے ہادی سے ان کی آمد چھپائی تو صرف اور صرف منعمیہ کی ضد کی وجہ سے۔ وہ سکندر کے حوالے کے بغیر اپنی صلاحیتیں منوانا چاہتی تھی اور رضا اس پیاری سی بیٹی کی بات ٹال نہ سکے۔ اس روشن پیشانی والی بچی کو انہوں نے تصور ہی تصور میں کئی بار

ہادی کے پہلو میں کھڑا کر کے دیکھا تھا اور ہر بار یہ خوش کن تصور ان کے دل کو بے پناہ مسرتوں سے ہلکانا کر دیتا۔ وہ اگر سکندر کی بیٹی نہ ہوتی تب بھی ایک آئیڈیل لڑکی تھی اور اب تو اس کی ذات سے جڑا حوالہ ہی اتنا مضبوط تھا کہ انہیں اپنے عزیز بیٹے کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی نہ لگتی۔ انہیں ہادی کی توجہ اس کی جانب مبذول کروانے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ وہ اتنی پیاری شخصیت رکھتی تھی کہ ہادی کا دل بھی خود بخود اس کی طرف کھینچ لگتا تھا اور اب وہ موقع آن پہنچا تھا کہ رضانے ہادی کو حقیقت حال سے باخبر کر دینے کو ہی ہوا، جس کا انہیں خدشہ تھا۔

احد کے بیٹے ہادیوں کی شادی میں ہادی پر حقیقت کھل گئی تھی، وہ خفا تھا۔ بے حد خفا اور یہ خفا اس کا حق تھی، لیکن رضا جانتے تھے کہ یہ عارضی خفا بہت جلد دور ہو جائے گی اور اگلی صبح ناشتے کی میز پر انہوں نے بیٹے کو منانے کا آغاز کر دیا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اتنے عرصے تک آپ نے اس کی شناخت مجھ سے چھپائے رکھی، آخر کیوں پایا!“ بہت دیر تک خاموشی سے منہ پھلائے رکھنے کے بعد آخر اس کی خفا پر افسوس کا رنگ غالب آ گیا تھا۔

”مجبوری تھی یا ر! اس نے تمہارے اخبار کو جو اسٹن کرنے کی واحد شرط یہی رکھی تھی اور میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ میرے مرحوم دوست کی واحد نشانی کسی مشکل یا مصیبت میں گرفتار ہو۔ وہ جذباتی ترین شخص کی اولاد ہے اور بالکل اپنے باپ کا پوتا۔ میں اسے کہیں اور کیسے بھیج جا سکتا تھا اور پھر جلد یا بدیر تمہیں پتا لگنا ہی تھا۔ میں نے سوچا، چلو اس بہانے تمہاری یادداشت کا امتحان ہو جائے۔“

”جی، اور بری طرح فیل ہو گیا ہے آپ کا بیٹا یادداشت کے اس امتحان میں۔“ وہ چڑ گیا۔ پایا جان ہنس پڑے تھے۔

”بالکل بدل گئی ہے پایا!“ اس نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”بہت پیاری ہو گئی ہے نا۔“ وہ شرارت سے مسکرائے۔

”پیاری تو خیر بچپن میں بھی بہت تھی۔“ اس نے ان کی شرارت بھری نگاہیں قصداً ”نظر انداز کی تھیں۔“ پھر اس پیاری لڑکی کی ماں سے بات کر لوں تمہارے لیے؟“ وہ گھما پھرا کر بات وہیں لے آئے، ہادی ہنس رہا تھا۔

”آپ پتھلی پر سرسوں جھا کر دم لیں گے پایا! ابھی مجھے تھوڑا سا تو وقت دیں، اس شاک سے سمجھنے دیں کہ منعمیہ درحقیقت یعنی ہے۔ آمنہ آئی اور سکندر انکل کی یعنی، جس کو بچپن میں دیکھا کرتا تھا، اب وہ دو پونیاں بنائے فراخ اپنے گڑیا سے کھلتی تھی۔ ذہن کو یہ ساری صورت حال قبول کرنے کے لیے ذرا ساتھ دقت دیں۔“ وہ رسائی سے بولا۔

”اب ایسی بھی کوئی انوکھی صورت حال نہیں ہے جس کو تمہارا ذہن قبول نہیں کر رہا، لیکن چلو خیر جیسے تمہاری مرضی۔“ پایا نے گویا ہتھیار ڈال دیے تھے۔



”اور سنائے رضا بھائی! اب آپ ہادی کی شادی کے لٹو کب کھلا رہے ہیں۔“ نوشاہی آئی پایا سے مخاطب تھیں۔ آج ہادیوں کا ولیمہ تھا۔ تقریب میں سب ہی شریک تھے، جب نوشاہی نے رضا کی توجہ اس جانب مبذول کروائی۔

”گیا پوچھتی ہیں بھابھی! اب سے اس نالائق پر زور ڈال رہا ہوں میری مانے بھی تو مجھے تو لگتا ہے اپنے دوستوں کے پاس جانے کی باری بس آنے والی ہے۔ پوتے، پوتیاں کھلانے کی خواہش لیے ہی رخصت ہو جاؤں گا۔“ انہوں نے زبردستی کے جذبات خود پر جاری کیے۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں رضا بھائی! اللہ آپ کو سلامت رکھے اور اولاد کی خوشیاں دکھائے۔“ سب سے پہلے آمنہ ہی اس جذباتی گفتگو کے اثر میں آئیں۔ ”رضا بھائی! کہہ ٹھیک رہے ہیں۔ بچے ہمارے

سمجھانے میں کب آتے ہیں۔ ہادیوں کو دیکھتے پچھلے تین چار سال سے اس کے پیچھے بڑی ہوتی تھی کہ شادی کے لیے ہاں کر دے۔ بیشہ ٹال مٹول کر رہا، لیکن جب خود کو لڑکی پسند آئی تو تین مہینے بھی صبر نہ ہو سکا۔ جھٹ پٹ شادی کروائی۔“ نوشاہی کے لہجے میں ہلکا سا گلہ جھلک رہا تھا۔

ہادی کو ہنسی آگئی، دل ہی دل میں ہادیوں کی بیوی پر ترس بھی آیا تو شاہی آئی ذرا کھینچے مزاج کی خاتون تھیں۔ آثار بتاتے تھے کہ وہ ٹھیک ٹھاک قسم کی ساس ثابت ہوں گی۔

”بس بھابھی! بچے دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہو جاتے ہیں، پھر ان کے اپنے فیصلے، مرنی پسند، اپنی مرضی چلتی ہے۔“ پایا جان نے بھی نوشاہی آئی کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

”واقعی بچے تو دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہو جاتے ہیں۔“ نوشاہی آئی نے ان کی تائید کی اور اسی لمحے ان کی نگاہ کچھ فاصلے پر کھڑی منعمیہ پر پڑی تھی، ان کے لبوں پر پیار بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اور بچیاں دیکھتے ہی دیکھتے کتنی پیاری ہو جاتی ہیں۔ ماشاء اللہ اپنی بیٹی کو دیکھتے۔“ نوشاہی آئی کے کہنے پر سب نے ہی اس جانب دیکھا تھا۔

ہادی کی اس سے آج سلام دعا ہو چکی تھی۔ کچھ دیر آمنہ آئی اور پایا کے پاس بیٹھے کے بعد اسے تانیہ نے اپنی دوستوں سے ملوانے کے لیے بلایا تھا۔ اب بھی وہ تانیہ کی کزنز اور دوستوں کے پاس کھڑی تھی۔ ہادی چند لمحوں کے وقفے سے نگاہیں اس کی طرف اٹھانے پر خود کو مجبور پا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کتنی ملائمت، کتنی معصومیت، کتنی پاکیزگی تھی۔ پتا نہیں وہ باقی لڑکیوں سے واقعی مختلف تھی یا صرف اسی کو لگ رہی تھی، لیکن اب نوشاہی آئی بھی تو کچھ اسی قسم کی بات کر رہی تھیں۔ وہ واقعی سب سے پیاری، سب سے مختلف تھی۔ منعمیہ پر ایک اور نگاہ ڈالنے کے بعد ہادی کو اعتراف کرنا پڑا تھا۔

”اور ہاں آمنہ بھابھی! اس روز مندی کی تقریب

میں تو آپ اتنی نہیں تھیں میں آپ کو بتانا بھول گئی کہ اپنی مسزنگ بہت دیکھی ہے رہی تھیں یعنی میں۔ آج اچھی تھک وہ نظر نہیں آئیں ورنہ میں ملواتی آپ کو ان سے کیا پینڈ سم ہے ان کا بیٹا ہی ایس ایس کر کے فارن سروس میں گیا ہے، اسی کے لیے لڑی دھونڈتی پھر رہی ہیں کوئی ایسی ویسی لڑکی تو ان کی ناک کے نیچے آتی بھی نہیں لیکن اپنی یعنی۔۔۔

نوشہ اتنی جانے کیا کچھ بتا رہی تھیں ہادی نے بے چین ہو کر پلو بولا، اسی لمحے بابا پر نگاہ پڑی وہ بھی آنکھوں میں خفگی سموئے اسی کو تک رہے تھے واقعی مزید دیر کرنا مناسب نہ تھا وہ دل ہی دل میں بابا کی بات سے حقیق ہو گیا تھا۔



”پلیز بابا! مجھے دو چار دن کی مہلت مزید دے دیں“ اس سے پہلے آپ آمنہ آئی سے بات کریں میں خود ایک بار منعہ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ اتنا عرصہ باہر رہی ہے وہاں کسی دوست اپنے کسی کزن سے اس کی کوئی کمینٹ نہ تھیں۔“

گھر اگر حسب توقع بابا نے یہی موضوع چھیڑا تھا؟ جب اس نے رمانیت سے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ذرا سی مہلت چاہی تھی۔

”تم اس پر شک کر رہے ہو، وہ بچی ہرگز ایسی نہیں۔“ بابا جان کو غصہ آ گیا تھا اور ان کی بات سن کر اس نے اسے زیادہ غصہ آ گیا تھا۔

”کیسی بات کر رہے ہیں آپ بابا۔ میں اس پر شک نہیں کر رہا، محض اپنا اطمینان چاہ رہا ہوں کہ کہیں انجانے میں منعہ کے ساتھ زیادتی نہ ہو جائے۔

آمنہ اتنی آپ کے احترام اور لحاظ میں یہ رشتہ جوڑ دیں جبکہ منعہ اس پر راضی نہ ہو۔ شادی زندگی بھر کا بندھن ہے اور یہ معاملے یکطرفہ پسندیدگی سے طے نہیں کیے جاتے۔“

”اچھا بابا! اگر لو اپنی تسلی، لیکن جو کچھ پوچھنا ہے جلد پوچھ ڈالو۔“ اگر بیک صاحب نے اپنے بیٹے کے لیے

پیام ڈال دیا تو آمنہ بھابھی سوچ میں پڑ جائیں گی بہت قابل اور لائق ہے ان کا بیٹا۔“ بابا جان نے اسے جتایا۔ ”میں بھی کچھ اتنا لائق نہیں سر۔“ وہ کچھ خفا ہو گیا بابا جان ہنس پڑے تھے۔



اور دو چار دن کی مہلت گزرے بھی چار چھ دن ہو چکے تھے۔ وہ اب تک منعہ سے اس موضوع پر بات نہ کر پاتا تھا، روز آفس میں آنا سامنا ہوتا تھا، لیکن اتنا خود اعتماد سا بندہ اس معاملے میں خود کو لاپتہ تھا۔ دل میں مضمون باندھنے لگتا، مگر منعہ کے صبح چہرے پر نظر پڑتے ہی الفاظ گم ہو جاتے۔

بابائی بار استفسار کر چکے تھے اور وہ خیالات سے سر کھٹا کر رہ جاتا، لیکن آج اس نے محکم ارادہ کر لیا تھا، چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ منعہ سے دو ٹوک بات کرے گا اور جانے وہ کیا پوچھنے آئی تھی کہ ہادی نے اسے روک لیا۔

”رکے منعہ! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”جی سر! کہیے۔“ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”شاید آپ کو لگے کہ میں پرسنل ہو رہا ہوں، لیکن اگر آپ کچھ دیر کے لیے بھول جائیں کہ میں آپ کا پاس ہوں اگرچہ آپ نے صرف یہی تعلق استوار کر رکھا ہے، پھر بھی ہمارے فیملی ٹرمز نظر رکھے جائیں تو میں ایک انتہائی ذاتی نوعیت کا سوال پوچھنا چاہوں گا۔“ اس نے بے ربط سی تمہید باندھی۔

”پوچھئے سر!“ وہ ذرا سا مسکرائی تو ہادی کی ہمت بندھی تھی۔

”آپ کہیں کمیٹڈ تو نہیں؟“ اس نے پوچھ ہی لیا۔ منعہ نے فوراً نفی میں گردن ہلا دی۔ چند لمحوں کے لیے ہادی کو اگلی بات نہ سوجھ سکی۔

”اب میں جاؤں سر؟“ منعہ نے کچھ لمحوں کے انتظار کے بعد پوچھ ڈالا۔

”منعہ! ہر انسان کے ذہن میں لائف پارٹنر کے لیے ایک خاکہ ہوتا ہے، آپ کے ذہن میں کوئی خاص سوچ، کوئی خاکہ۔“ ہادی نے منعہ کا سوال سنی ان کی کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں سر! میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا تھا۔ ہادی نے ہنکارا بھرا، چند لمحوں کے لیے دونوں کے بیچ پھر خاموشی ور آئی تھی۔ منعہ اس کے اگلے سوال کی منتظر تھی۔

”یہ جاب آپ کا پیش ہے منعہ۔ ایم آئی رائٹ؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”ایس ایس او بی رائٹ سر۔“ مختصر جواب آیا۔ ”کوئی ایسا شخص جس کی ہمراہی میں آپ قلم سے تعلق توڑے بغیر۔“

وہ جانے کس بات کی تمہید باندھ رہا تھا۔ مدھم سی مسکراہٹ نے منعہ کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔ ہادی کی ذریعہ نگاہوں سے وہ مسکراہٹ پوشیدہ نہ رہی تھی، اس سے پہلے وہ کسی قسم کا استفسار کرتا، منعہ نے اپنا گود میں دھرا تھا اس کے سامنے کیا تھا، بائیں ہاتھ کی پٹری انگلی میں خوب صورت سی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے ہادی کا دل ابھ گیا۔

”کل شام رضا انکل ہمارے گھر آئے تھے، کچھ دن پہلے انہوں نے امی کے سامنے آپ کا پوزیشن پیش کیا تھا اور کل شام میری رضامندی جان لینے کے بعد انہوں نے مجھے یہ انگوٹھی پسنادی۔“ اس نے اطمینان سے اگاہ کرتے ہوئے ہاتھ دوبارہ پیچھے ہٹا لیا۔ ہادی کی ہاتھ باندھ ساری تمہیدیں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔

”اب میں جاؤں سر؟“ وہ بظاہر سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

”جی۔“ ہادی اس کے علاوہ کیا کہہ سکتا تھا۔



”بہت دیر سے آئے بیٹا! آج صابر نے کمال کر دیا ہے، ایسا شان دار ڈرنر تیار کیا ہے کہ کھاؤ گے تو انگلیاں

چاٹتے رہ جاؤ گے، بس جلدی سے فریش ہو جاؤ میں کھانا لگوانا ہوں۔“ آفس سے واپسی پر بابا اس سے مخاطب تھے۔

”بھوک نہیں ہے۔“ اس نے ساٹ سے انداز میں جواب دیا بابا نے ذرا چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا بات ہے، کچھ خفا خفا سے لگ رہے ہو۔“ ”کیوں، کیا خفا ہونے کا حق بھی نہیں مجھے۔“ وہ مزید روکھا ہوا۔

”حق تو ہے، مگر وجہ بھی تو پتا چلے۔“ بابا نے رمانیت سے پوچھا۔

”کل آپ آمنہ آئی کے ہاں گئے تھے۔“

”اوہ۔“ بابا کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، بیٹے کی خفگی کی ساری وجہ سمجھ گئی تھی۔

”ہاں بس اتفاقاً، کل شام وہاں چلا گیا تھا۔“

”اور اتفاقاً، ہی میرا رشتہ پیش کر دیا۔“ اس نے ناراضی سے پوچھا۔

بابا نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گویا اس کے بات سے مکمل اتفاق ہو۔

”اور اتفاقاً، ہی آپ کی جیب سے انگوٹھی بھی برآمد ہو گئی، جو آپ نے جھٹ سے منعہ کی انگلی میں پسنا بھی دی۔“ اس نے طنز کیا۔ بابا اس بار اپنی ہنسی نہ روک پائے۔

”اچھا تو ساری ناراضی اس بات پر ہے کہ انگوٹھی میں نے کیوں پسنا لی۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

”پلیز بابا بیٹے مت، آپ کو نہیں پتا کہ آج مجھے آپ پر کتنا شدید غصہ آیا تھا۔ منعہ کو اپنے آفس بلا کر آدھے گھنٹے تک بات کی تمہید باندھتا رہا اور آخر میں اس نے مزے سے اپنا انگوٹھی والا ہاتھ آگے کر کے دکھایا۔ سخت چند محسوس کر رہا تھا، میں اس وقت اپنے آپ کو۔“ اسے وہ وقت یاد کر کے نئے سرے سے نفٹ محسوس ہوئی تھی۔

”غلطی واقعی میری ہے، لیکن تم سوچو میں کب تک تمہارے آفس پر بیٹھا رہتا، وہاں مسز بیک باقاعدہ رشتہ مانگنے آنے والی تھیں اور تمہیں منعہ کی

رضامندی درکار تھی۔ اس کی رائے جانے بغیر تم کوئی فیصلہ نہ کر پارے تھے، تو بس اس کی رائے میں نے جان لی۔ اس نے آمادگی دکھائی، تب ہی انگوٹھی پہنا کر آیا ہوں اسے۔“ بیابانے اسے تسلی دی تھی۔

”بڑی مہربانی آپ کی۔“ وہ جل کر بولا تھا۔

”چھاب چہرے کے بگڑے زاویے درست کرو، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ سب کچھ آگئی آسانی سے ہو گیا، لوگوں کو پسند کی لڑتی ہے شادی کرنے کے لیے کتنے پارہیلے بڑتے ہیں۔“

”جی، کیونکہ سب کے بیابان آپ کی طرح کو آپریٹو نہیں ہوتے۔“ اس بار وہ بھی ہنس پڑا تھا۔

کچھ بھی تھا مسنحہ کا خود سے منسوب ہونے کا تصور اتنا خوش کن تھا کہ زبردستی کی طاری کی گئی خفگی رخصت کرنی پڑ گئی، بیابانے بھی اس کی بات سن کر جان دار قہقہہ لگا دیا تھا۔



آمنہ آگئی نے آج ہمایوں اور اس کی نئی ٹولی دہلی کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا تھا، احمد انکل کی فیملی کے ساتھ بطور خاص اسے اور بیابان کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ بات طے ہونے کے بعد وہ پہلی بار آمنہ آگئی سے ملنے جا رہا تھا۔ اپنی ڈیرے تک پر آج اس نے خصوصی توجہ دی تھی، تیار ہو کر آیا تو بیابانے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے توجہی کلمات سے نوازا تھا۔

”آپ کا بیٹا ہوں، ڈشنگ تو لگتا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے تعریف وصول کی۔

آمنہ آگئی کے ہاں پہنچا تو انہوں نے بہت محبت سے پیشانی چوم کر دعا دی تھی۔

”تقریب کے دو لہا تو تم لگ رہے ہو۔“ ہمایوں نے بھی اسے دیکھتے ہی ہنس کر چیخڑا تھا۔

وہ مسکرا کر رہ گیا۔ متلاشی نگاہیں مسنحہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر کولڈ ڈرنکس پیش کرنے کے لیے وہ نمودار ہو ہی گئی۔ ہلکے رنگ کے اسٹائلش سوٹ میں وہ اپنے معمول کے سادہ سے چیلے کے برعکس کچھ مختلف

اور بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”السلام علیکم سر۔“ نگاہوں کا تصادم ہوا تو مسنحہ کو سلام کرتے ہی بنی ورنہ اس کی مسکراتی نگاہوں سے آج وہ کچھ کنفیو زہور ہی تھی۔

”میں بھی سر، احد ہے یعنی! ہمایوں نے اسے ٹوکا۔

”ہمایوں بھائی پلیز!“ اس نے آنکھوں میں التجا سمو کر اسے دیکھا، گویا مزید چھیڑ چھاڑ سے باز رکھنا چاہ رہی ہو، لیکن آج تو سب ہی بہت مود میں تھے۔

ہمایوں اس کی بیوی رواجو چند ملاقاتوں میں ہی مسنحہ کی بہت اچھی دوست بن چکی تھی۔ اور تو اور اس سے چند برس چھوٹی تائیہ بھی سب ہی مستقل بلکے پھلکے انداز میں دونوں کو چھیڑنے میں لگے ہوئے تھے۔

ہادی تو خیر یہ سب بہت انجوائے کر رہا تھا۔ مگر

مسنحہ کی جان پرین آئی تھی۔ کہاں پرسوں آفس میں وہ گھبرایا گھبرایا سا تمہیں رہا تھا اور مسنحہ لطف لے رہی تھی، لیکن آج معاملہ بالکل برعکس تھا، وہ

آفس والا سنجیدہ مزاج سا ہادی تو لگ ہی نہ رہا تھا۔ اس کی لودیتی آنکھیں مسلسل مسنحہ کو گھیرے ہوئے تھیں۔ بہت حاضر جوابی سے وہ ہمایوں وغیرہ کے فقرے لوٹا رہا تھا، بڑوں کی محفل دوسرے کمرے میں جی تھی، شاید اسی لیے سب اتنے پھیل رہے تھے۔

اللہ کر کے ڈنر اختتام کو پہنچا تھا اور وہ جو سوچ رہی تھی کہ مہمان بس اب رخصت ہوا چاہتے ہیں، رضا انکل نے ایک اور شو شاپ جوڑ دیا۔

”آج سب لوگ اکٹھے ہیں، آمنہ بھابی کیا خیال ہے، منگنی کی باضابطہ رسم نہ ادا کر لی جائے۔“ اس نے

جرائی سے انہیں دیکھا ابھی چار دن پہلے تو وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا کر گئے تھے، لیکن آمنہ نے بھی اقرار میں سر ہلا کر خوش دلی سے رضامندی دے دی تھی۔

”لیکن انکل۔“ وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال ایک اور نفیس سی انگوٹھی برآمد کر چکے تو اس نے پچکپا کر ان سے کچھ کستا چاہا۔

”یعنی آپ! آپ کو کیا اعتراض ہے، بیٹھے بٹھائے دو



قیٹی انگوٹھیوں کی مالک بن رہی ہیں۔“ تانیہ نے اس کی بات شروع ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔
 ”ہاں بیٹی! ایک ہی ہندے کے نام کی دو انگوٹھیاں پہننا شرعی اور قانونی طور پر جائز ہے۔“ ہمایوں نے بھی مسکراہٹ دیتے ہوئے پچھڑا۔
 ”آؤ ہادی! وہاں کھڑے کیا منہ دیکھ رہے ہو۔“ رضا صاحب نے بیٹے کو پکارا۔
 ”جی بابا۔“ وہ فرماں برداری کے ریکارڈ توڑنا قریب آیا تھا۔

انہوں نے اسے انگوٹھی تھامتے ہوئے منعہ کے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس کی تو جیسے دلی مراد رہی تھی۔ منعہ کو گردن بھکانے کے سوا کوئی چارہ نہ بچا تھا۔ ہادی کے کلوں کی مہک اطراف میں پھیل گئی تھی۔ وہ اس کے بالکل قریب بیٹھ چکا تھا۔ تانیہ موبائل ہاتھ میں پکڑے ان کے بالکل سامنے تصویر اتارنے تیار بیٹھی تھی، لیکن اس کے بار بار کہنے کے باوجود منعہ سے گردن نہ اٹھائی گئی۔

”شرائے ہوئے! اچھی لگ رہی ہیں آپ۔“ ہادی نے دھیرے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی پہناتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

مبارک سلامت کا شور مچ گیا تھا۔ منعہ دل کی دھڑکن سنبھالنے میں ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ محض چند دن پہلے جب رضا انکل ہادی کا پروپوزل لے کر آئے تھے تو آمنہ کی بے پناہ خوشی اور غمناکیت دیکھ کر اس نے ہاں کر دی تھی۔ اس کے دل کے اوراق بالکل کورے تھے، ماں اس کے مستقبل کے حوالے سے کتنی پریشان رہتی تھی وہ بخوبی آگاہ تھی، پھر زندگی کسی نہ کسی کے ساتھ تو بسر کرنی تھی۔ ہادی دیکھا بھلا تھا۔ اتنے دن اس کے ساتھ گزارنے کے بعد بھی اس کی شخصیت کی کوئی ایسی خالی جگہ سامنے نہ آئی تھی، جس کو بنیاد بنا کر وہ انکار کرے، پھر اس کی سب سے بڑی اضافی خوبی یہ تھی کہ وہ رضا انکل کا بیٹا تھا۔ رضا انکل جو اس کے پیلا کے عزیز ترین دوست تھے اور پیلا کے حوالے سے ہی وہ اسے کتنا عزیز رکھتے تھے، بالکل ایک شفیق کی

باپ کی طرح۔ منعہ نے ماں کے فیصلے پر دل کی آمادگی کے ساتھ سر جھکا دیا تھا، لیکن چار دنوں میں ہی دل کی آمادگی بڑھ کر پسندیدگی بن گئی تھی اور اب ہادی کے پہلو میں بیٹھے بیٹھے تو دل دھڑک کر ایسے شور مچا رہا تھا کہ وہ خود بھی حیران تھی، شاید جب سے اس نے ہادی کی آنکھوں میں اپنے لیے چلتے جذبے دیکھے تھے تو دل کے کورے کانڈر بہت جلد ہی گرم رہنے لگی تھی، کچھ بھی تھا وہ خوش تھی اور بے انتہا مطمئن۔

وہ جانے اس سے کیا معاملہ ڈسکس کرنے آئی تھی، لیکن ہادی کی متبسم نگاہیں مسلسل اس پر مرکوز تھیں۔ پتا نہیں وہ دھیان سے اس کی بات سن بھی رہا تھا یا نہیں۔

”آپ مجھے کنفیوز کر رہے ہیں سر۔“ آخر اس نے رد ہاسی ہو کر اسے ٹوک ہی دیا۔

”میری بات سنو منعہ! اگر آئندہ تم نے مجھے سر کہا تو میں میرا پیپر ویٹ اٹھا کر تمہارے سر پر دے ماروں گا۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ وہ بے چارگی سے بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”اچھا بتائیے کیا پوچھ رہی تھیں۔“ ہادی کو جیسے اس پر ترس آگیا۔ منعہ نے سکون کا سانس لیتے ہوئے دوبارہ مسئلہ اس کے گوش گزار کیا تھا۔

”تم نے میری پہنائی ہوئی انگوٹھی کیوں اتار دی۔“ وہ چُپ ہوئی تو ہادی نے پوچھا تھا اس بار منعہ کا جی چاہا اس کا اپنا کسی ایک کا سر پیٹ لے۔

”اچھا سوری بھی ویسے ہی ایک بات پوچھ لی تھی، ناراض کیوں ہو رہی ہو۔“ ہادی کو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہنسی آگئی تھی۔

”ہادی! ایلیز آؤس کے ڈپٹن کا خیال رکھیں اور جہاں تک انگوٹھیوں کی بات ہے تو میں بیک وقت دو انگوٹھیاں پہن کر آؤس نہیں آؤسٹی، باری لگالوں گی۔“ آج رضا انکل والی انگوٹھی پہنی ہے، کل آپ والی پہن آؤں گی۔“ اس نے کچھ خفگی، کچھ سنجیدگی سے

ادب دیا تھا اور پہلی بار اس کے لبوں سے اپنا نام سن کر ہادی کا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا، لیکن سامنے بیٹھی لڑکی کے تیور اتنے خطرناک سے تھے کہ خوشی کے اظہار کو دل میں دباتے ہوئے اسے سنجیدگی سے اس کی بات سننی پڑی تھی، اگرچہ دل آؤس کی کوئی بات سننے کے موڈ میں نہ تھا۔ مگر دل غ کے دانے پر دل کو اپنی ہی باتیں کرنے کی خواہش سے دستبردار ہونا پڑا تھا۔

آج بہت دنوں بعد آؤس میں مایین ہمدانی کی آمد ہوئی تھی۔ کچھ عرصے تک وہ میگزین ایڈیٹر کے طور پر یہاں کام کر چکی تھی۔ اس کے والد ریٹائرڈ ہو کر ریٹ تھے۔ وہ ان کی انگوٹھی بیٹھی تھی۔ جتنا عرصہ یہاں کام کیا کام سے زیادہ ہادی میں دلچسپی رہی موصوفہ۔ ہادی کے شک روتے سے دل برداشتہ ہو کر اس نے نوکری ہی چھوڑ دی تھی۔ آج کل ایک نئی چینل پر فیشن اور اسٹائل پر ایک پروگرام کی میزبانی کر رہی تھی اور اس وقت بھی وہ جس طرح ٹائٹ جینز پہنے، ٹانگ پر ٹانگ چڑھانے ہادی کے عین سامنے براجمان تھی تو وہ سوچے باندھ رہا تھا کہ اب وہ بالکل صحیح فیلڈ میں قسمت آزمائی کرنے لگی ہے۔

”بہت دن ہو گئے تھے آپ سے ملاقات کے ہوئے۔ آج میری ریکارڈنگ کا آف تھا، میں نے سوچا، آج آپ سے ہائے پہلو کر لی جائے۔“

”آپ کے آنے کا شکریہ! لیکن شاید میرا میل نمبر ہے آپ کے پاس۔“ اس نے بہت شائستگی سے باور کروایا تھا کہ پہلو ہائے ٹیلی فون پر بھی کی جاسکتی تھی۔

مایین ہمدانی نے واضح طور پر پہلو بدلا تھا۔ اس ہندے کا یہی گریز، یہی رکھائی جہاں اس کے دماغ کا میز گھمانے کا باعث بنتی تھی، وہیں اس ناقابل حصول چیز کی کشش کچھ مزید بڑھ جاتی تھی۔

”نمبر ہاں نمبر تو تھا میرے پاس لیکن جانے پر اپنی رقم کہاں ڈال دی۔ دراصل فینز اتنا تنگ کرتے ہیں کہ آئے روز رقم بدلتی پڑ جاتی ہے۔“ اس نے تراشیدہ

بالوں میں نزاکت سے انگلیاں چلاتے ہوئے کہا تھا۔
 ”ہاں واقعی آج کل کی بیک جزیشن کے پاس فالتو ٹائم بہت ہوتا ہے۔“ ہادی نے سر ہلا کر جیسے اس کی بات کی تائید کی۔

اسی لمحے منعہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ مایین ہمدانی سے کوئی شناسائی نہ ہونے کے باوجود سلام کر کے اخلاقیات بھلائی تھی، پھر ہادی سے کوئی بات پوچھی تھی۔ جتنی دیر تک منعہ اور ہادی نے بات کی تھی، مایین مسلسل منعہ کا جائزہ لینے میں مصروف رہی تھی۔

”تم نے خوب صورت چہرے جانے اخبار کے دفتر میں کیا کر رہے ہیں۔“ منعہ کے کمرے سے جانے کے بعد مایین نے خود کلائی سی کی تھی۔ ہادی نے اس پر صرف ایک نگاہ غلط ڈالنے پر اکتفا کیا۔

”مگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس لڑکی کو اپروچ کر لوں۔ ہمیں فریش چروں کی بڑی تلاش رہتی ہے اور میرے پروگرام میں ایک سگمنٹ کچھ اسی ٹائپ کا ہے، ہم ایسے نئے چہرے سامنے لاتے ہیں جو گرومنگ کے بعد سپر ماڈل تک بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ لڑکی فیس اور فکھ کے لحاظ سے مجھے بہت فوٹو جینک لگی ہے۔“ مایین ہمدانی نے اس بار اپنے مطلب کی ایک نارمل سی بات کی تھی، اسے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ یہ بات ہادی کو اتنی ناگوار کر رہے گی۔ اس کے ماتھے پر ابھرتی شکنیں مایین کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ پاتی تھیں۔

”آپ شاید مانڈ کر گئے۔“

”میں نے تو کیا مانڈ کرنا ہے، اگر یہ آفر آپ منعہ کو کرتیں تب آپ کو بتا چکا کہ مانڈ کرنا گئے کہتے ہیں۔“ ہادی نے زبردستی مسکراہٹ چہرے پر طاری کرتے ہوئے اسے جتایا تھا۔

”اے نہیں! یہ آپ کا وہم ہے ہادی! آپ کو کیا پتا کہ آج کل کی لڑکیاں ایسی آفرز کو کتنی خوش دلی سے قبول کرتی ہیں۔“ مایین نے اسے ہٹتے ہوئے بھڑکایا تھا۔

”اپنے اپنے رجحان اور ذوق کی بات ہے ماہین! ضروری نہیں کہ کسی دوی اسکرین پر نظر آتا آپ کی طرح ہر لڑکی کا خواب ہو اور کم از کم سنعیدہ کا تو ہرگز نہیں! اس کا انڈیکس کچھو کل لیول عام لڑکیوں سے بالکل مختلف ہے مجھے تو زندگی میں پہلی بار اتنی جینٹل لڑکی سے واسطہ پڑا ہے اور آپ کی نظر سے شاید کبھی سنعیدہ کا کالم نہیں گزرا“ ورنہ آپ کی رائے بھی مجھ سے مختلف نہ ہوتی۔“

ہادی نے نکتے آرام سے اسے یعنی ماہین ہمدانی کو جو ایک مشہور سینیما سٹوڈیو جاتی جاری تھی کو عام لڑکیوں کی فہرست میں شامل کر دیا تھا۔ وہ تملائے بغیر نہ رہ پائی تھی۔ لیکن چہرے پر یہ تملہاٹ ظاہر نہ ہونے دی تھی بلکہ ایک بہت دلکش مسکراہٹ چہرے پر سجاکر ہادی کو مخاطب کیا تھا۔

”میں نے پہلی بار آپ کے منہ سے کسی لڑکی کی تعریف سنی ہے“ حیرت تو ہے۔ اس نے معنی خیز انداز میں ہادی کو مخاطب کیا تھا شاید مقصد اسے مزید بتانا تھا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہاء نہ رہی جب ہادی نے اسے خشمک لڑکیوں سے گھورنے کے بجائے مسکراہٹ سے نوازا تھا۔

”لڑکی اگر مگتیز بھی ہو تو اس کی تعریف کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے مس ماہین۔“ وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا اور ماہین ہمدانی کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہونے میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لگا تھا۔



وہ اس وقت رضا انکل کے کچن میں کھڑی اپنی ڈش کو احتیاطی شکل دے رہی تھی۔ کتنی بار رضا انکل اس سے شکوہ کر چکے تھے کہ وہ کبھی بھی گھر نہیں آتی۔ ”بیٹے اور کچھ نہیں تو کم از کم کبھی کھار آکر اس صابر کو ہی کچھ پکانا سکھا جایا کرو۔ جب تک تم رخصت ہو کر نہیں آتیں کھانا تو صابر کے ہاتھ کاٹی ہے، لیکن سچ کہوں تو جب سے آمنہ بھابی اور تمہارے ہاتھ کا کھانا

شروع کیا ہے صابر کے کھانے مزید بد مزہ لگتے ہیں“ حلق سے نیچے ہی نہیں اترتے۔“ انکل کے کہنے پر وہ ہر بار مسکرا کر باہی بھر لیتی، لیکن ابھی تک یہ وعدہ وفا کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ آفس کے بعد ہادی بھی سیدھا گھر ہی جاتا تھا اور اس کی موجودگی میں وہ وہاں جانے کی ہمت نہ کر پاتی تھی۔ لیکن آج ہادی کا شیڈول ایسا تھا کہ وہ با آسانی رضا انکل سے ملنے جاسکتی تھی۔ ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں شرکت کے بعد اس نے ایک ایمری ایس کے بھائی کی دعوت دیکر بھی ایڈنڈ کرنی تھی، یعنی اس کی واپسی رات گئے متوقع تھی۔ اس نے آمنہ کو فون کر کے بتا دیا کہ آفس سے وہ سیدھی رضا انکل کے جائے گی۔

حسب توقع رضا انکل اس کی سرپر از آمد پر بے پناہ خوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی صابر کو اس کے لیے ہر تکلف سی جائے کے اہتمام کا آرڈر دیا تھا۔ ”نہیں انکل! اچائے کی بالکل طلب نہیں ہے“ البتہ بھوک لگ رہی ہے۔ میں کچن میں جا کر کچھ مزے دار سیتا رہی ہوں، پھر دونوں مل کر ڈنر کریں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

”میرے بیٹے کو جب علم ہو گا کہ میں نے آتے کے ساتھ ہی تمہیں کچن میں گھسایا تو خوب خفا ہو گا مجھ پر لیکن چلو خیر ہے تمہارے ہاتھ کے مزے دار سے کھانے کے بعد اس کی ڈائنٹ کھانا اتنا منگنا سودا نہیں۔“ انہوں نے پیرہلاتے ہوئے گویا اسے کچن میں جانے کی اجازت دی تھی۔

وہ ہنستے ہوئے کچن میں آئی۔ جو بے تحاشا شفقت اور محبت رضا انکل اس پر لٹاتے تھے کچھ اس کا بھی تو فرض تھا! انہیں خوش کرنا اور سچ تو یہ تھا کہ وہ خود ان سے بے حد محبت کرنے لگی تھی وہ اسے پیلا کا دوسرا روپ لگتے تھے۔ ان کی عثمانی کالے بخولی احساس تھا۔ اگر ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید رونا رنگ ہونے والے اپنے مگتیز کا خیال دامن گیر نہ ہوتا تو وہ ہر دوسرے دیر سے دن رضا انکل سے گپ شب لگانے آسکتی تھی۔ آفس سے بمشکل دس منٹ لگتے تھے

یہاں آنے میں لیکن ہادی کی موجودگی کی وجہ سے جھجک اڑے آجاتی تھی۔ آج چونکہ ہادی کی غیر موجودگی یقینی تھی سو وہ اطمینان سے یہاں آگئی۔

ضرورت کی ہر چیز فریج سے برآمد ہو گئی تھی صابر نے مسالوں وغیرہ کے بارے میں تھوڑی سی رہنمائی لے کر اس نے اسے بھی کچن سے بھیج دیا۔ بالوں کو جوڑے کی شکل میں لیٹے، آستینیں موڑے وہ بہت مگن ہو کر کھانا کھا رہی تھی۔ پچھلے ڈنر کے کھٹے میں رضا انکل پانچ پچھ بار آکر کچن میں جھانک چکے تھے۔

”تبی مزے کی خوشبو آ رہی ہے، کچھ پکھلائی دو۔“ ان کے منہ میں پانی بھر رہا تھا۔

”آپ ڈائننگ ٹیبل پر جا کر بیٹھیں، میں ابھی کھانا لگاتی ہوں۔“ اس نے انہیں اطمینان دلایا، لیکن دو منٹ بعد ہی قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دی۔ رضا انکل سے واقعی صبر نہ ہو رہا تھا اسے ہنسی آئی۔

”یہ لیں جناب! کھانا واقعی تیار ہو گیا اور میرے حساب سے تو سب کچھ بالکل پرفیکٹ بنا ہے۔ اگر آپ کو بھی پسند آیا تو آپ سے منہ مانگی چیز لیں گی۔“ اس نے بہت مان اور بے تکلفی سے انہیں مخاطب کیا تھا۔

”سب سے قیمتی چیز میرا دل تو لے ہی چکی ہیں آپ، مزید کیا لینا چاہتی ہیں۔“ مسکراتے ہوئے اس نے فوراً ”مزہ کچھ دیکھا تھا۔ سینے پر ہاتھ لیٹے بہت محبت بھری نگاہوں سے وہ اسے تنگ رہا تھا۔

”میں سمجھی رضا انکل ہیں۔“ وہ قدرے بوکھلائی۔ ”اگر رضا انکل ہوتے تو ان کا بھی تو چھ فٹ کا بیٹا اپنے قابو میں کر لیتی ہیں اب اور کیا چاہیے؟“ ”آپ کو تو اس ٹائم عطا الہی صاحب کی کتاب کی تقریب رونمائی میں موجود ہونا چاہیے تھا۔“ اس نے ہادی کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔

”خاتون! میرے آفس میں کام کرنے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں آپ۔ میرا ٹائم ٹیبل اگر آپ کے علم میں ہوتا ہی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ میری غیر موجودگی غنیمت جان کر یہاں کا رخ کریں۔ آفس

میں کوئی کام کی بات کرنے نہیں دیتیں اور اب گھر آئی ہیں تو وہ بھی جیسے ہے۔“ ”آپ کے شکوے میری سمجھ سے باہر ہیں ہادی!“ سنعیدہ کو ہنسی آئی۔

”بہت اچھا لگ رہا ہے، تمہیں یوں اپنے گھر میں دیکھ کر۔“ ہادی نے بہت محبت اور محبت سے اسے دیکھا تھا۔

”چھابیں اب راستہ دس، انکل کو بہت بھوک لگی تھی، میں میز پر کھانا لگا رہی ہوں۔“ سنعیدہ نے اپنے دل کی منتشر ہوئی دھڑکن سنبھالی تھی۔

ہادی مسکراتے ہوئے ایک طرف ہٹ گیا، لیکن دل میں سوچ لیا تھا کہ بابا سے کسے گا کہ وہ اسے پیاری سی لڑکی کو اس گھر میں مستقل طور پر لانے کا بندوبست کریں۔



”پھر سنعیدہ کیا سوچا ہے آپ نے؟ سوچ لیں ایسے گولڈن چانس بار بار نہیں ملتے۔“ اپنے بالوں میں مخصوص اسٹائل سے انگلیاں چلاتے ہوئے یہ ماہین ہمدانی بھی جواس وقت سنعیدہ کے ڈرائنگ روم میں موجود تھی۔

”دیکھیں ماہین! میں فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکتی، مجھے سوچنے کا ٹائم چاہیے۔“ اس نے رسائیت سے کہا۔

”سوچنے کا ہی تو ٹائم نہیں ہے مس سنعیدہ! ہمیں جلد از جلد ایک اینٹیکو پرسن کی ضرورت ہے۔ صاحت گل کو ہم نے بمشکل دو چار پروگراموں کے لیے روک رکھا ہے۔ مینے کے آخر میں ان کا امریکہ جانا تقرر ہے۔ آپ کے کالم کی ٹیکسی زبان عوام میں اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور پسندیدگی ہمیں آپ کی طرف متوجہ لائی، ورنہ ایک چلتا ہوا پروگرام نئے ہوٹ کو سونپنا بہت بڑا رسک ہے، لیکن ہم یہ رسک لینے کو تیار ہیں۔“ ماہین ہمدانی کے ساتھ بیٹھے آصف شہانہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ بی بی کا ایک مشہور

پروڈیوسر تھا۔

”آپ کی بات صحیح ہے، لیکن پھر بھی مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا سا توجہ دینا چاہیے۔“ وہ متذہب تھی۔
”مس سمنیہ! میں آپ کو یہ بھی تو سمجھا رہا ہوں۔“ آصف شاہ نے دوبارہ کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن مایہ نوری نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔
”اوکے سمنیہ! آپ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں، ہمیں ایسی بھی کوئی ایمر جنسی نہیں۔“ اس نے مسکراہٹ چہرے پر سجائی تھی۔ سمنیہ بھی سر ہلاتے ہوئے مسکرا دی۔

”میں تمہارے عشق میں ایسی بھی کوئی مری نہیں جا رہی تھی ہادی رضا! عام سے بندے تھے تم میری نظر نے تمہیں خاص بنایا، لیکن مایہ نوری اتنی عام نہیں تھی جتنی تم سمجھ بیٹھے۔ ہاں تمہیں حاصل کرنا چاہا تھا میں نے، تمہیں پانے کے لیے، اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے میں نے کوشش ضرور کی تھی، لیکن جانے تمہیں اپنی شخصیت، اپنی وجاہت پر کیسا غم تھا کہ مایہ نوری کی توجہ اور التفات کو تم نے درخور اعتنا نہ جانا۔ وہ عام سی لڑکی تمہارے لیے خاص الخاص بن گئی، جس کا اسٹیکو سٹیل کیول بہت بلند ہے اور وہ ان عام لڑکیوں سے بالکل مختلف ہے، فی وی اسکرین پر نظر آتا جن کا خواب ہوتا ہے۔ میرا خود سے وعدہ ہے ہادی رضا! کہ اس لڑکی پر تمہارا بے پناہ مان تو ذکر رہوں گی، چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی حربہ آزمانا پڑے۔“

”پھر بتائیے نا می! آپ کا کیا خیال ہے۔“ اس نے آمنہ کے سامنے مایہ نوری کا پروڈیوسر رکھا تھا۔
”میں کیا بتاؤں بیٹا تم اپنے رضا انکل اور ہادی سے مشورہ کرو۔“ آمنہ نے جو رائے مناسب سمجھی دے دی۔

”ظاہر ہے ان سے بھی مشورہ کروں گی، لیکن

فی الحال تو میں یہ آفر قبول کرتے ہوئے خود بھی ڈبل مائنڈ ہو رہی ہوں، اخبار میں کالم لکھنا اور بات ہے اور کیریئر کا سامنا کرنا میرے لیے کافی مشکل کام ہے، پھر سوچتی ہوں کہ اپنے مقصد کے لیے الیکٹرونک میڈیا کی طاقت استعمال کرنے کا تدارق موع ہے۔ بیابا کے زمانے میں میڈیا آزاد نہیں تھا، لیکن اب میڈیا بہت تیز اور فیل ہے۔ خصوصاً ”الیکٹرونک میڈیا“ اور میں اس کی پاور استعمال کرتے ہوئے حق اور سچ کی جنگ لڑنا چاہتی ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے، یعنی! تم اس لڑکی کو انکار کرو۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ سیدھا سا پروگرام ہوگا، سیاست دانوں سے انٹرویو وغیرہ کرنے ہوں گے، لیکن بی بی تمہارے ارادے تو خطرناک ہیں۔“ آمنہ کے انداز پر اسے ہنسی آگئی تھی۔
”آؤہ ای! محاورہ نا! کہا ہے ایسا بھی میں کوئی خود کش دھماکہ نہیں کرنے جا رہی۔“

”تمہارے پیلا بھی ایسے ہی محاورے بولتے تھے۔“ آمنہ کی آنکھیں مرحوم شوہر کو یاد کر کے نم ہو گئی تھیں۔

”پیلا واقعی بہت جی دار تھے ای! جان ہتیلی پر رکھ کر جینے والے، لیکن میں ہرگز بھی پلاپتی بننا نہیں۔ شاید لڑکی ہوں اس لیے جان سے زیادہ عزت پیاری ہے۔“ اس نے گہرا سانس اندر کھینچا تھا۔
”چھاجو بھی ہے، ہادی کی اجازت اور مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرنا۔“ آمنہ دور اندیش ماں تھیں۔

”آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ وہ واپس آجائیں ان سے پوچھ کر ہی فائل فیصلہ کروں گی۔“ اس نے ماں کو تسلی دی۔ ہادی آج کل ایک سرکاری ڈبلی کیشن کے ساتھ ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس کی واپسی پر ہی اس سے تفصیلی بات کرے گی۔ دو دن بعد اس کی واپسی تھی۔

آج شام کو کوئی سرکاری مصروفیت نہ تھی۔ اس

نے اپنے وفد کے ساتھ خوب سیر پانا کیا تھا، رات گیارہ بجے تھک ہار کر وہ ہوٹل میں اپنے کمرے میں پہنچا تھا۔ پیچھے کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ موبائل فون بجتے لگا۔ دوسری طرف مایہ نوری تھیں۔
”جی مایہ نوری کیسے یاد کیا۔“ اس نے سنجیدگی اور حیرت سے دریافت کیا۔

”سوری ہادی! آپ کو ڈسٹرب کیا، اصل میں مجھے سمنیہ کا نمبر چاہیے تھا، جو نمبر اس نے مجھے دیا وہ آف جا رہا ہے، میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے آپ کے پاس اس کا کوئی دوسرا کنٹیکٹ نمبر ہو تو آپ سے لے لیتی ہوں۔“

”آپ کو سمنیہ کا نمبر کیوں چاہیے؟“ اس نے اچھے سے پوچھا۔

”مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ سمنیہ نے آپ سے ذکر کیا ہوگا ہماری آفر سے متعلق۔“

”کیسی آفر؟“ وہ واقعی الجھ گیا تھا۔
”وہ یعنی اس نے ابھی تک آپ سے ذکر نہیں کیا۔ دراصل آصف شاہ کو اپنے پروگرام کے لیے ایک اینکو پرنٹ کی ضرورت ہے، صحافت کل پر پروگرام کر رہی تھی، لیکن وہ امریکہ جا رہی ہے، شاید مستقل طور پر ہی۔“

”تو پھر؟“ ہادی نے ٹھنڈے لہجے میں دریافت کیا۔
”دراصل آصف شاہ بہت متاثر ہوئے سمنیہ سے، اس کے کالز پر قاعدگی سے دھناتے، اس کا خیال ہے کہ سمنیہ میں نہ صرف پروگرام بہت اچھی طرح چلانے کی صلاحیت ہے بلکہ اس کا سب سے پس پوائنٹ یہ ہے کہ اس کا چہرہ بہت فوٹوجنک ہے، ایک عجیب سی سادگی اور معصومیت ہے اس میں، آصف کہہ رہا تھا کہ تیز طرار اور خراٹ قسم کی اینکو زدیکھ کر عوام اوب چکے ہیں سمنیہ کی صورت میں لوگوں کو بالکل فریش چہرہ دیکھنے کو ملے گا، ایک دم بری اور الو سنٹ۔“ مایہ نوری بہت سوچ سمجھ کر لفظوں کا چناؤ کر رہی تھی۔ تصور کی آنکھ سے وہ ہادی کا غصے سے سرخ پڑنا چہرہ دیکھ سکتی تھی۔ کتنا لطف آ رہا تھا اسے

اس وقت۔

”سمنیہ نے آپ کو کیا جواب دیا۔“ ہادی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”وہ تو تقریباً راضی ہے، کل جب میں اور آصف شاہ اس کے گھر گئے تھے تو ذیلی بات ہوئی تھی، آج اس سے پوچھنا تھا کہ وہ ایگریمنٹ کب سائن کرے گی، لیکن اس کا نمبر ہی آف جا رہا تھا۔“

”سمنیہ کا ایک ہی نمبر ہے، آپ پھر ٹرائی کر لیجئے گا۔“ ہادی نے خشک لہجے میں کہہ کر موبائل آف کر دیا تھا۔

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ ہادی واپس آجائیں تو میں ان سے مشورہ کر کے آپ کو جواب دوں گی۔“ فون پر مجھ سے کھل کر بات نہیں ہو پائی۔ ان شاء اللہ کل وطن واپس پہنچ جائیں گے، پھر میں آپ کو بتا دوں گی۔“ اس نے راسنیت سے جواب دیا۔

”دیکھو سمنیہ! تم نے انکار کرنا ہے تو کرو۔ ہادی کو سچ میں کیوں لارہی ہو، میں جانتی ہوں وہ تمہیں ہرگز اجازت نہیں دے گا۔ وہ میل شاؤنزم پر یقین رکھنے والا شخص ہے، ہرگز نہیں چاہے گا کہ اس کی حقیریت اس کی سرپرستی کے بغیر اپنی الگ سے شناخت بنائے۔“
”ارے نہیں مایہ نوری! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔“ سمنیہ ہنس پڑی تھی، ”مایہ نوری اس سے زیادہ زور سے ہنسی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں، ہادی بہت لبرل شخص ہیں۔“ اس نے نرمی سے اس کی تردید کی تھی۔
”چھاجو بات کر کے دیکھ لو اس لبرل شخص سے جو کہ میرے خیال میں توفضول ہی ہے۔ اپنی وہ مائنڈ مت کرنا میں گلی لپی رکھنے کی قائل نہیں، جو دل میں ہوتا ہے وہ ہی منہ پر آجاتا ہے۔ ہادی کے متعلق جو رائے تھی وہ میں نے ظاہر کر دی، اگر تمہیں برا لگا تو سوری۔“

”نہیں مجھے برا نہیں لگا، لیکن کاش میں آپ کی غلط

”غلط فہمی میری نہیں ڈیر! تمہاری دور ہوگی، اوکے چلتی ہوئی، ٹیک کیر۔“ مایین ہمدانی کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی تھی۔



ہادی یقیناً ”گھر بچ چکا ہوگا“ وہ آفس سے واپسی پر سیدھی رضا انکل کے پاس چلی گئی، مقتدر رضا انکل اور ہادی سے مشورہ کرنا تھا۔ حسب توقع ہادی گھر پر ہی تھا۔ دونوں باپ، بیٹا لان میں چائے پی رہے تھے۔ رضا انکل اسے دیکھ کر خوشی سے چل اٹھے تھے۔ البتہ ہادی کے تاثرات کچھ عجیب سے تھے، بہت سنجیدگی سے اس نے سلام کا جواب دیا تھا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ وہ پوچھے بنانا رہ پائی۔

”ہاں طبیعت کو کیا ہونا ہے۔“ اس نے سیٹ سے انداز میں کہا۔ رضا انکل نے بھی اس کے اس انداز پر گھور کر دیکھا تھا۔ البتہ بولے کچھ نہیں۔ ”سنیہ ہادی کو اس کی غیر موجودگی میں ہونے والے دفتری امور سے آگاہ کرنے لگی۔“

”مایین ہمدانی آصف شاہ کو لے کر تمہارے پاس آئی تھی۔“ ہادی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ ”جی“ میں اصل میں آپ سے اور رضا انکل سے اس بارے میں ہی مشورہ کرنے آئی تھی، وہ لوگ کہتے۔“

”اوکے“ میرا مشورہ یہ ہے کہ ابھی میرے سامنے فون کر کے انہیں انکار کر دو۔“ ہادی نے جس تیزی سے اس کی بات کالی تھی، وہ اس کے انداز پر ششدر رہ گئی۔

”لیکن ہادی! آپ میری پوری بات تو سنیں۔“ اس نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا۔

”تم نے مشورہ مانگا تھا“ میں نے دے دیا۔“ ہادی کا اس کی بات سننے کا قطعاً کوئی موڈ نہیں تھا۔ ”یہ مشورہ نہیں حکم ہے۔“ وہ روہاسی ہو کر بولی۔

”اگر یہ حکم ہے تو تم بھی تو مشورہ مانگنے کی فارم سلیٹی پوری کرنے آئی ہو۔ سارے فیصلے تو کر چکی ہو تم۔“ گٹر ٹیکٹ سائن کرنے کے لیے کہاں بلایا ہے انہوں نے۔“

”ہادی! یہ تم سنیہ سے کس لمحے میں بات کر رہے ہو؟“ صورت حال کا پوری طرح علم نہ ہونے کے بعد اس بار رضا صاحب نے بیٹے کو ڈپٹ دیا تھا۔ ”بابا بلیز! جب آپ کچھ جانتے ہی نہیں تو بولے بھی مت۔“ وہ غصے کے عالم میں شدید بدخفاظ ہو گیا تھا۔

”میں جاری ہوں انکل۔“ سنیہ کی آنکھیں پانی سے لبریز ہو گئی تھیں۔ رضا انکل اسے روکتے رہ گئے، مگر وہ نہ رکی تھی۔

”آپ جانتے ہیں نا آصف شاہ کس قماش کا آدمی ہے، اس کا پروگرام صباحت گل جیسی لڑکی تو کر سکتی ہے جو اس کے سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے قہقہہ لگاتے۔ میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ سنیہ اس جیسے آدمی کا پروگرام کرے۔“ اگر اسے کوئی ٹاک شو کرنا ہی تھا تو مجھے گنتی میں کسی معیاری چینل پر کام دلوا دیتا اسے۔ آپ کو اس چینل اور اس بندے کی شہرت کا اچھی طرح علم ہے تو اور محترمہ سارے معاملات خود طے کر کے ایگزیکٹ سائن کرنے لگی ہیں۔“ سنیہ کے جانے کے بعد وہ بابا کے سامنے برس پڑا تھا۔

”تمہیں کس نے کہا کہ وہ ایگزیکٹ سائن کرنے لگی ہے؟“ بابا نے محل سے پوچھا۔

”آف کورس مایین ہمدانی سے پتا چلا۔ وہ بھی اسی چینل پر ایک گھنٹا سا پروگرام کر رہی ہے، کل رات اسی نے مجھے فون کر کے بتایا تھا“ آج دن میں پھر اسی کا فون آیا تھا۔“

”تم اسے محل سے سمجھاتے کیوں نہیں سمجھتی تمہاری بات۔“ کتنا روڈی لی ہو گیا تم نے اس کے ساتھ وہ بھی میرے سامنے۔“ بابا کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اس کے کان مروڑ دیں۔

”سوری بابا! لیکن مجھے غصہ آ گیا تھا اس پر میں ملک سے باہر گیا تھا۔“ دینا سے تو نہیں، وہ ایک بار فون پر ہی مجھ سے مشورہ کر سکتی، میں جانتا ہوں کہ شخص فی وی اسکرین پر نظر آتا، سنیہ کے لیے کوئی چارمنگ نہیں ہے وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ یہ فورم استعمال کر کے اپنے نظریات اپنی بات زیادہ مؤثر طریقے سے عوام تک پہنچانے کی مخصوصا“ پوری پاکستانی ہوتھ کے نظریاتی قبضہ کی دوستی کی ذمہ داری محترمہ نے از خود اپنے کندھوں پر عائد کر رکھی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی کہ جن لوگوں کو وہ جوان کر رہی ہے ان کا برے سے کوئی نظریہ ہی نہیں، ان کا واحد مقصد پیسہ کمانا ہے اور پھر وہ آصف شاہ ایک نمبر کا بلیک میلر صحافی ہے، پہلے جس اخبار سے تعلق تھا تب بھی سیاست دانوں کی گزارشیاں قابو کر کے انہیں پریشان کر رکھا تھا اور اب فی وی پر بھی یہی کام کر رہا ہے۔ وہ سنیہ کو استعمال کرے گا، اس کے منہ سے اپنی مرضی کی باتیں کھولے گا وہ خود کمرے کے پیچھے ہوتا ہے۔ سنیہ خواہ مخواہ مقتدر حلقوں میں معقوب ٹھہرے گی۔ اس چینل کا کوئی معیار ہے نہ اخلاقی ساکھ۔“ وہ جو دلنا شروع ہوا تو لٹا ہی گیا۔

”سنیہ بے چاری کو کہاں ان صبا باتوں کا علم ہوگا۔“ بابا کی نظروں میں وہ اب بھی بے قصور تھی۔

”تو میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ اسے یہاں کے لوگوں، یہاں کی چیزوں کے بارے میں ابھی کچھ علم نہیں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن تو اسے ہوئے نہیں یہاں آئے ہوئے اسے یہاں کے لوگوں کی خصلت کا علم ہی نہیں، وہ سب کو اپنی طرح سمجھتی ہے سچا اور کھرا۔“ ”تم اسے نرمی سے سمجھاؤ وہ مان جائے گی، مجھے تمہاری باتوں سے اتفاق ہے لیکن تمہارے رویے سے اختلاف ہے تم نے سچی کو بہت ہرٹ کیا۔“

”مانتا ہوں۔“ دل کی بھڑاس نکال لینے کے بعد اسے بھی اپنے رویے کی درستی کا احساس ہو گیا تھا۔

”میں سوری کر لوں گا اس سے۔“ اس نے دیکھے سے لہجے میں بابا کو یقین دہانی کروائی تھی۔



”اگر ہادی اجازت نہیں دے رہا تو کوئی ضرورت نہیں ایگزیکٹ سائن کرے گی۔“ آمنہ نے اس دو ٹوک انداز میں باور کرا دیا تھا۔

”پلیز ای! آپ تو ایسی بات نہ کریں۔ ابھی میری صرف ایجنٹس ہوتی ہے۔ زندگی کے فیصلے فی الحال خود کرنے کا اختیار رکھتی ہوں میں۔“ وہ ہادی کے رویے سے بہت دل برداشتہ ہوئی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی زندگی کا مالک بن بیٹھا ہے۔ ”پیار، محبت کے سابقہ دعوے اسے لفظی کے سوا کچھ نہ لگ رہے تھے۔“

”ہادی کبھی بھی تمہارے لیے غلط نہیں سوچے گا۔ اس کی رائے کا احترام کرو سنیہ!“ آمنہ اسے سمجھانے کی کوشش میں بلکان ہوئے جارہی تھیں۔ وہ اس بار چپ رہی نہ مال کو تسلی دی کہ وہ ان کی بات مان لے گی اور نہ بات ماننے سے انکار کیا اور آمنہ اس کی خاموشی پر متوحش اور متفکر تھیں۔



”پھر اپنا فاسٹل فیصلہ بناؤ سنیہ! ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے آصف شاہ تو پہلے ہی اتنی دیر کرنے پر تیار ہوا ہے۔ اس نے تمہارے بابا کے حوالے سے چینل پر خبر بھی چلوادی ہے کہ ماضی کے نامور صحافی سکندر خان کی صاحبزادی بہت جلد ہمارا چینل جوائن کر رہی ہیں اب اگر تم انکار کرو گی تو اس سے ہماری کریڈیبلٹی متاثر ہوگی۔“ مایین ہمدانی اس پر دباؤ ڈال رہی تھی۔

”دیکھئے مایین! میرے اقرار سے پہلے آپ لوگوں کو ایسی کوئی خبر چلائی ہی نہیں چاہیے تھی میرا اس میں کوئی دوش نہیں۔“ وہ مایین ہمدانی کے دباؤ میں نہ آئی تھی۔

”ویل تو تمہاری طرف سے انکار ہے۔“ مایین ہمدانی نے ٹھنڈا سا سانس بھرا۔

”جی بالکل میرے لیے یہ آفر قبول کرنا مشکل ہے۔ آپ اپنے چینل والوں سے معذرت کر لیجئے۔“

گا۔ ”منعہ کا چہرہ مست ہوا تھا مابین ہمدانی نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔

”مجھے پتا تھا تمہارا جواب یہی ہوگا ان فیکٹس تمہارے اس کھڑوس منگیتر کی آمد کے بعد تو مجھے یقین تھا کہ تم کبھی بھی ہاں نہیں کرو گی وہ بہت ابرو گینٹ (حکم چلانے والا) شخص ہے میں اسے جانتی ہوں اچھی طرح۔“

”یہی کوئی بات نہیں مابین! دراصل مجھے میری مدد نے پریشان نہیں دی۔“ اس نے ہادی کا بھرم رکھنا چاہا۔

”فارگاڈ سیک منعہ! روئے مت ڈالو مجھ سے زیادہ اس بندے کی نیچر کون سمجھتا ہوگا وہ ہری شخصیت ہے اس کی۔ مجھے تم سے ایسی باتیں کہنی تو نہیں چاہئیں آخر منگیتر ہے تمہارا لیکن میں کیا کروں چند ملاقاتوں میں ہی تم سے اپنائیت کا عجیب سا رشتہ استوار ہو گیا ہے یہ جو تمہارے چہرے کی معصومیت ہے اس میں کچھ ایسی کشش ہے جو ہر کسی کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور چونکہ یہ ہے کہ ہادی رضامندی جیسی معصوم اور انوسنٹ لڑکی پر زور نہیں کرتا۔“

”آپ میری تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہی ہیں اور ہادی بھی یقیناً ایسے نہیں ہیں ان کے متعلق آپ کو اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی ہے کسی معاملے میں اختلاف رائے ہونا الگ بات ہے لیکن ہائے نیچر وہ بہت اچھے انسان ہیں۔“ وہ شدید ناراضی کے باوجود مابین ہمدانی کے سامنے ہادی کی برائی نہ کہانی۔

”خدا کے لیے منعہ! اس بندے کی اتنی تعریفیں کم از کم میرے سامنے نہ کرو۔ اس کا ظاہر مابین کیسا ہے میں ہی کیا اس کے ساتھ کام کرنے والی ہر لڑکی ہی چند دنوں میں جان جاتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ کوئی بھی لڑکی یہاں تک کر کام نہیں کر سکی۔ موصوف پہلے بہت ریزروسی شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ویری ڈینٹ اینڈ ریزن اسبل پھر جب اعتبار اور احترام کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو اپنی اصلیت دکھاتے ہیں۔ تم

مانڈ مت کرنا لیکن سچ یہی ہے میری یہاں سے جا ب چھوڑنے کی وجہ یہ ہی تھی کہ موصوف ڈورے ڈالنے لگے تھے مجھ پر اور جب میں نے حوصلہ افزائی نہ کی تو خار کھانے لگے مجھ سے اللہ جانے تمہارے ساتھ معاملہ منطقی انجام تک کیسے پہنچا شاید تم لوگوں کے فیملی رزمز ایسے تھے کہ اسے منطقی روایتی یا پھر اس نے سوچا کہ کب تک انفر زلر کا کام چلے گا عشاوی بھی تو کہنی ہے پھر تم جیسی انوسنٹ لڑکی اور کہاں سے ملتی اسے برائی اور بے وقوفی کی حد تک سادہ جس کی ناک کے نیچے کچھ بھی کرتے رہو اسے پتا نہیں چلتا۔“

مابین ہمدانی نے اس بار بالکل دوسرا پتا چھینکا تھا اگر دونوں کے درمیان غلط فہمی پروان چڑھ جاتی تو زبردست اور اگر بات چیت کر کے وہ اپنی غلط فہمی دور کر لیتے تو بھی اس کی ہلا سے اس نے اپنی طور پر دونوں کو ایک دوسرے سے بدگمان کرنے کی بھرپور کوشش تو کر ڈالی تھی۔

اور منعہ کتنی دیر تک بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

”تمہیں یقین نہیں آئے گا منعہ! اس نے ٹھنڈی سانس بھری ”اور یقین ابھی نہیں سکتا“ بہر حال میری ٹیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں اور ہاں یہ آفراب بھی برقرار ہے میں تمہیں سوچنے کا آخری موقع دے رہی ہوں۔ اس بندے کے پیچھے تم اپنے کیریر کا یہ گولڈن چانس کیوں مرس کرو کل تک مجھے اپنے حتمی جواب سے آگاہ کر دیتا۔“ وہ کہہ کر اٹھ گئی تھی منعہ چپ چاپ اسے جانا دیکھتی رہی اتنے میں سامنے سے آنا ہادی اسے دیکھ کر ٹھٹھا تھا مابین ہمدانی بھی رک گئی۔

”ہائی دا وے کس لیے تشریف لائی ہیں آپ؟“ اس کی شوخ سے ہلو کے جواب میں ہادی نے جھپٹے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”اچھو کلی منعہ! کو ایریمنٹ کا ڈرافٹ دکھانے آئی تھی۔ ایک دو باتوں سے اسے اختلاف ہے آئی میں سگری وغیرہ میں نے کما چلو شام کو تمہارے

گھر آکر ڈسکس کر لوں گی یا وہ میرے دفتر آکر سائن کر دے گی ٹی الحال تو مجھے اپنی ریکارڈنگ پر پہنچنا ہے میں آل ریڈیو کافی لیٹ ہو چکی۔“

وہ ایک اداسے ہائے کہہ کر کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی تھی۔ ہادی سیدھا منعہ کے کین میں جا پہنچا وہ اس سے سوری کرنے اور سمجھانے کے ارادے سے اس کے پاس ہی آ رہا تھا لیکن اس لڑکی کی خود سری نے اس کا دماغ الٹ دیا اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ اتنی ہٹ دھرم ثابت ہوگی۔ وہ دستک دے کر منعہ کے کین میں داخل ہوا۔ وہ دونوں بازو میز پر رکھے اس پر اپنا سر ٹکائے بیٹھی تھی ہادی کی آمد پر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مس منعہ! میں آپ سے صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ بہت شوق سے اپنا جینیل جوائن کر لیجئے بھلے سے جو مرضی کریں لیکن پہلی بات کہ آئندہ یہ لڑکی مابین ہمدانی مجھے اس دفتر میں نظر نہ آئے اور دوسری بات کہ آپ نے یہ اخبار جوائن کرتے ہوئے بھی ایک کاتھریکٹ سائن کیا تھا جس کی رو سے آپ بیک وقت دو اداروں میں کام نہیں کر سکتیں آپ نے فیصلے سے مجھے تھوڑی دیر میں آگاہ کر دیجئے گا۔“ اس نے کھیلے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ منعہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے تھے مگر اس کے لب صرف کپکپا کر رہ گئے ہادی رضا کرے سے جا چکا تھا۔

وہ صرف اس کی وجہ سے اپنی خواہش سے دستبردار ہونے جا رہی تھی لیکن ہادی کا رویہ کتنا لٹھیک آئینز تھا اتنی بے اعتباری اتنی اجنبیت اتنی رکھائی اس کی سنے بغیر اس کی رائے جانے بغیر اس نے خود ہی ایک مفروضہ قائم کر لیا اور پھر اس مفروضے کے تحت اسے اپنا فیصلہ بھی سنا دیا۔ ہادی نے اسے غلط سمجھا تھا یا وہ ہادی کو سمجھنے میں غلطی کر بیٹھی تھی۔ ابھی تو وہ مابین ہمدانی کے اعترافات کو جھٹلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہادی آکر صرف اسے ایک باس کی حیثیت سے یہ باور کروا گیا تھا کہ وہ کاتھریکٹ کی رو سے صرف یہاں کام کرنے کی پابند ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے منعہ اور اپنے تعلق کو کتنی آسانی سے فراموش کر دیا تھا۔ یہ وہ

ہادی نہ تھا جس کے نام کی انگوٹھی وہ اپنے ہاتھ میں سجائے بیٹھ چکی تھی۔ یہ تو کوئی اجنبی تھا اور اجنبیوں کے درمیان کوئی تعلق کیسے قائم رہ سکتا ہے۔

”یہ میرا استعفی ہے سر! اور یہ آپ کی انگوٹھی۔“ بہت دیر بعد وہ خود کو کمپوز کر کے ہادی کے کمرے میں گئی تھی لیکن اپنے اندر اٹھتے جوار بھٹا کو قابو نہ کر پائی تھی۔

اپنی اتنا اپنا وقار اسے ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا اس خود پسند شخص کی ہر اسی میں زندگی کے ہر قدم پر رونے سے بہتر تھا کہ وہ ابھی یہ تعلق ختم کر دے۔ عرصے کے اٹھتے ابلال نے اس سے یہ فیصلہ کروا لیا جو شاید کچھ دیر گزرنے کے بعد وہ کرنے کا سوچ بھی نہ سکتی تھی ٹی الحال اسے نہ آمنہ کی ناراضی کا خیال تھا نہ رضا انکل کی خفگی کا، صرف ہادی کی آنکھوں کی اجنبیت نے اس سے یہ فوری فیصلہ کروا لیا تھا! استعفی اور انگوٹھی اس کے سامنے رکھ کر وہ لیٹ گئی تھی۔ اب بے یقینی سے سائت بیٹھے رہ جانے کی باری ہادی کی تھی۔

”تم نے اس سے اس فیصلے کی وجہ پوچھی؟“ یا اس سے مخاطب تھے۔

”وہ اپنے ہر فیصلے میں خود مختار ہے، مجھے کیوں وجوہات سے آگاہ کرنے لگی۔“ وہ پھپکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا تھا۔

”اور آپ جاتے تو رہتے ہیں وہاں خود ہی وجہ پوچھ لیجئے گا عمر تم سے!“

اس نے تھکے ہارے انداز میں بابا کو مخاطب کیا۔

”میرے جانے کا اب کوئی جواز ہی نہیں بچا ہادی! جب تم دونوں خود ہی یہ رشتہ برقرار رکھنے میں سنجیدہ نہیں ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ اس نے بابا کی بات پر حیرت سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو، صبح کہہ رہا ہوں میں۔ یہ

زندگی بھر کا معاملہ ہے اگر تم دونوں کی طرف سے اسے
بھانپنے میں سنجیدگی نہیں ہے تو ابھی بھی وقت ہے
خوب سوچ بچھ لو۔ یہ رشتہ بہت کھردہ باز کا متقاضی
ہوتا ہے۔ اگر اپنی اپنی انانوں کے دائرے میں قید رہنا
ہے تو بہتر ہے اس فیصلے پر نظر ثانی کرلو۔ ”بابا پھر پور
سنجیدگی سے مخاطب تھے ان کا رد عمل اس کی توقع کے
بالکل برعکس تھا وہ سوچے بیٹھا تھا کہ بابا پہلے تو اس پر
خفا ہوں گے اسے سمجھائیں گے پھر سنبھالو سمجھانے
نمنانے اس کے گھر جائیں گے لیکن انہوں نے تو
صاف ہری جھنڈی دکھادی تھی۔

بابا کے کمرے سے جانے کے بعد وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا
تھا۔ دل و دماغ سنبھالنے سے دست برداری کا تصور بھی نہ
کر سکتا تھا۔ اس کی ذرا سی عقل بھی سنبھالنے سے
برداشت نہ ہوئی حالانکہ کم از کم خفا ہونے کا حق تو
رکھتا تھا وہ کتنی آسانی سے اس نے تعلق توڑنے کا
یکطرفہ فیصلہ کر لیا۔ غلطی سنبھالنے کی تھی وہ خود سے
کیسے جھٹکا دل و دماغ میں عجیب سی کشمکش برپا تھی۔

”یہ سب کیا ہو گیا رہا بھائی! ٹیلی فون کے دوسری
طرف آمنہ از حد پریشان تھیں۔
”اب بالکل فکر نہ کر سب بھابھی! سب ٹھیک
ہو جائے گا۔“ رضا صاحب بالکل پرسکون تھے۔
”مجھے سنبھالنے سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی
لیکن وہ خود بھی کمرے میں بند روئے جا رہی ہے میں
اسے مزید کیا کہوں۔“

”بچے ہیں بھابھی! جذباتی اور کم عقل اور ہمارے
سمجھانے سمجھانے سے وقتی طور پر تو مان جائیں گے
لیکن جو گرہ ان کے دلوں میں پڑ چکی ہے وہ نہیں کھلے
گی۔ فی الحال آپ کو اور مجھے اس معاملے سے لا تعلق
رہنا ہے۔ ان دونوں کو اپنی حماقت اور جذباتیت کا خود
سے احساس ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ ان کے
مستقبل کے تعلق کی پائنداری کے لیے ضروری ہے۔
ہم کب تک ان کے جھگڑے نمنانے کو موجود ہوں

گے۔ انہیں خود یہ فیصلہ کرنے دیجئے کہ ان کے
درمیان غلط فہمی کیوں گروان چڑھی۔ کون اس کا زیادہ
ذمہ دار ہے یہ جانے کا موقع دیجئے کہ یہ ایک دوسرے
کے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ جب انہیں خود
احساس ہو جائے گا تو اپنی حماقت پر نہ صرف پچھتاہیں
گے بلکہ آئندہ ایسی کسی حماقت کا سوچیں گے بھی
نہیں۔“
رضا صاحب پر امید تھے آمنہ ماں تھیں، متفکر تھیں
تاہم انہوں نے رضا صاحب کی بات سے اتفاق کر لیا
تھا۔

”سوری مایین! میرا جواب اب بھی وہی ہے۔“
مایین کی کل وصول کرتے ہی اس نے چھوٹے ہی انکار
کر دیا تھا۔
”اوکے اوکے میں اصرار نہیں کروں گی تمہاری
مجبوری سمجھتی ہوں جانتی ہوں تمہارے منگیتر صاحب
کی ضد کی وجہ سے۔“

”ہی از نو مورائی فانی مایین۔ (وہ اب میرے منگیتر
نہیں رہے)“ اس نے دھیرے سے اس کی بات کالی
تھی اور ساتھ ہی کال مجھے۔ دوسری طرف موبائل
ہاتھ میں لیے مایین ہوائی کے لیوں پر بہت مطمئن سی
مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ حسب خواہش سنبھالنے کو
ٹی وی اسکرین پر لانے میں تو کامیاب نہیں ہوئی تھی
لیکن جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی خواہش سے بڑھ کر تھا۔

”امی! اب آپ ریٹ کر لیں باقی کام میں سمیٹ
لتی ہوں۔“ وہ کچن میں آکر آمنہ سے مخاطب تھی
آمنہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی متورم آنکھیں اور
ستا ہوا چہرہ ان کے دل کو کچھ ہوا تھا لیکن انہوں نے اپنی
اندرونی کیفیات چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیں تھیں۔
”میں رہنے دو کام ہی کتنا رہ گیا ہے، میں کروں
گی، تمہیں پتا تو ہے کہ مجھ سے فارغ نہیں
بیٹھا جاتا۔“ ساٹھ سے انداز میں جواب دے کر وہ پھر
باندی میں ڈوٹی کھانے لگی تھیں۔ سنبھالنے چند لمحے

کڑی انہیں دیکھتی رہی پھر بے بسی سے لب چلتی
واپس پلٹ گئی تھی۔

”تمہاری لواستوری میں اتنی جلدی یہ ڈرامائی موڈ
پیدا ہو گیا، میری سمجھ سے تو یہ بات باہر ہے۔“ ہمایوں
اور بادی اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں آئے سانسے
ہائے بچ کر رہے تھے بلکہ ہمایوں ہی تھا جو بچ کر رہا تھا
بادی حش چچ کانٹے سے کھیل رہا تھا۔
”تم اسے ڈرامائی موڈ کہہ رہے ہو؟“ بادی نے
اسے خشکیں لگا ہوں سے گھورا۔

”اوکے کرے جک موڈ کہہ لو۔“ ہمایوں نے رشین
سلاؤ کا بچ پھر کمرے میں ڈالا۔

”مجھے ہرگز انداز نہ تھا کہ سنبھالنے ایسا ہی ایک
کرے گی۔ میں اس کی زندگی میں اتنی توانیت رکھتا تھا
ناکہ وہ میرے مشورے اور رائے سے کوئی قدم
اٹھاتی۔ اس کے بھلے کو تو ہی منع کر رہا تھا میں اور جب
اس کی من مانی پر تھوڑا ساری ایکٹ کیا میں نے تو وہ
اور ری ایکٹ کر گئی۔ اس نے بہت زیادتی کی میرے
ساتھ۔“ اسے ساتھ وہ از حد مل اور دل گرفتہ تھا۔
ہمایوں کو ہنسی آگئی تھی۔ بڑھی ہوئی شیو اور ملگجے
سے جلتے میں وہ واقعی جنوں کا جاشین لگ رہا تھا۔

”ہنس لو آؤ لو میرا مذاق۔“ اس کی ہنسی بادی کی
لگا ہوں سے پوشیدہ نہ رہی تھی۔ وہ مزید خفا ہوا۔

”اوکے اوکے نہیں ہنس رہا لیکن سچی بات تو یہ ہے
کہ جس سنبھالنے کو میں جانتا ہوں وہ ہرگز ایسی نہیں ہے
ہٹ دھری اور خود سری نہ اس کے خمیر میں شامل ہے
نہ تربیت میں۔ ہاں ناک خاصی اونچی ہے گناؤ قار اور
بھرم عزیز رکھتی ہے لیکن یار میں پھر یہی کہوں گا کہ
تم لوگوں کے درمیان کیونیکیشن کیپ پیدا ہوا ہے
کوئی بہت بڑی غلط فہمی۔ تم دونوں ہی ایک دوسرے کو
کچھ نہیں پائے اور نہ ہی اپنا موقف سمجھ پائے ہو۔“
ہمایوں رسائیت سے بولا تھا۔
”موقف سمجھانے کی نوبت آتی تب نا۔ محترمہ

استغنی کے ساتھ انگوٹھی بھی میرے منہ پر مار گئی
ہیں۔“

”واقعی منہ پر ماری، پھر تو بڑی چوٹ لگی ہوگی۔“
ہمایوں نے مصنوعی تاسف طاری کیا بادی نے ایک بار
پھر اسے گھورا تھا۔

”اچھا اب یہ نظروں کے تیر مت چلاؤ اور
کھانا کھاؤ۔ اللہ نے چایا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
ہمایوں نے بھی صرف کالی پر بڑھا دیا تھا۔ بادی پھر چچ
کانٹوں سے کھیلنے لگا تھا۔

”پھر کب سے شروع ہو رہا ہے تمہارا پروگرام؟“
ہمایوں نے چائے کا سپ پیتے ہوئے اطمینان سے
دریافت کیا۔

”کیسا پروگرام ہمایوں بھائی۔“ وہ پھکی سی ہنسی
ہوئے بولی۔ ہمایوں اور رد اس وقت اس کے ڈرائنگ
روم میں موجود تھے۔ آمنہ بیوس میں میلاؤ میں گئی
ہوئی تھیں سنبھالنے ہی ان کی خاطر کا سامان کیا تھا۔

”بھبی ہم تو مشتاق اور منتظر تھے کہ سنبھالنے صاحبہ
جلد ہی ٹی وی اسکرین پر نمودار ہو کر اپنے پروگرام میں
شریک مہمانوں پر تباہ توڑ سوال کر کے ان کے پھلے
چھڑایا کریں گی۔“ رد نے بھی اسے ہنستے ہوئے
مخاطب کیا۔

”خیر روا بھابھی! اگر میں پروگرام کرتی بھی تو وہ
روایتی پروگرام ہرگز نہ ہوتا حش پروگرام میں گرامری
پیدا کر کے ریشنگ برصانا مقصد نہ ہوتا میرا یہ وقت سب
کو ایک نکتے پر متحد کرنے کا ہے نہ کہ متشر کرنے کا،“
وہ آڑھ سے لہجے میں بولی۔ کچھ بھی تھا اس نے
اس حوالے سے سوچ تو بہت کچھ کیا تھا اگرچہ خواہش
تشنہ رہ گئی تھی اور اس بے ضرری خواہش کا جو خزانہ
بھگتنا پڑا تھا اسے سوچ کر اس کی آنکھیں پھر بھگ گئی
تھیں۔ رد اور ہمایوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر
دوبارہ اس کو۔
”میں نے تو سنا تھا کہ تم نے ایگر مینٹ سائن

کریا؟“ ”ہاں! میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔
”آپ نے جس سے سنا ہے یا جس نے آپ کو بھیجا
ہے انہیں جا کر بتا دیجئے کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔
ان کی رائے ان کی مرضی کے بغیر میں کوئی قدم کیسے
اٹھا سکتی تھی۔“ وہ ہنڈلے ٹھار لکچے میں بولی ہمایوں
کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”دیکھو لڑکی! غلط فہمی دور کرو نہ ہم نے کسی سے
کچھ سنا نہ کسی نے ہمیں بھیجا بلکہ شاید اس کے بجائے
میرا تم سے زیادہ قریبی رشتہ ہے۔ وہ دوست ہے اور تم
بسن۔ کم از کم بسن کو بھائی پر شک نہیں کرنا چاہیے۔“
ہمایوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ
اتنا سہارا دیا کہ ہر گھبرائی تھی۔ ضبط کے سارے بندھن
لوٹ گئے تھے۔ اسے یوں روٹا دیکھ کر ہمایوں اور روا
دونوں پریشان ہو گئے تھے۔

”بس کرو منعید! میری جان بٹاؤ تو سہی کیا ہوا
ہے۔“ ”روانے اسے بازو دے کر بھاڑا۔
”روا بھیجی! اسب کچھ قسم ہو گیا۔“
”کچھ قسم نہیں ہوا اور خیر جواب ایک آنسو بھی
بھایا۔“ ”ہمایوں نے اسے ڈپٹا لیا۔

”اور اب شروع سے آخر تک سب کچھ بتاؤ۔“
ہمایوں کو کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ صورت حال اس بچہ پر
کیسے پڑی۔ اس نے ہچکیوں اور سسکیوں سے کے
ساتھ ہادی کی ساری زیادتیاں بتا دیں۔

”میں ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرنے لگی
تھی۔ انہوں نے خود ہی مفروضہ قائم کر لیا کہ میں فیصلہ
کر چکی ہوں۔“ ”روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی
تھی۔

”اتنا آسان کیس؟ یہ تو ایک ہی نشست میں حل
ہو گیا یا راجھے تو انجینئر کے بجائے ڈھٹیکشو ہونا چاہیے
تھا۔“ ”منعید کی بات سننے کے بعد ہمایوں کے لبوں پر
مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”ہاں! ہمدانی کو مجھ سے بہتر اور کون جانتا ہے۔ می
کی سیکنڈ گزن کی بیٹی ہے۔ یونیورسٹی میں میری کلاس
فلو بھی رہی ہے۔ وہ واقعی ایک سائیکس کیس ہے۔“

”روانے بھی سر ہلایا۔
”اوہ یعنی تم ہی مجرم تک پہنچ گئیں۔“ ”ہمایوں نے
حیرانی سے ہوی کو دیکھا۔
”ظاہر ہے کوئی بچہ بھی دونوں طرف کے بیان سے
”مجرم“ تک پہنچ سکتا ہے آپ نے ایسا کون سا عمل
کر دیا۔“

”روانے ہمایوں کو گھورا وہ کھنکھایا تھا۔“ اس نے بہت
ہوشیاری سے دونوں کے درمیان غلط فہمی کا پہاڑ کھڑا
کیا۔ قسمت نے اس کا ساتھ دیا کہ یہ دونوں ایک
دوسرے سے کھل کر بات ہی نہ کر سکے ورنہ اگر اس
روز ہادی بھائی منعید کو سن لیتے تو معاملے کی تہ تک
پہنچ جاتے۔“ ”روانے دوبارہ ہمایوں کو مخاطب کیا۔
”منعید! ہکا بکا دونوں کی گفتگو سمجھنے کی کوشش کر رہی
تھی جو اسے بالکل فراموش ہی کر چکے تھے۔

”ہاں اصل گھماؤ وہ ہادی ہی ثابت ہوا نہ۔ چلو یعنی
تو ماہین سے توافق تھی اس کی نیچر نہ سمجھ سکی لیکن
ہادی تو پہلے سے ہی اس کا ڈاؤن ہوا ہے۔ میں نے تمہیں
پہلے بھی بتایا تھا تاکہ کس طرح محترمہ بچے جھاڑ کر اس
کے پیچھے پڑی تھیں۔ رضا انکل کی جان بچان تھی
تمہاری اس ماہین ہمدانی کے والد سے بس عسی کو غیاد
بنا کر پہلے اس نے جاب کی اس کے بعد ہادی کو قابو کرنا
چاہا۔ اللہ اللہ کر کے جان چھڑائی تھی ہادی نے اس
سے بلکہ میرے مشوروں پر عمل کر کے ہی اسے آفس
سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا ورنہ وہ لڑکی تو یار کھیل ہوتی
جاری تھی اور اب وہ پھر اسی ماہین ہمدانی کے ٹرپ میں
آگیا۔ اس کی کئی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین
کر لیا۔“ ”ہمایوں کو صبح معنوں میں ہادی پر غصہ آیا تھا۔

”کچھ مجھے بھی بتائیں گے یا دونوں آپس میں ہی
بات کرتے رہیں گے۔“ ”منعید جھلا گئی تھی۔
”مختصر الفاظ میں بات صرف اتنی سی ہے کہ تمہا بہن
ہمدانی کے ہاتھوں الوین چکی ہو۔ اس نے ہادی بھائی
سے اپنی پرانی دشمنی تمہیں ان سے بدظن کر کے نکالی
اور تم اپنی ذفر تھیں کہ اس کے بچھائے ہوئے حال میں
پھنس گئیں۔“ ”روانے اسے حسب توقع تاتا تھا۔

”لیکن وہ تو کہہ رہی تھی کہ ہادی اس میں دلچسپی
لیتے تھے اور جب اس نے۔“
”تم نے اس کی بات پر یقین کر لیا اور جو بات ہم تم
سے کر رہے ہیں وہ بات تمہارے لیے ناقابل اعتبار
ہے۔“ ”ہمایوں نے اسے گھر کا۔
”ہمایوں! یہ تعلق ہی ایسا ہے انسان جس سے
محبت کرتا ہے۔

اس کے متعلق پوزیو بھی ہو جاتا ہے اور بہت جلد
بدگمان بھی ہو سکتا ہے منعید کی غلط فہمی دور کرنے کا
ایک طریقہ ہے میرے پاس۔“ ”روانے پر سوچ انداز
اختیار کیا تھا پھر اپنے ہینڈ بیگ میں سے اپنا سیل فون
نکالا تھا۔

”منعید! تمہارے پاس ماہین ہمدانی کا نمبر تو دو مجھے
میرے پاس فوراً نمبر تھا شاید ہم بدل ہی اس نے۔“
”روانے منعید کو مخاطب کیا منعید نے کچھ مجھے کچھ
نہ سمجھتے ہوئے اسے اپنے موبائل میں سے ماہین
ہمدانی کا نمبر دے دیا تھا روانے نمبر ملا کر اسٹیکر آن
کر لیا۔

”ہیلو۔“ ”ماہین ہمدانی کی شمار آواز ان کے کانوں
سے ٹکرائی تھی۔
”ہاں ہیلو ماہین! میں روا بول رہی ہوں کیسی ہو
تم۔“ ”روانے اس سے تعارف کروایا تھا۔

”اوہ سبز ہمایوں! کیسی ہیں آپ؟“ ”ماہین اسے فوراً
پہچان گئی تھی۔
”میں ٹھیک ہوں تم سناؤ انکل، آئی کیسے ہیں؟
تمہارا شو کیسا جا رہا ہے۔“ ”روانے رسمی باتوں سے آغاز
کیا تھا۔

”میں بالکل فٹ فٹ، می، ڈیڈی بھی بالکل ٹھیک
تم سناؤ اتنے دنوں بعد کیسے یاد کیا اور میاں کیسا ہے
تمہارا؟“

”ہاں ہمایوں! اچھے ہیں۔“ ”روانے مختصر جواب دیا۔
ماہین نے ٹھنڈی سانس بھری۔
”ہاں! بھی ہمایوں تو اچھا ہی ہے البتہ اس کا دوست
بہت کھڑوس ہے۔“

”کون کس دوست کی بات کر رہی ہو تم۔“ ”روانے
حیرت سے پوچھا۔
”میں میاں سے پوچھنا ایک ہی دوست ہے اس
کا۔ انتہائی سڑیل مزاج۔“ ”ماہین ہمدانی طنز بنی تھی۔
”تم ہادی بھائی کی بات کر رہی ہو۔“ ”روا سنجیدہ
ہوئی۔

”بھائی ہو گا تمہارا۔ میرا تو وہ صرف ڈارلنگ ہے۔“
”ماہین ہمدانی نے قہقہہ لگایا تھا۔
”ٹٹ! اب ماہین! تمہیں شرم آنی چاہیے، کتنی
چالاک کیسے تم نے ہادی بھائی اور منعید میں غلط فہمیاں
پیدا کیں۔“

”سو سید روا! تمہیں اپنی فرینڈ سے زیادہ اپنے میاں
کے فرینڈ اور اس کی مگنیت سے ہمدردی ہے۔“ ”ماہین
نے مصنوعی تاسف اختیار کیا۔
”اور ویسے بھی روا ڈیر یوری تھنگ از فران لوائیڈ
وار۔“ ”روا کی اگلی بات سننے بغیر ماہین نے قہقہہ لگاتے
ہوئے کہا تھا۔

”تمہارا خیال ہے کہ منعید کو ٹھکرا کر وہ تمہاری
طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ خام خیالی ہے یہ تمہاری
ماہین!۔“ ”روانے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا تھا۔

”میں بھی کوئی مری نہیں جاری تمہارے اس ہادی
رضا کے پیچھے، اس جیسے کئی میری جوتیاں سیدھی
کرتے ہیں۔ میں کتنی بڑی سیلیبٹیٹی بنی جا رہی ہوں
تمہیں شاید اندازہ نہیں، میرا مقصد صرف اسے مرا
چکھانا تھا سو چکھا دیا۔ اسے اپنی مگنیت پر بہت مان اور
بھروسہ تھا، دو ٹکے کا کر دیا میں نے اس کو ہادی رضا کی
نظر میں۔ اپنے انتخاب پر شرمندہ ہو رہا ہو گا بے
چارہ۔“ ”ماہین ہمدانی کی استہزائیہ آواز روا کو جلا گئی تھی۔
”شرم کرو ماہین! بس ڈھٹائی سے اعتراف کر رہی
ہو۔“

”دیکھو روا تم جانتی ہو میں کس ٹائپ کی لڑکی ہوں۔
مجھے شرمناک وغیرہ کمال آتا ہے، مجھے شرم دلوانے میں
وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ تم کوئی دوسرا کام
کر لو۔ میرا وقت ضائع مت کرو۔ اوکے بائے۔“ ”ماہین

ہمدانی بھی بد مزہ ہو گئی تھی اس نے روا کی مزید سے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

”سٹوڈنٹ“ روانے اسے عاتقانہ لٹاڑا تھا۔

”میں نے کہا تھا نہ سائیکس ہے، لکٹی ڈھٹائی سے مان گئی وہاں یونیورسٹی میں بھی ایسی تھی۔ پورے ڈپارٹمنٹ کا ناک میں دم کر کر کھاتا اور نچال ہے جو کبھی اپنے رویہ پر نادم ہوتی ہو۔ عجیب طرح کی ڈھٹائی ہے اس کی شخصیت میں۔“ روا تاسف سے بول رہی تھی۔ ہمایوں بغور منہ دیکھ کر دھواں دھواں ہوتا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”تم نے اپنے سیل فون کا اتنا زیروست استعمال کروا لا منہ۔ اب مجھے بھی موقع ملنا چاہیے۔“

ہمایوں نے مسکراتے ہوئے اپنا سیل نکال کر کال ملائی۔ اسپیکر اس نے بھی آن کر دیا۔

”ہاں ہمایوں! کیا حال ہے۔“ دوسری طرف ہادی تھا اس کے لہجے کی فطری اشتات مفلک ہوئی۔

”حال تو آب ستائے جنوں کے جائیں۔ آج شیو بنائی یا آج بھی فرصت نہیں ملی۔“ ہمایوں نے اسے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

”شٹ اپ ہمایوں! میرے زخموں پر نمک پاشی کے لیے فون کیا ہے تو اللہ حافظ۔“ وہ شدید بد لحاظ ہوا تھا۔

”چھا ہادی رک یا ر! ان تو سہی۔“ ہمایوں نے بمشکل اسے کال بند کرنے سے روکا۔

”ہاں بول کیا بات ہے۔“ وہ اسی لہجے میں بولا گویا کہنا چاہ رہا ہو۔ ”ہاں بک کیا بات ہے۔“

ہمایوں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی ”میں تجھ سے یعنی کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔“ ہمایوں نے اس بار لہجہ سنجیدہ ہی رکھا۔

”اب کیا بات باقی رہ گئی۔“ ہادی کا ٹوٹا ہوا لہجہ۔ روا اور ہمایوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر پھر ہنسی روکی تھی۔

”بار اکل رات میرے ذہن میں ایک نئی سوچ آئی۔ ہو سکتا ہے یعنی کہیں اور انٹر سٹڈ ہو اور وہ اسی وجہ سے یہ تعلق توڑنا چاہ رہی ہو۔“

”پلیز ہمایوں! اپنے زریں خیالات اپنے تک ہی محدود رکھ اور رات کے وقت ایسی چیزیں مت کھایا کر جس سے بد ہضمی کا احتمال ہو۔“ ہادی تپ گیا تھا۔

”چھا اچھا ناراض تو مت ہو، میں نے تو ویسے ہی ایک خیال شیئر کیا تھا دراصل آج دوسپہر کو جب میں اس سے بچ کے لیے نکلا تو ایک سنگل پر گاڑی رکی۔ مجھے گمان ہوا کہ اس میں کسی بندے کے ساتھ یعنی بیٹھی ہے اتنے میں غور سے دیکھ کر کفرم کرتا سنگل کھل گیا اور گاڑی زن سے گزر گئی، ہو سکتا ہے میرا وہم ہو۔ کوئی اور لڑکی ہو لیکن اگر وہ یعنی تھی تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں نکل سکتا کہ وہ کسی اور میں دلچسپی لے رہی ہو۔“ ہمایوں سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”دیکھ ہمایوں! میں تجھے جھٹا نہیں رہا۔ ہو سکتا ہے گاڑی میں واقعی منعیدہ ہی ہو لیکن اگر میں اپنی آنکھوں سے بھی اسے کسی اور کے ساتھ دیکھ لیتا تو میرے ذہن میں وہ خیال نہ آتا۔ جہاں تک تیری رسائی ہوئی ہے۔ مانا ہمارے درمیان مرس انڈر اسٹینڈنگز ہیں لیکن کم از کم اس نوعیت کی مرس انڈر اسٹینڈنگ نہیں۔ مجھے منعیدہ پر خود سے ہنہ کر اعتبار ہے۔“

ہادی نے رسائیت سے کہا تھا۔ ہمایوں نے ایک جہانی نگاہ منعیدہ پر ڈالی جو گھٹنوں کے گرد پانچو لپٹے جب چاپ بیٹھی تھی۔ ہاں آنسو اب بھی آنکھوں سے چپکنے کو بے تاب تھے۔

”وہ کہ ہادی! ایک اور کال آرہی ہے پھر بات کروں گا۔“ ہمایوں نے فون بند کر کے منعیدہ کو دیکھا۔

”میں اب کیا کروں ہمایوں بھائی! اس نے روبا نسی ہو کر پوچھا۔

”انتظار۔“ ہمایوں نے اس کا سر تھپکا تھا۔



”پھر اب میں کیا کروں؟“ ہادی ہوا پوچھ رہا تھا۔ ”ظاہر ہے معذرت کرو۔ اسے مناؤ۔ ہر طرح کی خفگی کا حق رکھتی ہے وہ۔ اسے نئے بغیر تم نے خود



سانتھ مضبوطی قائم کرلیے۔ تم نے اس کے اعتبار اور اعتماد دونوں کا خون کیا ہے اور وہ جو انگوٹھی تمہارے منہ پر مار گئی تھی اس کے بجائے اسے کسی دہلیز کا انتخاب کرنا چاہیے تھا۔

ہمایوں جب سے آیا تھا اس پر مسلسل بگڑ رہا تھا۔ ہادی چپکاپیٹھ اس کی ڈانٹ سن رہا تھا۔

”مناکوں کا تو مان جائے گی؟“ وہ بہت آس سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ آپ کے مٹانے کے طریقے اور آپ کی قسمت پر منحصر ہے۔“ ہمایوں نے کوئی امید افزا جواب نہ دیا۔ ہادی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔



وہ اس وقت دھڑکتے دل کے ساتھ آمنہ آنٹی کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ وہ حسب سابق بہت تپا کسے ملی تھیں۔

”مجھے سننے سے بات کرنی ہے آنٹی! کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ مطلب کی بات پر آگیا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ آمنہ آنٹی کے سامنے بھی خود کو بہت شرمندہ محسوس کر رہا تھا۔ آمنہ آنٹی مسکرا دیں۔

”یعنی چائے بناتی ہے، آتی ہی ہوگی۔ میں تو ویسے بھی مارکیٹ جانے کے لیے نکل رہی تھی کچھ گروسری خریدتی تھی۔“

کوئی اور موقع نہ ہوتا تو وہ آمنہ آنٹی کو اپنی خدمات پیش کر دیتا لیکن فی الحال یہ آفر کرنا حیاقت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ آمنہ آنٹی یقیناً ”خود ہی انہیں گلے شکوے دور کرنے کا موقع فراہم کر رہی تھیں“ وہ دل سے ان کا ممنون ہوا۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد سننے چائے کی ٹرے لیے آئے موجود ہوئی۔ دھیرے سے سلام کر کے اس نے ٹرے سینئر ٹیبل پر رکھی۔

”پلیز پیٹھ جاؤ۔“ ہادی کو خدشہ ستایا کہ وہ واپس نہ پلٹ جائے۔

وہ خاموشی سے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی

تھی۔

چند لمحوں کے لیے کمرے میں خاموشی پھیل گئی تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی غلطی کے اعتراف کے لیے مناسب الفاظ سوچ رہے تھے۔

”سوری ہادی۔“ آخر سننے والے ہی خاموشی توڑی وہ بوکھلا گیا۔

”پلیز سننے مجھے شرمندہ مت کرو۔ سوری تو میں تم سے کرتے آیا ہوں۔“

”نہیں زیادہ غلطی میری ہے، میں نے ادوری ایکٹ کیا۔ آپ کا غصہ ختم ہونے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ کم از کم ایک بار تو کھل کر بات کرنی چاہیے تھی۔ ایک دم سے اپنا استعفیٰ ٹائپ کیا اور آپ کو ٹھما آئی۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”ساتھ انگوٹھی تھی۔“ ہادی نے اسے یاد دلایا۔ ”انگوٹھی تو خیر میں نے آپ والی واپس کی تھی اصل انگوٹھی مجھے رضا انکل نے پہنائی تھی وہ میں نے اب بھی پہن رکھی ہے۔“

”اچھا اور جو میں نے پہنائی تھی وہ نفی تھی۔“ ہادی اس کی چلائی پر گھور کر رہ گیا تھا۔

”یہ میں نے کب کہا۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”یعنی تم نے مجھے معاف کر دیا۔“ اس کی مسکراہٹ سے ہادی کو یک گونہ سکون محسوس ہوا۔

”پلیز ہادی اعلیٰ کا لفظ استعمال کر کے مجھے شرمندہ مت کریں۔ جو غلطی فہمی تھی وہ دور ہوئی۔“ وہ سنجیدہ ہوئی تھی۔

”تو اب میں ان ڈانٹ لاگز کا کیا کروں جو ہمایوں نے مجھے رٹا لگو کر بھجوا دیا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا جب کہ اس کی بھوری آنکھوں میں شرارت مسکرا رہی تھی۔

”منہ جال کر رکھ لیں بعد میں کام آئیں گے۔“

سننے والے اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

”معذرت کے ڈانٹ لاگز کا میں نے بعد میں اچار ڈالنا ہے کیا۔ آئندہ میں تمہیں روکھے دوں گا تو مٹانے کی نوبت آئے گی نا۔“

”مجھے بھی پہلے یہی گمان تھا لیکن اس روز آپ کی آگہوں کی اجنبیت اور غیرت۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ آپ تھے ہادی۔“ اس نے شکوہ کر ہی ڈالا۔

”دیکھو، تم ابھی خود کہہ چکی ہو کہ معافی کا لفظ استعمال کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں لیکن میں تمہیں شرمندہ نہ کروں تو اور کیا کروں۔ اتنی ایم ایکسٹریملی پوری سوری سننے والے کو تو کان بھی پکڑ لوں۔“ اس نے کہا تو سننے والے ہی شرمندہ ہو گئی تھی۔

”سچ کہوں تو سننے والے مجھے واقعی بہت افسوس ہے کہ تمہاری خواہش پوری نہ ہو سکی۔ میں جانتا ہوں کہ تم اپنے نظریات کی ترویج کے لیے الیکٹرانک میڈیا کی طاقت بھی استعمال کرنا چاہتی تھیں۔ تم کو تو میں کسی معیاری چینل پر تمہارے لیے کوشش کروں؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”میں ہادی اپنی اہل میں اپنے قلم پر ہی کنسٹرٹ کرنا چاہ رہی ہوں۔ اس نے سہولت سے انکار کر دیا۔

”جیسے تمہاری مرضی لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جب بھی ہمیں وسائل میسر آئیں گے تو ہم اپنا چینل بھی لانچ کریں گے۔ اس کی پالیسی بالکل

تمہارے نظریات کے عین مطابق ہوگی بلکہ اس کی چیف ایگزیکٹو بھی تم ہوگی۔ اگلے سال اس سے اگلے سال یا پھر اس سے بھی اگلے سال ہمارا یہ خواب ضرور پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔“

”اور پھر آپ کے سر پر سے انڈیل کی ٹوکری گر کر ٹوٹ جائے گی۔“ سننے والے کو ہنسی آگئی تھی۔

”حدِ ادب لڑکی۔“ ہادی نے اسے کھورا پھر وہ خود بھی ہنس پڑا تھا۔

”مانا کہ یہ مشکل ہے لیکن ناممکن تو نہیں۔“

”یقیناً نہیں۔“ سننے والے بھی مسکراتے ہوئے اس کی تائید کی۔

”تمہیں بتا ہے آج بابا بھی میرے ساتھ آ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے تم اتنی دیر میں سننے کو مٹانا میں

آمنہ بھابھی کے پاس بیٹھ کر شاہی کی تاریخ طے کر لوں گا۔“ ہادی کے کہنے پر سننے والے مسکرا دی تھی۔

”پھر میں بابا کو بھیج دوں؟“ اس کی مسکراہٹ سے ہادی کو حوصلہ ہوا۔

”مڈنل کو تنہائی بہت سہولت ہے، آپ انہیں کمپنی دیا کریں نا۔“ اس نے ہادی کا سوال سنی ان سنی کر دیا تھا۔

”وہ اپنی کمپنی کے لیے ہی تو بلا تک کر رہے ہیں بلکہ کمپنی نہیں پلائوں۔ بابا خود اکلوتے تھے۔ میں اکلوتا لیکن انہیں اپنے پوتے، پتیال درجن بھر چاہیں اس

معاملے میں وہ ہماری ایک نہیں سنیں گے۔“ ہادی نے اسے پیشگی آگاہ کیا تھا۔

”باتوں باتوں میں آپ کی چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے میں اور لاتی ہوں۔“ سننے والے بڑا کر اٹھ گئی تھی۔

بہت تیزی سے چائے کی ٹرے اٹھا کر وہ رفو چکر تھی۔ ہادی پیچھے سے اسے پکارتا ہی رہ گیا پھر ہنستے ہوئے اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔



اس بندے کے ایک جملے نے اسے عرش کی بلند یوں پر پہنچا دیا تھا۔

”مجھے سننے پر خود سے بڑھ کر اعتبار ہے ہمایوں!“

اور اس کے سارے گلے شکوے خود، خود دم توڑ گئے تھے۔ وہ خود سے شرمندہ تھی کہ کچھ دنوں کے لیے ہی

سہی ماہین ہدائی کی باتوں میں آکر وہ اس سے بدگمان ہوئی تھی۔ اس کے کردار پر شبہ بھی کیا تھا لیکن اس

بات کا اعتراف وہ کبھی بھی اس کے سامنے نہ کر سکتی تھی۔ سہاں اب اس نے ہمیشہ نہ صرف اس سے محبت کرنا تھی بلکہ اس کی محبت کی قدر بھی کرنا تھی۔

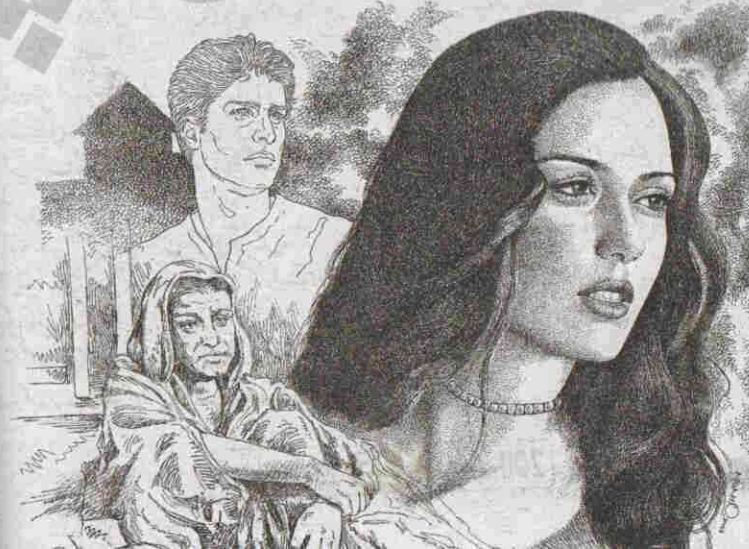


میرے خال لٹاؤ

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا محاورہ دو بیٹیاں سارہ اور اربہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بد مزاجی اور بد زبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی خالدہ سے دوسری شادی کر لی۔ یاسمین اس پر اپنے جینٹھ بٹھائی سے بھی شاکی ہے۔ اربہ ماں سے قریب ہے جب کہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اربہ کی منگنی اس کے تایا زاد اجال رازی سے ہو چکی ہے جو اعلا تعلیم کے لیے امریکا گیا ہوا ہے۔ یاسمین اربہ کو باپ اور دوھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکانے لگتی ہے۔ اربہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتہ چلا تو وہ اپنے تایا اور تانی سے بھی بدظن ہو گئی اور اس نے اجال سے منگنی توڑ دی۔ اجال تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلا۔ وہ اربہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اجال رازی اس بارے میں اربہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی دکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ خصل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بروہاری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اربہ بے حد خود سر ہوئی جا رہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ توصیف احمد کو اربہ کے منگنی توڑ دینے کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ وہ ساجدہ بیگم سے بات کرتے ہیں تو وہ انہیں کچھ دن یاسمین کے گھر میں رہنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ سارہ کا کزن عمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔

شہیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تباہ کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تباہ کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔



”توصیف احمد نے دوسری شادی کیوں کی؟“

شہباز ربانی کو نوکریہ بات اول روز سے کھٹک رہی تھی لیکن پوچھنے سے یوں گریز کر رہے تھے کہ کیس یا سمین کے زخم نہ کھل جائیں۔ ابھی بھی بہت احتیاط سے بچتا تھا۔

یا سمین کے ہونٹوں پر ذرا سی ہنسی ابھر کر دم توڑ گئی۔ پھر صاف گوتی سے بولی تھی۔

”ظاہر ہے جب میری طرف سے اسے کوئی خوشی نہیں ملی تو اسے یہی کرنا تھا۔“

”کم آن یا سمین! تمہیں تو پالیڈائی اس کی خوش قسمتی تھی۔“

”س کی ناں! میری تو نہیں۔ اور جہاں میں اپنی بد قسمتی کا ماتم کر رہی ہوں وہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کیے کر سکتا تھا۔“ یا سمین نے آخر میں قریب بیٹھے شہباز ربانی کو ذرا سی گردن موڑ کر ترچھی نظروں سے دیکھا تھا۔

”او تو تم نے جان بوجھ کر۔ کیوں؟“ شہباز ربانی کو جھکا کا لگا تھا۔

”یہ تم پوچھ رہے ہو شہباز تم؟“ یا سمین پوری ان کی طرف گھوم گئی۔ اس کے چہرے پر کرب پھیل گیا تھا۔

شہباز ربانی نے پہلے ہونٹ پیچھے پھرا کر کاہتہ تمام کر کے لگے۔

”جب قسمت ساتھ نہ دے تو حالات سے سمجھنا کرنا پڑتا ہے یا سمین!“

”میں نہیں کر سکتی بلکہ میں نے سمجھنا کرنا ہی نہیں چاہا کیوں کرتی؟ میری اپنی کوئی زندگی نہیں تھی کیا؟ مجھے اپنی زندگی سننے کا حق تھا۔ جیسے میرے ماں باپ نے تسلیم نہیں کیا تو پھر میں کیوں کسی کا حق تسلیم کر سکتی؟“

”وہ چیخ کر بول رہی تھی۔“

”ریلیکس یا سمین ریلیکس!“ شہباز ربانی نے اس کا ہاتھ تھپکا لیکن اس کے اندر جانے کب سے دبے غبار کو راستہ مل گیا تھا۔

”کیا تھا اس وقت اگر تم اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہوئے تھے کتنا عرصہ لگتا تمہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں؟“

”ہاں دو سال اور یہ کوئی اتنا لمبا عرصہ تو نہیں تھا جو میرے ماں باپ مجھے وہ وقت روکی نہ کھلا سکتے تھے کتنا رنج و گھڑائی لیکن ان پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا لہذا مجھے اس حق قرار دینے کہ ایک تلاش آدمی مجھے کچھ نہیں دے سکتا“

توصیف احمد کے گھر میں رات کو گئی۔ وہ مجھے رانی بنا کر رکھے گا تو ٹھیک ہے میں بن گئی رانی ہوتے کی نوک پر رکھ لیا سب کو ہونہ۔“

آخر میں اس نے انتہائی نفرت سے سر جھکا تھا۔ شہباز ربانی چند لمحے اسے دیکھتے رہے پھر دھیرے سے پوچھا۔

”اس سے کیا حاصل ہوا تمہیں؟“

”میری تمنا صرف تم تھے تم نہیں ملے تو پھر کوئی تمنا نہیں جاگی۔ اور جب تمنا ہی نہیں تو پھر کیا حاصل وصول۔“ یا سمین آزرہ نظر آنے لگی تھی۔

”تم بہت بے وقوف ہو۔“ شہباز ربانی نے گہری سانس کھینچی پھر کہنے لگے۔ ”مجھے اگر ہوتا تو تم اپنے ساتھ یہ سلوک کرو گی تو اسی وقت تمہیں بھگا کر لے جاتا۔“

”میں اب بھی بھاگ سکتی ہوں۔“ یا سمین بے اختیار کہہ کر خود ہی محظوظ ہونے لگی۔

”رنگ! چلو ابھی بھاگ چلیں۔“ شہباز ربانی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔

پھر دونوں ہنسنے لگے۔ عجیب ہی تھی جس میں پچھتاوا بھی تھا اور پچھتاوے کا دوا بھی۔ اگر پہلے کچھ ناممکن تھا تو اب ممکن ہو سکتا تھا، لیکن درمیانی ماہ سال نہیں سمیٹے جاسکتے تھے۔

تب ہی اسیہ تیز قدموں سے اندر آئی۔ پھر ایک دم رگ گئی۔

یا سمین ہنسنے ہوئے یوں وہ ہری ہو گئی تھی کہ اس کی پیشانی شہباز ربانی کے گھٹنے سے جا لگی تھی اور شہباز ربانی

موت کی بیک پر سر رکھے ہنسی کے اختتام پر ”ہاں“ کی آواز میں نکال رہے تھے۔

اسیہ فوری طور پر کچھ سمجھ نہیں سکی۔ یہ بھی نہیں کہ آگے بڑھے یا واپس ہٹ جائے۔ حیران سی کھڑی تھی۔

اب یا سمین نے سراو نکایا اور بے تحاشا ہنسی کے باعث آنکھوں سے ہتے پانی کو صاف کرتے ہوئے نظر اسیہ پر پڑی تو یک لخت اس نے اس ماحول کو یوں بدلا کہ اسیہ پریشان ہو کر بھاگی آئی۔

”کیا ہوا؟“ آپ دو کیوں رہی ہیں؟“ شہباز ربانی بوکھلا کر سیدھے ہو بیٹھے اور یا سمین کو دیکھنے لگے۔ جواب

بقاعدہ سکپاں لے رہی تھی۔

”انکل! آپ بتائیں کیا ہوا ہے؟ کیوں رو رہی ہیں؟“

”بیٹا! شہباز ربانی اس قدر کہہ کر کہ گئے تھے یا سمین سسکیوں کے درمیان گویا ہوئی۔“

”میری قسمت کو رو رہی ہوں۔ کس مقام پر تمہارے باپ نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ ایسے وقت میں جب ہمیں مل بیٹھ کر بچوں کے بہتر مستقبل کے بارے میں سوچنا اور فیصلہ کرنا تھا۔ میں اکیلی کمزور عورت کیا کر سکتی گی۔“

”وہو یا سمین! یہی تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ تم اکیلی نہیں ہو۔ تمہارے بچے تمہارے ساتھ ہیں۔“ شہباز

ربانی کو بات کا سرا مل گیا تھا۔ ”پھر ماشاء اللہ سب بچے سمجھ دار ہیں۔ تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چلو! رونا بند کر دو کھو بچی کیسے پریشان ہو رہی ہے۔“

”مما پلہ!؟“ اسیہ نے اس کی کلاسیاں تمام کر مٹ کی۔

”سوری بیٹا! اس ابھی شہباز نے حال احوال پوچھا تو دل بھر آیا۔ میں ٹھیک ہوں۔ ڈونڈوری۔“ یا سمین نے

اسیہ کا کال تھپکا پھر اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

شہباز ربانی اسیہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ آیا وہ مشکوک ہے یا مطمئن، لیکن انہیں

کچھ اندازہ نہیں ہوا کیونکہ اس کے چہرے پر اس وقت یا سمین کے لیے صرف پریشانی چمک رہی تھی۔

”مما! آپ کو اتنا حساس نہیں ہونا چاہیے۔ چلیں! انھیں اپنے ہاتھ دھوئیں پھر چائے پیتے ہیں۔“

اسیہ نے یا سمین کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا اور جب وہ کمرے سے نکل گئی تب اس کی جگہ پر بیٹھ کر شہباز ربانی سے

کہنے لگی۔

”اصل میں انکل مہارت لوٹلی فیل کرتی ہیں اور ہم سے تو وہ اپنے دل کی بات کہتی بھی نہیں ہیں۔ بس یہی ظاہر

کرتی ہیں جیسے انہیں کوئی ٹینشن نہیں، لیکن میں بچی نہیں ہوں۔ سب جھگڑتی ہوں ڈیڈی کی سیکنڈ میچ کا انہوں

نے بہت اثر لیا ہے۔ اور اب تو اس خوف میں بھی مبتلا ہو گئی ہیں کہ کیس ڈیڈی، ہم سب کو ان سے چھین نہ لیں۔“

”ہاں! ہاں! میں نے بھی ابھی یہی محسوس کیا ہے۔“ شہباز ربانی نے فوراً تصدیق کر کے گویا اپنی پوزیشن سیکٹر

کرنے کی کوشش کی تھی۔

”ہاں! میں ہو سکتا انکل! آپ بتائیں کیا یہ ممکن ہے کہ میں سارے اور حماد کو اکیلا چھوڑ کر ڈیڈی کے ساتھ

چلے جائیں؟“ اس کے لہجے میں عجیب سی بے چارگی در آئی تھی۔

”نہیں بیٹا! یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ میں تمہاری ماں کو سمجھاؤں گا تم فکر مت کرو۔“ شہباز ربانی نے

اسے تسلی دی۔

اسے تاجور کو اپنے ساتھ لانے کا یہی طریقہ سمجھ میں آیا تھا کہ وہ فوری شادی کر لے یوں تاپاں اور تاجور آرام

سے رہ سکتی تھیں۔ اور بظاہر تو اسے اپنی شادی میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی تھی۔ پھر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیوں ٹال مٹول کر رہے تھے۔ وہ روزانہ ہی اپنا لفون کر رہا تھا یہ جاننے کے لیے کہ تباہی کے اباشادی کا کیا کتے ہیں۔ اور روزی یا کوئی نئی بات کرتے تھے۔ اس وقت وہ بری طرح جھنجھلا گیا تھا۔

”ابا! آپ صاف صاف بتائیں کیا مسئلہ ہے۔ آپ میری شادی نہیں کرنا چاہتے یا۔؟“

”لے نہیں کیوں نہ چاہوں گا۔“ ابا اس کی بات بوری ہونے سے پہلے بول پڑے تھے۔ ”مجھے تیری ذات سے کتنے فائدے پہنچ رہے ہیں۔ بڑا کمائے دے رہا ہے۔ تاہم جو میں تیری شادی نہیں کروں گا۔“

”کیوں ناشکری کرتے ہیں ابا! جتنا میں کر سکتا ہوں کر رہا ہوں۔ ہر مینے منی آرڈر ملتا ہے آپ کو کہ نہیں؟“ وہ زنج ہو ا تھا۔

”بس رہنے دے۔ احسان نہ جتا۔“

”میں کوئی احسان نہیں جتا رہا۔ زیادہ کمائوں گا تو زیادہ بھیجوں گا۔ ابھی آپ مجھے میری بات کا جواب دیں، کیا کتے ہیں تباہی کے ابا؟“ وہ فوراً اصل بات کی طرف آیا۔

”پہلے تو بتاؤ مجھے ضرور تباہی سے شادی کرنی ہے۔“ ابا نے پوچھا تو وہ فوری قیاس کر کے بولا تھا۔

”اس کا مطلب ہے آپ میری شادی تباہی سے نہیں کرنا چاہتے۔“

”مجھے پتہ نہیں نہ لاؤ اپنی بات کر۔“ ابا کو غصہ بتا نہیں کس بات کا تھا۔ اس نے بشکل خود پر قابو پایا پھر آرام سے بولا تھا۔

”ہاں ابا! میں تباہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض۔۔۔“

”نہ نہ پترانے کوئی اعتراض نہیں۔“ ابا فوراً بولے تھے۔ ”اور اعتراض تو تباہی کے باپ کو بھی نہیں ہے۔ پر وہ بدلے میں تاجور مانگتا ہے۔“

”کس کا مطلب؟“ وہ جیسے سمجھ کر بھی نہیں سمجھا تھا۔

”وہ بدلے میں تاجور دے کر کہنے لگے۔“ تباہی کی شادی وہ دے پڑے ہی کرے گا۔ اب بتا تاجور کو کیا وہوں اس سے؟“

”ابا۔۔۔ اس کا ذہن ایک لخت ماؤف ہو گیا تھا۔“ یہ سہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا!۔“

”میں نہیں کہہ رہا۔ تباہی کے باپ کی یہی شرط ہے۔ میں نے ابھی اسے جواب نہیں دیا۔ تو سوچ لے۔ اگر تجھے ٹھیک لگتا ہے تو میں ہائی بھر لیتا ہوں۔“

”نہ نہ۔ میں ابا! ابھی آپ کچھ نہ کہیں۔ میں۔۔۔ میں خود آؤں گا۔ خود بات کروں گا۔ آپ۔ آپ بس۔۔۔ وہ بالکل نہیں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کہنا چاہتا ہے۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ ابا نے لائن کاٹ دی تھی، لیکن اس کی سماعتوں میں ابھی بھی ان کی آواز گونج رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کے دماغ کی نیس پھٹنے کو ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہ بے پار دودھ گار بیٹھا تھا۔ کوئی بھی تو نہیں تھا جو اسے دھوکھ پالی ہی پلا دیتا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ انتہائی بے چارگی سے وہ اپنے اطراف ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

جب سے اس نے ابا سے اپنی شادی کی بات کی تھی اسے اپنے پار ٹنٹ میں رونقیں اترتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ چشم قصور میں وہ تباہی کو سراہا وہاں ہر جگہ جلتے پھرتے دیکھ رہا تھا، ابھی لگتا وہ بچن سے اسے پکارتی ہوئی نکل رہی ہے۔ کبھی بالکل نہیں تاجور کے ساتھ کھڑی ہر آئے گئے بر بھرے کرتی، پھر اس کی کھلکھلاہٹیں۔

چھپلے چندوں سے وہ بھی سب سوچتا اور اپنے آپ مسکراتا رہا تھا۔ اپنی راہ میں کسی رکاوٹ کو کیا آزمائش کا بھی

اس نے مکان نہیں کیا تھا اور اس وقت تو وہ کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا۔ ذہن پر ابائی آواز ہتھوڑے پر ساری تھی۔

”وہ بدلے میں تاجور مانگتا ہے۔“

”نہ نہ۔ ابا! وہ پورا اپنے میں بھیگ رہا تھا۔ گھبرا کر بالکلونی میں نکل آیا۔ اس تمام عرصے میں آج پہلی بار وہ اجالے میں بالکلونی میں کھڑا تھا۔

وسط و سبیر کی ہلکی دھوپ ابھی باقی تھی۔ گو کہ سردی نے ابھی اپنا رنگ نہیں جمایا تھا لیکن خوش گوار ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اگر اپنے حواس میں ہوتا تو ضرور سوچتا کہ وہ کتنی سانی شاموں سے محروم رہا تھا۔ پھر اسے ملال بھی ہوتا، جبکہ اب کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ نیچے کیاؤنڈ میں کھلتے پھولوں نے اوہم چار کھا تھا لیکن اس کے کان اس شور سے بھی آشنا نہیں ہو رہے تھے۔ کتنی دیر وہ ماؤف ذہن کے ساتھ بچوں کی بازی دیکھتا رہا پھر اس کی نظرس پھٹی تھیں۔ سامنے کے پار ٹنٹس سے دو لڑکیاں بیٹھیاں اتر رہی تھیں۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ عجیب بے خودی تھی۔ وہ خود کو بھی فراموش کیے کھڑا تھا کہ اچانک اس کے ذہن کو جھٹکا لگا تھا اور یونہی نہیں۔ نظروں کے سامنے جو دو لڑکیاں تھیں ان میں سے ایک مہارت سے بائیک اشارت کر کے بیٹھی اور زن سے بھاگنے لگی تھی۔

اور اسے لگا جیسے اس نے ابھی ابھی جنم لیا ہے۔ اس سے پہلے وہ کیس نہیں تھا۔ اس کے احساسات کو پھر سے زندگی ملی تھی۔ وہ اب دیکھ رہا تھا من رہا تھا اور سوچنے بھی لگا تھا۔



”رازی بھائی پلیز! چلیں ناں سنیل آپنی نے اتنے اصرار سے بلایا ہے۔“ شام صبح سے رازی کی خوشامد کر رہی تھی۔ اور اب تو روہنے کو ہوئی تھی۔

”تم بلال کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں؟“ رازی اس کی روٹی صورت دیکھ کر صاف انکار بھی نہیں کر سکا۔

”نہیں بھائی! بلال تمام راستہ ڈانٹتے ہوئے جاتا ہے۔ میں نہیں جاؤں گی اس کے ساتھ۔“ شام نے مزید منہ پھلا کر کہا۔

”میں سمجھا دیتا ہوں اسے۔ نہیں ڈانٹنے گا۔“

”رہنے دیں میں نہیں جا رہی۔“ شام ناراض ہو کر جانے لگی تب مجبوراً ”رازی کو اٹھنا پڑا۔“

”اچھا چلو اور دو کھو زیادہ روہاں مت رکنا۔“

”نہیں بس تھوڑی دیر بیٹھیں گے۔“ شام خوش ہو گئی۔

”امی کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔ کچھ آؤنگ ہو جائے گی ان کی۔“ رازی نے اس کے ساتھ کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

”سوچ لیں! امی ساتھ جائیں گی تو پھر جلدی واپسی نہیں ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ماموں جی رات میں روک لیں۔“ شام نے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کامیاب ہو گئی۔

”اچھا جاؤ امی سے کہہ آؤ۔ ہم ابھی آتے ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

شام نے کھڑے کھڑے سادہ بیگم کو رازی کے ساتھ جانے کا بتایا، پھر بھائی ہوئی اگر گاڑی میں بیٹھی تھی۔ شاید اسے خدشہ تھا کہ کہیں رازی کا ارادہ بدل نہ جائے۔ رازی نے اس کے پیچھے ہی گاڑی آگے بڑھادی پھر پوچھنے لگا۔

”سنیل نے کس سلسلے میں بلایا ہے؟“

”تم نے پوچھا بھی نہیں۔“

”اوہ بھائی! ہوگی کوئی بات۔ ہو سکتا ہے سربراہ ہو یا پھر صرف محبت میں بلایا ہو۔ میں بھی تو انہیں بلاتی ہوں۔“

”تھنا اس کے سوالوں سے تنگ پڑ کر بولی تھی۔
”وہ تو ٹھیک ہے لیکن سنبل کے ساتھ تمہاری دوستی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرا مطلب ہے اس کی اور تمہاری عمر میں کافی فرق ہے۔“ رازی کے اندر کوئی خوج نہیں تھی۔ سیدھے سادے انداز میں بات کر رہا تھا۔
”تو کیا ہوا؟ سنبل آئی کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ ہماری ماموں زاد ہیں اور رشتہ داری میں عمروں کا فرق آڑے نہیں آتا۔ محبت اور خلوص دیکھا جاتا ہے۔ جہاں۔ زیادہ خلوص ملتا ہے بندہ وہیں بھاگتا ہے۔“
”نا اندر رہی اندر جزبہ ضرور ہوئی لیکن کمال ہوشیاری سے بات سن رہی تھی۔
”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ رازی نے تائید کی تو تھنا کو موقع مل گیا۔
”جی بھائی! مجھے شروع سے سنبل اپنی بہت اچھی لگتی ہیں۔ اتنی محبت کرنے والی میرا دل چاہتا ہے انہیں اپنے گھر لے آؤں۔“

”بھی تو اس کا گھر آگیا۔“ رازی نے گاڑی روک کر تھنا کو دیکھا۔

”تنی جلدی! تھنا کو افسوس ہوا کہ ابھی تو اس نے اصل بات شروع کی تھی۔

”اب تم بھی واپسی کی جلدی کرنا۔“ رازی نے پھر اسے تنبیہ کی اور گاڑی لاٹ کر کے اس کے ساتھ اندر آیا تو پہلے مقام پر ماموں جی اور ماما جی سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں نے اس کی آمد پر جہاں خوشی کا اظہار کیا وہاں شکوہ بھی کہ وہ ادھر کارا تہی بھول گیا تھا۔

رازی نام نہاد کر دھنسی دینے لگا تو تھنا جلدی سے سنبل کے کمرے میں آئی۔

”ارے تم کیسے آئیں؟“ سنبل اچانک تھنا کو دیکھ کر حیران ہوئی۔
”رازی بھائی کے ساتھ۔“ تھنا نے اترا کر خوشی سے بتایا تو سنبل جھینپ کر بولی۔
”تو فرصت مل گئی انہیں۔“

”ارے! آپ کے لیے تو فرصت ہی فرصت ہے۔ پتا ہے صبح سے یہاں آنے کو بے قرار تھے۔ میں ہی کاموں میں الجھی ہوئی تھی۔ خیر اب آپ ورنہ کرس جلدی سے انہیں اپنا دیدار کرا دیں۔“ تھنا بہت چپکے لگی تھی۔

”بہشت ایسی باتیں نہیں کرتے۔“ سنبل نے مصنوعی خفگی سے گھورا تھا۔
”اچھا آپ چلیں تو۔“ تھنا نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو وہ جلدی سے اپنا دپٹہ ٹھیک کرنے لگی پھر تھنا کو چلنے کا اشارہ کر کے اس کے ساتھ لاؤنج میں آگئی۔

رازی ماموں جی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ ماما جی جیسے سنبل کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی محض رازی کو اس کی طرف متوجہ کرنے کی خاطر ادنیٰ آواز میں اس سے مخاطب ہوئیں۔

”بیٹا! چائے آؤ جلدی۔“

”جی! سنبل نے پلٹنے سے پہلے رازی کو دیکھا اور اسے متوجہ نہ پا کر یکن کی طرف بڑھ گئی۔ ٹاپریشان ہو کر اس کے پیچھے بھاگی آئی کہ کہیں جھوٹ کا ٹولہ نہ کھل جائے۔ الزام ماما جی کے سر رکھ دیا۔

”ماما جی بھی بس کیا ضرورت تھی فوراً“ چائے کا کتنے کی۔ ہیلو ہائے تو ہوئے دیتیں۔ بے چارے رازی بھائی۔“

سنبل کچھ نہیں بولی نہ ہی اس کی طرف دیکھا۔ خاموشی سے ایک چوہے پر چائے کا پانی رکھا دو سرے پر کباب

”لے میں مصروف ہو گئی۔“

”اوہو سنبل آئی! اب آپ تو نہ اپنا موڈ خراب کریں۔“ تھنا کو کھسیا ہٹ میں اب کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔
”سیرا موڈ ٹھیک ہے تم چلو میں یہ لے کر آئی ہوں۔“ سنبل نے کباب پلیٹ میں نکالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ارے واہ! میں کوئی مہمان تھوڑی ہوں جو جا کر آرام سے بیٹھ جاؤں اور یہ آپ اتنا تکلف کیوں کر رہی ہیں؟ بس چائے ٹھیک ہے ویسے بھی رازی بھائی اس وقت کچھ نہیں کھاتے۔“

”میں صرف رازی کے لیے تو نہیں بنا رہی۔ چلو! یہ لے جاؤ۔“ سنبل نے کتے ہوئے ٹرے اٹھا کر تھنا کے ہاتھوں میں تھمادی۔

”اور آپ؟“ تھنا اندر سے کچھ خائف ہو گئی تھی۔
”میں چائے لے کر آتی ہوں۔“

”جلدی آئیے گا۔“ تھنا کو فی الوقت بھاگنے میں عافیت نظر آئی۔ لیکن وہ بارمانے والی نہیں تھی۔ اس نے تہہ کر لیا تھا کہ اریبہ کا پتا صاف کر کے رہے گی اور سنبل کو ہی اپنی بھابی بنائے گی۔

خاصا خوش گوار ماحول تھا۔ یاسمین اور شہباز ربانی اریبہ اور سارہ کو اپنے بچپن کے قصے سن رہے تھے اور وہ دونوں بڑی محظوظ ہو رہی تھیں کہ اچانک یاد آنے پر سارہ بولی تھی۔

”ارے آج تو ویک اینڈ ہے ڈیڈی آئیں گے۔“
”یاسمین نے ایک دم شہباز ربانی کو دیکھا۔ وہ بھی اس خبر سے کچھ بے چین ہو گئے تھے۔

”ہاں۔“ کماؤ ڈیڈی نے یہ ہی تھا کہ اب ہر ویک اینڈ پر آیا کریں گے دیکھو۔“
”اریبہ کے انداز میں بے اعتباری تھی پھر شہباز ربانی سے پوچھنے لگی۔ انکل آپ ڈیڈی سے ملے ہیں؟“

”ہوں۔“ شہباز ربانی چائے کا سپ لے رہے تھے۔ کپ نیچے کر کے ”ہوں“ کی آواز سے زیادہ گردن اثبات میں ہلائی پھر کہنے لگے۔ ”شادی میں ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد دو ایک بار سامنا ہوا“ پھر میں باہر چلا گیا۔

اب تو شاید وہ مجھے پہچانیں گے بھی نہیں۔“
”آپ انہیں پہچانیں گے؟“ سارہ نے فوراً پوچھا۔

”کیوں نہیں۔ اگر ان میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی ہوگی تو ضرور پہچان لوں گا۔“ شہباز ربانی نے قصداً ”محظوظ انداز اختیار کیا پھر یاسمین کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ کسی سوچ میں بیٹھی تھی۔

”چلیں دیکھتے ہیں ڈیڈی آپ کو پہچانتے ہیں کہ نہیں۔“ سارہ نے مشتاق انداز میں کما تب ہی گاڑی کے بارن کی آواز آئی تو اریبہ نے ساختہ حیرت سے بولی تھی۔

”واقعی ڈیڈی آگئے۔“
”یاسمین نے چونک کر اریبہ کو دیکھا پھر ایک دم اٹھ کر اندر چلی گئی۔ چونکہ اریبہ کے سامنے وہ اپنا خدشہ بیان کر چکی تھی کہ توصیف احمد شہباز ربانی کے آنے پر اعتراض کریں گے اس لیے اسے یاسمین کے جانے پر تعجب نہیں ہوا البتہ سارہ ضرور حیران تھی۔

شہباز ربانی کو اپنی پوزیشن عجیب ڈلگ رہی تھی خود کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ توصیف احمد بیٹیوں کو دیکھ کر اسی طرف آگئے تو وہ دونوں اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

”ایسا غلطی کی ہے میں نے؟ برسوں بعد میرا کوئی عزیز باہر سے آیا ہے مگر میں نے اسے یہاں ٹھہرا لیا ہے تو کون
نیا مت آگئی ہے۔“ یاسمین نے آواز دیالی تھی، لیکن لہجہ ہنوز جھکھا سلگتا ہوا تھا۔
”اٹ اب، مجھے تمہارا کوئی عذر نہیں سنتا۔ اپنے عزیز سے کواپنا ٹھکانا کہیں اور کر لے، میرے گھر میں اس
کے لیے کوئی جگہ نہیں۔“ انہوں نے غصے سے کہا۔

”ٹھیک ہے تو پھر ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے۔“ یاسمین نے دھمکی دی۔
”ہم سے مطلب؟“ توصیف احمد کی آواز جانے غصے کی انتہا پر جا کر دم توڑ گئی تھی یا یاسمین کی دھمکی کام کر گئی
تھی۔

”میں اور میرے بچے۔“ یاسمین گردن اٹھا کر بولی تھی۔
”بچے؟ بچوں کا نام مت لیتا، اگر تم نے بھی ایسا سوچا بھی تو میں انجام کی پروا کیے بغیر تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“
ان کے عجیب کی سنگینی سے یاسمین مرعوب نہیں ہوئی، الٹا ہاتھ اٹھا کر کہنے لگی۔

”بس تو توصیف! اپنی انرجی وِسٹ مت کرو۔ بچوں کی نظروں میں اب تمہارا وہ مقام نہیں رہا، تم نے خود اپنے
آپ کو ان سے دور کیا ہے۔ اس کے بعد تم یہ توقع کیسے کر رہے ہو کہ بچے مجھے اکیلا کہیں جانے دیں گے؟ جہاں
میں جاؤں گی وہ میرے ساتھ جائیں گے۔“

”لگتا ہے شہباز ربانی نے بڑا آسرا دے دیا ہے تمہیں۔“ توصیف احمد نے چبھتا ہوا طنز کیا، یاسمین تلملا گئی
تھی۔
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”تم اچھی طرح جانتی ہو، مجھے تمہیں آئینہ دکھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ توصیف احمد کہہ کر کارنر کی طرف
بڑھ گئے گاڑی کی چابی اٹھائی، پھر اسے دیکھ کر بولے تھے۔
”میں جا رہا ہوں۔ دوبارہ آؤں تو شہباز ربانی یہاں نہیں ہونا چاہیے۔“

”وہ اپنی مرضی سے یہاں نہیں رہ رہا۔“ یاسمین بتانا چاہتی تھی کہ اریبہ زہرہ سستی اسے لے کر آئی ہے، لیکن
توصیف احمد اس کی بات پوری ہونے تک رکتے ہی نہیں، یوں اس کے قریب سے نکل کر گئے جیسے کچھ سننا ہی
نہیں چاہتے۔

یاسمین کھولتی رہ گئی اپنی بے بسی پر، کیونکہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ خواہ کتنی من مانی کر لے، اس گھر میں
وہی ہو گا جو توصیف احمد چاہیں گے۔ وہ کسی طرح بھی انہیں یہاں سے مکمل طور پر بے دخل نہیں کر سکتی۔ گھرانے
کا اولاد ان کی اور وہ گھر اور اولاد کی تمام ذمہ داریاں نبھائیں رہے تھے۔ اگر ان کی طرف سے کوئی کوتاہی ہوئی تب تو
وہ ان کے خلاف باقاعدہ محاذ بناسکتی تھی مگر ایسا نہیں تھا، جب ہی اس نے اریبہ پر گرفت رکھی تھی اور اسے اپنے
لیے ڈھال کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ ابھی بھی اس سے صبر نہیں ہوا، اسی وقت اریبہ کے کمرے میں آگئی۔

اریبہ اپنی رائفلنگ نیبل پر بیٹھی اسٹڈی میں مصروف تھی اور سارہ بیڈ پر نیم دراز کسی میگزین میں محو۔ دروازہ
کھلنے پر دونوں ہی ادھر متوجہ ہوئی تھیں۔
”تم دونوں ابھی سوئی نہیں؟“ یاسمین دونوں کے دیکھنے پر فوراً ”یہی کہہ سکی۔“

”ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں ماما!“ اریبہ نے وال کلاک پر نگاہ ڈال کر کہا۔
”ڈیڈی سو گئے؟“ سارہ نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں، وہ چلے گئے۔“ یاسمین نے بولنگاہیں چرا لیں جیسے پشیمان ہو رہی ہو۔

”کیوں؟“ سارہ کے لہجے میں حیرت کے ساتھ احتجاج بھی تھا۔

”علیکم السلام!“ توصیف احمد بہت اچھے موڈ میں تھے خوش ہو کر جواب دیا، پھر شہباز ربانی پر نظر پڑی تو نہ
صرف غصے بلکہ پیشانی پر شکنیں بھی نمودار ہو گئی تھیں۔
”ڈیڈی! یہ شہباز انکل ہیں، ماما کے بھائی۔ آپ تو جانتے ہوں گے انہیں۔“ اریبہ نے ان کی پیشانی سکرتے
دیکھ کر فوراً متعارف کرایا۔

”جانتا تو میں ہوں، بس ایک دوبار ملاقات ہوئی تھی۔ ہیلو!“ توصیف احمد نے اریبہ کو جواب دے کر شہباز
ربانی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔
”ہیلو۔“ شہباز ربانی نے اٹھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

”فرسٹ کلاس، آپ کب آئے؟“ توصیف احمد کا انداز بے حد سرسری تھا۔
”کچھ دن ہوئے۔“ شہباز ربانی نے بتایا اور اس سے پہلے کہ توصیف احمد کوئی اور سوال کرتے اریبہ بول پڑی۔
”ڈیڈی! آپ بیٹھیں نا۔ سارہ اوڈی کے لیے چائے لاؤ۔“

”میرا خیال ہے ڈیڈی پہلے سوچ کر کریں گے۔“ کیوں ڈیڈی! سارہ نے کہہ کر توصیف احمد سے تصدیق چاہی تو
انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر پوچھا۔
”آپ کی ماما کہاں ہیں؟“

”مادر ہیں۔“ چٹس میں آپ کے کپڑے نکال دوں۔ میں نے صبح ہی پریس کر دیے تھے۔“ سارہ اپنے انداز میں
بولتی ہوئی توصیف احمد کے ساتھ اندر چلی گئی تب اریبہ نے شہباز ربانی کی طرف دیکھا تھا۔ شہباز ربانی بہت اداس
لگ رہے تھے۔



یاسمین جانتی تھی کہ توصیف احمد اس سے شہباز ربانی کے بارے میں سوال جواب ضرور کریں گے اور اس کا
مسئلہ یہ تھا کہ وہ خصوصاً توصیف احمد کے ساتھ آرام سے بات کر ہی نہیں سکتی تھی۔ بہت جلدی آئے سے باہر
ہو کر چیتنے چلانے لگتی تھی، لیکن ابھی وہ ایسا نہیں چاہتی تھی کیونکہ گھر میں شہباز ربانی موجود تھے اس لیے وہ خود کو
بہت سمجھا کر کمرے میں آئی تھی۔

توصیف احمد صوفے پر بیٹھنے کا بی بی رہے تھے۔ فوری طور پر انہوں نے یاسمین کے آنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔
آرام سے کافی پیئیں میں مصروف رہے۔ یاسمین گزشتہ کی طرح پہلے واش روم میں گئی۔ اس کے بعد الماری کھول کر
کھڑی ہو گئی۔ توصیف احمد سائیز میں بیٹھے تھے۔ الماری کا پٹ کھلا ہونے کے باعث انہیں صرف یاسمین کی پشت
نظر آ رہی تھی۔

”شہباز بیٹھیں رہ رہے ہیں؟“ توصیف احمد نے کافی کا آخری گھونٹ لے کر یاسمین کو مخاطب کیے بغیر پوچھا تھا۔
”تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ یاسمین کو کہہ کر بہت سمجھا کر آئی تھی، پھر بھی سیدھا جواب نہیں دے سکی۔
”بالکل!“ توصیف احمد خالی مک نیبل پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”وریہ محض اعتراض نہیں ہے“

”تمہیں خود سمجھنا چاہیے، گھر میں جوان بیٹیاں موجود ہیں۔“
”تو؟“ یاسمین نے زور سے الماری کا پٹ بند کر کے انہیں خونخوار نظروں سے دیکھا تھا۔
”کنٹرول یور سیلف یا سمین! چیچ چلا کر اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش مت کیا کرو۔“ انہوں نے انتہائی
نکتہ لہجے میں ٹوکا۔

ارنبہ نے ایک نظر سارہ کو دیکھا پھر اٹھ کر یاسمین کے قریب چلی آئی۔
”کیا ہوا ماما، کیوں چلے گئے ڈیڈی؟“

”بیٹا وہ شہباز، میرا مطلب ہے ان ہی کی وجہ سے، اب بتاؤ میں شہباز سے کیسے کہوں کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔“ یاسمین بے بسی کی تصویر بن گئی۔

”اوہو ماما! آپ اتنا ڈرتی کیوں ہیں، آئیے! یہاں بیٹھیں۔“ ارنبہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بیڈ پر بٹھایا، پھر پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

”آپ بتائیں، کیا کہا ہے ڈیڈی نے؟“

”ناراض ہو رہے تھے کہ شہباز یہاں کیوں آئے ہیں اور یہ کہ میں انہیں فوراً جانے کا کہہ دوں۔ میرے لیے تو یہ بہت مشکل ہے بیٹا! تم کسی طرح۔“ یاسمین نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ توصیف احمد کو ناراض نہیں کر سکتی۔

”آپ بھی کمال کرتی ہیں ماما! کھر آئے مہمان سے ہم کہیں کہ اپنا پورا بستر سمیٹو، امپاسل، ایسی غیر اخلاقی حرکت میں کروں گی نہ آپ۔“ ارنبہ ہنسنے سے اکھڑنے لگی تھی۔

”تو پھر کیا کریں بیٹا! تمہارے ڈیڈی بھی تو۔“ یاسمین اچھٹے لگی۔

”ڈیڈی کچھ بھی نہیں۔ آپ شہباز انکل سے جانے کو نہیں کہیں گی۔ آخر، آخر رواداری بھی کوئی چیز ہے ناپسندیدہ مہمانوں سے بھی بندہ ایسا سلوک نہیں کرتا، حیرت ہو رہی ہے مجھے ڈیڈی پر۔“ ارنبہ برہمی سے کہتے ہوئے آخر میں سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”وہ کچھ دنوں کی بات ہے۔ شہباز گھر دیکھ رہے ہیں۔“ یاسمین سوچنے کے انداز میں بولی تھی۔
”چلیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ ڈیڈی کو ہم منالیں گے۔“ اس نے کہہ کر سارہ کو دیکھا۔ وہ ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے کچھ پریشان بیٹھی تھی۔



وہ رات بہت دیر سے یہاں پہنچا تھا۔ شہر کی نسبت یہاں سردی زوروں پر تھی۔ وہ بس کھڑے کھڑے ہی اپا سے ملا، پھر جو موٹے ٹاف میں کھس کر سویا تو اگلے دن دوپہر میں اٹھا تھا۔ خلاف توقع کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس نے گردن اونچی کر کے ادھر ادھر دھرو دواڑے سے باہر تک نظروں ڈالی، پھر بہن کو پکارنے لگا۔
”تاج۔ تاجو!“

”جی بھائی!“ تاجور بھاگی آئی تھی۔ ”آپ اٹھ گئے؟“

”اٹھ ہی گیا ہوں۔“ وہ اپنے پیچھے تکیہ اونچا کر کے بیٹھا پھر پوچھنے لگا۔ ”باقی سب کہاں ہیں؟“
”ابا تو شام میں ہی آتے ہیں۔“ خالہ روٹی پکا رہی ہیں، آپ تو پہلے چائے پیو گے؟“ تاجور نے جواب کے ساتھ کہا۔

”ہاں، لیکن ابھی تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔“ اس نے کہنے کے ساتھ کھٹک کر تاجور کے لیے جگہ بنائی تو وہ آکر بیٹھ گئی۔

”آپ پہلے اپنا حال چال سناؤ، اچھی تو ہونا؟“ اس نے تاجور کے روکھے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پتیار سے پوچھا۔

”جی بھائی، میں ٹھیک ہوں، پردہ تاہاں ہے نا، بہت سرد رہی تھی۔“ اس معصوم لڑکی کو اپنا غم نہیں تھا بھائی اور تاہاں کے لیے پریشان تھی۔

”کیوں۔ کیوں سرد رہی تھی؟“ اس نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

”وہ پتا نہیں۔“ تاجور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

”ابا گل ہے۔“ اس نے سر جھٹکا، لیکن تاہاں کا خیال نہیں جھٹک سکا تھا۔ جب ہی ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔
”بھائی! چائے لاؤں؟“ قدرے رک کر تاجور نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”چائے۔“ تاجور جانے کیوں خائف ہو گئی تھی۔

”ہاں! بناؤ۔“ اس نے کہا پھر ایک دم تاجور کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”ایک منٹ! یہ تمہاری گردن پر نشان کیا ہے؟“
”کہاں؟“ تاجور مزید سہم گئی۔

”یہ۔“ اس نے انگلی کی پورے نشان کو چھوا تو تاجور کے ہونٹوں سے بے ساختہ سسکی نکل گئی۔

”دروہو رہا ہے۔“ وہ فوراً انگلی کھینچ کر تاجور کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”وہ۔۔۔ بھائی دوپٹہ پھنس گیا تھا۔“ تاجور کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا، بھوت بول رہی ہے۔

”دوپٹہ پھنس گیا تھا، کہے؟“ وہ اچانک بہت پریشان اور مفلک ہو گیا تھا۔

”نہیں۔ وہ میرے گلے میں دوپٹہ تھا۔“ اس نے کھینچا تو یہاں سے چھل گیا تھا۔ اب تو ٹھیک ہو گیا ہے۔ درد بھی نہیں ہے۔“ تاجور اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”تم کچھ کہہ رہی ہو؟“

”ہاں، جی بھائی! میں چائے لاتی ہوں۔“ تاجور اٹھ کر تیزی سے بھاگی تھی۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں تو پتھم سے اماں کا چہرہ سامنے آ گیا۔

”میں کیا کروں اماں! تاجور کے لیے ہی سوچا تھا کہ شادی کر لوں، پھر بیوی کے ساتھ اسے بھی اپنے ساتھ شہر لے جاؤں گا، میرا یہاں تو اور مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔“ وہ دل ہی دل میں اپنی اماں سے باتیں کر رہا تھا کہ دوسری اماں کی آواز پر چونک کر آنکھیں کھول دیں، وہ کہہ رہی تھیں۔

”لو، بیٹھے بیٹھے سو گیا۔“

”نہیں! بس۔۔۔“ اس نے ان کے ہاتھ سے چائے کا کلم لے لیا۔

”روٹی پک گئی ہے، پہلے کھا لیتے پھر چائے پیتے۔“ اماں کہتے ہوئے بیٹھ گئیں۔ وہ کچھ نہیں بولا، چائے کا کلم ہونٹوں سے لگا لیا تو قدرے رک کر اماں پوچھنے لگیں۔

”پھر تم نے کیا سوچا؟“

”کس بارے میں؟“ وہ قصداً ”انجان بن گیا“ ورنہ ان کے بیٹھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کس مقصد سے بیٹھی ہیں۔

”وہی اپنی اور تاجور کی شادی کا۔“ اماں نے جتنے آرام سے کہا اس کے اندر اسی قدر تلخی بھر گئی تھی۔ لیکن وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب ہی ضبط سے گویا ہوا۔

”میری شادی تک تو ٹھیک ہے، پر تاجور کی ابھی نہیں۔“

”پھر کب؟“ اماں نے بے صبری سے پوچھا۔

”اس بارے میں ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ اس کی ساری توانائیاں اپنے اندر اٹھتے ابال کو دبانے میں صرف ہو رہی تھیں۔

”لو! پھر تمہاری شادی ابھی کیسے ہوگی۔ وہ تو کہتا ہے پہلے گھر میں بیوی لاؤں گا، پھر تاہاں کو رخصت کر دوں گا۔“ ٹھیک ہے لے آئے بیوی، میں انتظار کروں گا۔“ وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا، کیونکہ اب جو اماں کہتیں وہ سننا نہیں

سانوں اک پل چین نہ آئے
جنا تیرے بنا

گوکہ دھیمی آواز میں نیپ بج رہا تھا۔ پھر بھی آواز باہر تک آرہی تھی۔ سارہ نے قدرے توقف کیا، پھر ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔

سمیر ایک بازو آنکھوں پر رکھے سیدھا لیٹا جانے سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ سارہ کو اندازہ نہیں ہوا۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ہینڈل کے قریب رک کر چند لمحے دیکھتی رہی پھر بڑھ کر ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا۔

سمیر نے فوراً آنکھوں سے بازو ہٹایا اور اسے دیکھ کر ناگواری سے بولا تھا۔

”کیوں آئی ہو؟“

”میری پھوپھو کا گھر ہے، جب مل چاہے گا، آؤں گی۔“ سارہ نے قصداً ”بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔“

”پھوپھو کا گھر ہے۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ ”تو جاؤ پھوپھو کے پاس۔ میرے کمرے میں کیا لینے آئی ہو؟“

”تمہارے کمرے میں سے ہی کیا۔“ وہ چڑا کر بولی۔

”دیکھو!“ وہ غصے سے انگلی اٹھا کر کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتے ہو۔“

”تمہیں میری ناراضی کی پروا ہے؟“ سمیر کا لہجہ ہنوز غصے بھرا تھا۔

”نہ ہونی تو آئی کیوں؟“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”بڑی جلدی آگئیں۔“ سمیر نے طنز کیا، جس پر وہ سنگ گئی۔

”تم اچھی طرح جانتے ہو میرا کمرہ کتنا کم ہی ہوتا ہے، ابھی بھی کالج سے آرہی ہوں اور اگر اب تم نے کوئی فضول بات کی تو میں اسی وقت چلی جاؤں گی۔“

”ہاں تو جاؤ۔ کس نے منع کیا ہے۔“ وہ کہنے کے ساتھ اٹھا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

سارہ نے غفلت سے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

”زیادہ اترائے کی ضرورت نہیں ہے، ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری، آ نہیں سکتی تھیں، فون تو کر سکتی تھیں۔“ وہ حد درجہ شاک تھا۔

”ایک بار نہیں، کتنی بار کیا اور پرسوں تو رات گیا رہ بجے کیا تھا، تب بھی تم گھر پر نہیں تھے۔ آخر کہاں رہتے ہو؟“ وہ باقاعدہ لڑنے پر تیار ہو گئی۔

”کہیں بھی رہتا ہوں۔ تم میرے سیل پر فون کر سکتی تھیں۔“

”جی نہیں، میں نہ سیل رکھتی ہوں نہ کسی کے سیل پر فون کرتی ہوں۔“

”میں“ کتنی نہیں ہوں۔“ وہ زور دے کر بولا، پھر ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ ”پاگل ہوں میں اپنے آپ جانے کیا کچھ فرض کر لیتا ہوں۔“

”میں تم سے بڑی پاگل ہوں، جو یہ سمجھ بیٹھی کہ تم کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتے۔“ سارہ نے سر جھٹک کر خود پر تاسف کا اظہار کیا۔

”ہاں تو میں کب ناراض ہوا، غصہ آتا ہے تمہاری باتوں پر اور جو خواہ مخواہ کی فکریں تم نے پال رکھی ہیں

ہمارے راز ہی بھائی اور اس پر۔“ وہ نرم ضرور پڑ گیا تھا، لیکن شکوہ کرنے سے پھر بھی باز نہیں آیا۔

”تم اسے خواہ مخواہ کی فکریں سمجھتے ہو۔“ وہ انتہائی تاسف سے بولی۔ سمیر ہنسا گیا۔

”نہیں۔ میرا مطلب ہے تم کچھ زیادہ ہی۔“

”ہاں میں کچھ زیادہ ہی محسوس کرتی ہوں۔“ وہ آزدگی میں گھر گئی۔

”اور یہ ہی میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ یہ ٹھیک نہیں ہے اپنی عمر دیکھو اس عمر میں لڑکیاں ہنسی گنگنائی اور خوب صورت خواب سجا کر ان میں کھوئی رہتی ہیں اور تم۔“ سمیر نے نرمی سے سمجھانے کے ساتھ اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

”تمہیں لڑکیوں کے بارے میں کیسے پتا؟“ وہ الٹا شکوک ہو گئی۔ سمیر پھر جھنجھلا گیا تھا۔

”میں نے پڑھا ہے، فلموں میں بھی دیکھا ہے اور صرف لڑکیاں ہی نہیں بلکہ کئی اس عمر میں ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔“

”تو میں کیا کروں۔“ اس نے پھر بے نیازی دکھائی۔ ایسے وقت وہ یہ ہی کرتی تھی۔ جانے کیوں وہ اسے جھنجھلاتا ہوا اچھا لگتا تھا۔ اسے چھین کر وہ محفوظ ہوئی تھی۔

”تم؟“ سمیر اس کے قریب آکر بولا تھا۔ ”تم میرے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں۔ میں جو تم سے اپنی محبت کا اعتراف کر چکا ہوں۔ کیا میرے اعتراف نے بھی تمہاری سوچوں کے دروازے نہیں کھول دیے؟“

”پہلے تم سو رہو۔“ وہ نرم سے ہو گئی تھی۔

”اول ہوں۔ پہلے میری بات کا جواب دو۔“ سمیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”مجھے نہیں پتا میں تم سو رہا ہوں۔ پھر میں کبھی نہیں آؤں گی۔“ وہ اسے دھکیلتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے مت جتاؤ میں خود جان لوں گا۔“ وہ پیچھے ہٹ گیا۔

”کیا جان لو گے؟“

”یہی کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ ویسے یہ تو میں جان گیا ہوں کہ تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اب خدا کے لیے رمت کہہ دینا کہ تم اس پر آمادہ اور رازنی کے بغیر بھی نہیں رہ سکتیں۔“ سمیر نے دوسری بات ہاتھ جوڑ کر کی تو وہ بمشکل ہنسی ضبط کر کے بولی تھی۔

”ہاں تو میں رہ سکتی ان کے بغیر بھی۔“

”لیکن وہ سب تمہارے بغیر رہ سکتے ہیں۔“ سمیر نے زور دے کر کہا۔

”اور تم۔“ اس نے انتہائی معصومیت کا مظاہرہ کیا۔

”میں کیونکہ پاگل، احمق ہوں، اس لیے شاید نہ رہ سکوں، لیکن میں کوشش ضرور کروں گا، بلکہ مجھے ابھی سے پیکس شروع کر دینی چاہیے، کیونکہ تمہارا کوئی بھروسہ نہیں، دوسروں کی فکر میں دبی تو ہو ہی گئی ہو، کسی بھی وقت اس جہان فانی سے کوچ کر سکتی ہو۔“ وہ تپ کر بول رہا تھا اور اسوہ کی طرح اپنی ہنسی نہیں روک سکی تھی۔

نہروالے باغ کا وہ مخصوص گوشہ آج بڑے دنوں بعد ان دو محبت کرنے والوں کی آماجگاہ تھا۔ اس گوشے میں مختلف اقسام کے پھولوں کی بہتات تھی۔ رنگ پرنگے پھول جنہیں دیکھ کر چھو کر وہ باتیں کرتے تو ان کے لہجوں میں بھی پھولوں جیسی۔ نرمی اور خوشبو سما جاتی تھی اور انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ ان کی باتوں سے پھولوں میں کیسی اپن چلتی تھی۔ بے شک وہ انسان نہیں، جان دار تو تھے۔ خود پر نرم انگلیوں کا لمس محسوس کرتے تھے اور ان کے

جانے بعد آپس میں ان کی باتیں کرتے اور پھر ان کا انتظار۔ اور اس بار طویل انتظار کے بعد وہ دونوں آئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی پھولوں میں پہلے مٹی خیز مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر وہ خوشبو لہجے سننے کو بے قرار تھے، لیکن یہ کیا۔۔۔

تایاں رو رہی تھی۔ آنسو ایک تو اتارے اس کی پلکوں سے جدا ہو کر نرم مٹی میں جذب ہو رہے تھے اور شمشیر علی جو ہمیشہ اس کی ذرا سی خفگی پر بے قرار ہو جاتا تھا، وہ خود کو ضبط کے کڑے پیروں میں مقید کیے بیٹھا تھا۔ آنسو پونچھتا تو کجا اسے ٹوکا تک نہیں اور نکتی در بعد گویا ہوا تھا۔

”شاید اسی کو قسمت کہتے ہیں۔ جس کے سامنے ہمارے مضبوط عزائم“ اور بے اور محبت تک بے بس ہو جاتی ہے، لیکن میں نے تو کبھی خدائی خدائی کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ ہر موڑ پر اس کا شکر گزار رہا کہ اس نے مجھے ہمت دی، ثابت قدم رکھا، پھر۔۔۔“ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

تایاں اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹ کر اسے دیکھنے لگی، پھر ایک دم اس کا بازو تھام کر بولی تھی۔

”میں مرحاؤں کی شمشیر! تمہارے بغیر مرحاؤں کی، کچھ کرو۔“

”کیا کروں؟ سیدھے طریقے سے رشتہ بھیجاؤ۔“ وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں۔۔۔ پر اپنا اپنی بات سے نہیں بٹے گا۔“

”اور میں اپنی معصوم بہن پر ظلم نہیں کر سکتا۔“

”تو ابھی اس پر ظلم نہیں ہو رہا کیا؟ تم تو شہر میں آرام سے رہتے ہو اور اسے یہاں پیٹ بھرونی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ میرا ابا کم از کم اسے روٹی کو تو نہیں ترسائے گا۔“ تایاں نے کہا تو وہ بہت ضبط سے گویا ہوا۔

”خود غرضی مت دکھاؤ، تایاں! نہ مجھے اس پر اکساؤ۔ میں اپنے دل کی خوشی کے لیے بہن کو قربان نہیں کر سکتا اور وہ صرف میری بہن نہیں، بیٹی بھی سمجھو۔ بچپن میں اسے میں نے لوریاں سنائی ہیں، ہانسیوں میں جھٹکایا ہے، ہاں کی گود تو اسے میری نہیں آتی۔ اس کے لیے سب کچھ میں تھا اور ہوں اور یہ دوری بھی میں صرف اس لیے برواشت کر رہا ہوں کہ اسے اچھی زندگی دے سکوں اور اگر ابھی میں نے فوری شادی کا سوچا تو وہ بھی اس کی خاطر، کیونکہ میں اسے وہاں اکیلا نہیں رکھ سکتا۔“

”تو تم ناجور کے لیے؟“ تایاں اچانک جیسے پاتال میں اتر گئی تھی۔

”ہاں، لیکن اسے تم میری محبت کے ترازو میں مت رکھو۔ تم میری محبت ہو، ناجور میرا فرض اور میں تمہیں صاف بتا دوں اگر محبت اور فرض میں کسی ایک کے انتخاب کا مرحلہ آگیا تو میرے لیے فرض زیادہ اہم ہے۔“

تایاں گنگ ہو گئی تھی، شاید شکندھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر خاموش ہو گیا، لیکن پھر رہا نہیں گیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے کہنے لگا۔

”دیکھو، اس سے یہ مت سمجھ لو کہ مجھے تم سے محبت نہیں۔ میری محبت صرف تم ہو اور تمہارے حصول کے لیے جو جائز اقدام تھا، وہ میں نے کیا۔ اس سے ہٹ کر اگر تم کچھ چاہو گی تو وہ میں نہیں کر سکتا، کیونکہ پہلی بات تو یہ کہ میں نے صاف تمہاری زندگی گزار دی ہے، دوسرے میں بہت پر یکیشیل آدمی ہوں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تم اپنے ابا کو راضی کر لو کہ وہ لے لے کے شے کی ضد چھوڑ دیں۔“

”ابا نہیں مانے گا۔“ تایاں کے حلق سے زندھی آواز نکلی تھی۔

”تم نے کوشش کی؟“

تایاں نفی میں سر ہلانے لگی۔

”تو کرو کوشش، یہ تمہارا حق ہے۔ میں انتظار کر سکتا ہوں، جتنا تم کوگی، سال دو سال، دس سال، سمجھ رہی ہو

تایاں نے سمجھنے نہ سمجھنے کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔ سر جھکا کر نرم مٹی پر ہاتھ پھیرنے لگی تھی۔



وہ تایاں کو بھیج کر خود دوسرے راستے سے گھر آیا تھا اور ابھی دروازے پر تھا کہ اندر سے آتی اماں کی تیز آواز پر اس نے قدم روک لیے تھے وہ کہہ رہی تھیں۔

”مخوس کمریاں جلی! کہہ نہیں سکتی بھائی سے کہ تو اس رشتے پر راضی ہے۔“

”آپ کہہ دو خالہ!“ تاجور کی رندھی آواز منت بھری تھی۔

”کیوں تیری زبان گھٹتی ہے“ ایسے تو بڑی میرے خلاف درغلاقی ہے۔ سب پتا ہے مجھے، جتنی چغلیاں تو اس سے کرتی ہے۔“

”نہیں خالہ۔“

”خالہ کی پکی! جانے دے، ذرا شمشیر کو پھردیکھ تیری کسی گت بناتی ہوں۔“

اس کا دل چاہا ایک دم دروازہ کھیل کر اندر جائے اور اس عورت کو شوٹ کر دے، لیکن وہ غصے میں کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ یہ اس کی بیشہ سے عادت رہی تھی۔ پہلے خود پر کنٹرول کرتا پھر سوچ سمجھ کر تھاکل کے سامنے جاتا تھا۔ جیسے ابھی تایاں کو اس نے کوئی جھوٹی آس نہیں دلائی تھی۔ سوچ سمجھ کر اور اپنے طور پر فیصلہ کر کے اس سے ملا تھا اور صاف بات کی تھی۔ ابھی بھی وہ اندر جانے کے بجائے گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ بنے چوترے پر بیٹھ گیا تھا۔ گوکہ اس کا دم دم سنگ رہا تھا۔ تاجور کے لیے تڑپ الگ تھی کہ اسے سینے میں بھیج کر اپنا مان دے، لیکن بیشہ کی طرح اس نے پہلے اپنے غصے پر قابو پانا ضروری سمجھا اور اس سخی میں وہ مدد حال ہو رہا تھا کہ کندھے پر ہاتھ لگنے سے چونک کر دیکھا تاں اس سر پر کھڑے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ دھڑکیوں بیٹھا ہے؟“ اس نے بار بار وہ نفی میں سر ہلادیا۔

”اندر چل، رضائی شرانی میں بیٹھ، ہمیں تو ٹھنڈ لگ جائے گی۔“

”ٹھنڈ یہاں تو لاؤ دیک رہا ہے۔“ اس نے سوچا، پھر ابا کا بازو تھام کر اٹھ کھڑا ہوا، جھینٹا۔“ اسے اس وقت سہارے کی ضرورت تھی۔

ابا کے ساتھ اندر آیا تو اس کی نظروں نے پہلے تاجور کو تلاش کیا۔ وہ تل بر جھوٹے برتنوں کے ڈھیر میں بیٹھی تھی جبکہ سردی بڑھ رہی تھی اور وہ جو پہلے غصے کو دیا تھا، پھر بات کرتا تھا، اچانک چپ چاپ۔

”ابا! کچھ احساس ہے آپ کو کہ نہیں؟ تاجور کی جان دیکھیں اور کام دیکھیں۔ کیوں اسے مارنے پہ تلے ہیں آپ؟“

”ہیں۔“ ابا نے تاجور کو دیکھا، پھر اسے دیکھ کر بولے۔ ”برتن دھو رہی ہے، کوئی پہاڑ نہیں کھود رہی، اور تو فکر نہ کر! یہ مرنے والی نہیں ہے، بڑی سخت جان ہے۔“

”ابا! اس نے انتہائی تاسف سے ابا کو دیکھا، ان سے مزید کچھ کہنا نہ کار تھا۔

”چل تو اندر چل، وہ برتن دھو کر آجائے گی۔“ ابا کہتے ہوئے اندر چلے گئے تو وہ تیزی سے تاجور کے پاس آیا تھا۔

”تنی سردی میں پانی میں بیٹھی ہو، چلو اٹھو۔“

”بس بھائی! یہ برتن۔“

”بھاڑ میں گئے برتن۔“ وہ دھاڑا تھا۔ تاجور سہم کر رونے لگی، لیکن اس نے پروا نہیں کی۔ اسے بازو سے پکڑ کر

کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا اور لحاف میں بٹھا کر کہنے لگا۔

”تم خود اپنی جان کی دشمن ہو۔ کیا ضرورت تھی برتنوں کا ڈھیر لے کر بیٹھنے کی۔ یہ کام دن میں بھی ہو سکتا ہے۔ ہاتھ دیکھو کیسے ٹھنڈے برف ہو رہے ہیں۔“ تاجور کچھ نہیں بول پائی۔ پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھتی رہی۔

”اب خبردار جو یہاں سے اٹھیں تو تمیں چائے لانا ہوں۔“ وہ اسے متنبہ کر کے کمرے سے نکل کر پکچن میں آیا، یوں بھی پکچن کے کام وہ لکھا کرتا تھا اس لیے اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ بہت جلدی چائے لے کر واپس اندر آیا تو تاجور لحاف میں منہ گھٹیڑے بری طرح کھائیں رہی تھی۔

”ایا اللہ!“ وہ پریشان ہو گیا، چائے کے گک ایک طرف رکھ کر وہ لحاف کے اوپر سے تاجور کی پیٹھ سہلانے لگا۔

لیکن اس کی کھانسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ تب وہ اس کے منہ سے لحاف ہٹا کر کہنا چاہتا تھا کہ ”تھو چائے لی لو“ لیکن اسے دیکھتے ہی اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔ کھانسی کے ساتھ تاجور کے منہ سے خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

”تاج! اس نے کندھوں سے تھام کر تاجور کو اٹھا دیا۔“ ”یہ۔ یہ کیا ہے یہ خون؟“

تاجور کچھ بول ہی نہیں سکی۔

”کب سے ہے تمہاری یہ حالت؟ مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ اسے جھنجھوڑنے لگا، پھر پوری قوت سے چپا تھا۔

”ابا! اس کی پکار دور تک سنی گئی تھی اور ابا تو برابر دالے کمرے میں تھے، پھر بھی نہیں آئے تب وہ ایک دم فیصلہ کر کے بولا تھا۔

”چلو تاج! چلو بیٹا! اب میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔“

پھر اس نے خود ہی اپنے بیک میں تاجور کے دو سوٹ ڈالے اور اسے گرم شال اوڑھا کر اسی وقت ابا کو کھڑے

کھڑے بتا کر اس گھر سے نکل گیا تھا۔

تاجور اس کے ساتھ تھی۔



ایڈیٹی کی لائبریری میں داخل ہو کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اربہ گلاس دندو کے قریب والی ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا بھی تھا، اس لیے وہ خوش و خرم میں پڑ گیا کہ آیا اسے اربہ کے پاس جانا چاہیے یا نہیں۔ لیکن پھر وہ رہ نہیں سکا اور دیوار کے ساتھ والی رو سے نکل کر اربہ کی ٹیبل پر آیا۔

”ہیلو!“

اربہ کے ساتھ عروسہ، نمک اور جمال بھی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

”سوری۔ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔“ اس کی نظریں صرف اربہ پر تھیں۔

”ہی کیا ایبر جیسی تھی جو تم یہاں چلے آئے؟“ اربہ نے آواز دبا کر کہا، پھر آس پاس دیکھنے لگی۔ وہ بھی سمجھتا

تھا کہ یہاں بات نہیں ہو سکتی، جب ہی جھک کر مزید دھیمی آواز میں بولا۔

”باہر چلو بیٹا ہوں۔“ اربہ تمللائی ضرور، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ قریب بیٹھی عروسہ سے کہہ کر اٹھی تو رازی نے فوراً ”قدم آگے بڑھا دے، پھر لابی

کے آخری سرے پر پہنچ کر رک گیا اور اسے بول دیکھنے لگا جیسے وہ اس کے یہاں آنے پر غصے کا اظہار کرے گی، لیکن

اس کے برعکس وہ سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

”ہاں کیا بات ہے؟“

”تمہاری خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اربیبہ نے بہت ضبط سے جواب دیا تھا۔
 ”پھر آج کالج کیوں نہیں گئیں۔“ اس نے پوچھا۔ اربیبہ چہرہ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگی، کیونکہ اب وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ بولتی تو غصہ ظاہر ہو جاتا، جبکہ وہ اسے سرسری لیتا چاہ رہی تھی، جب ہی خاموش رہی۔
 ”دیکھو، یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری جاسوسی کرتا پھر رہا ہوں، اصل میں تم روزانہ میرے آفس کے سامنے سے گزرتی ہو۔ آج وہ پہلی بار تمہاری بانیٹک نہیں دیکھی تو مجھے کچھ تشویش ہوئی۔“
 ”کہ میری بانیٹک کو کسی ٹرک نے ٹکرا کر مجھے اوپر تو نہیں پھینچا دیا؟“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔
 ”نہیں، مجھے ایسا خیال نہیں آسکتا۔“ وہ کہہ کر کچھ سوچتے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگا۔
 ”خیر! تم میری خیریت معلوم کرنے آئے تھے اب جاسکتے ہو۔“ وہ نروٹھے پن سے بولی۔
 ”بڑی بے مروت ہو، اگر یہاں بیٹھنے کو نہیں کہہ سکتیں تو ساتھ چلنے کا کہہ دو۔“ رازی نے شکوہ کیا۔
 ”تمہیں شاید بے وقت ہونے کا شوق ہے، جب ہی ایسی باتیں کرتے ہو۔“ وہ چیخ کر بولی تھی۔ رازی نظریں جھکا کر ذرا سا مسکرایا، پھر اسے دیکھ کر کہنے لگا۔
 ”اصل بات یہ ہے کہ میں تمہیں بے وقت ہونے سے بچانا چاہتا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ کسی دن تم اپنے روپے پر تادم ہو کر میرے پاس آؤ اور کوئی رازی مجھے معاف کر دو۔“
 ”اوہ تو یہ خوش قسمتی ہے، تمہیں۔“ اربیبہ کے لمحے میں طنز اور استہزاء تھا۔
 ”خوش قسمتی نہیں، مجھے یقین ہے۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔
 ”چلو میں دعا کروں گی تمہارا یقین سلامت رہے۔“
 وہ سابقہ انداز میں کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ رازی نے تاسف سے اس کے پیچھے دیکھا، پھر ہر نکل آیا۔ اس کے اندر مایوسی گھر کرنے لگی تھی، جس سے وہ پریشان ہو گیا، کیونکہ ابھی اس سے تو وہ یقین سے کہہ آیا تھا کہ وہ تادم ہو کر اس کے پاس آئے گی اور یہ شخص اس کا خیال نہیں تھا۔ اسے یہی لگتا تھا، پھر اپنے جذبوں پر بھی بھروسہ تھا، اس لیے مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔

اربیبہ کے سمسٹر ہونے والے تھے اس لیے وہ غیر ضروری باتوں سے اجتناب کرنے لگی تھی۔ رازی کے اکیڈمی آنے کو بھی اس نے غیر ضروری کھاتے میں ڈال دیا تھا، جب ہی سارہ سے ذکر نہیں کیا، ورنہ وہ رازی کا غصہ اسی پر اتارتی تھی۔ اس کے خیال میں اس طرح نہ چاہتے ہوئے بھی رازی ان کے درمیان موضوع بن جاتا تھا اور وہ اب اس موضوع کو بھی ختم کر دینا چاہتی تھی، اس لیے اس نے خود بھی زیادہ نہیں سوچا اور اپنی اسٹڈی میں مصروف ہو گئی تھی۔ یوں بھی پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت سنجیدہ تھی۔ جو تاہم ٹیبل بیٹائیٹس اس پر سختی سے عمل کرتی تھی۔

اس وقت وہ اکیڈمی جانے کے لیے نکل رہی تھی کہ سارہ کو سمیر کے ساتھ آتے دیکھ کر رک گئی اور کیونکہ سارہ ہمیشہ کی طرح صبح کالج جاتے ہوئے ہٹا کر گئی تھی کہ وہ امینہ پھوپھو کی طرف جائے گی، اس لیے اس کے قریب آنے پر اربیبہ نے کوئی باز پرس نہیں کی، بس اتنا کہا۔
 ”بہت دیر کر دی۔“

”پتا نہیں میں سو رہی تھی۔“ وہ اسے پوچھو شاید انہیں پتا ہو۔ اچھا میں چلتی ہوں۔“
 اس نے ہیملٹ سر پر جما، پھر بانیٹک کو زوردار کلک مار کر زن سے بھگادی۔ اسے عروسہ کو بھی پک کرنا تھا۔ صبح کالج میں اس نے کہا تھا کہ اس کی گاڑی خراب ہے۔ لہذا اکیڈمی جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ لے لے۔
 عروسہ کی رہائش طابق روڈ پر تھی۔ مین روڈ پر ٹریفک کی زیادتی کا سوچ کر اس نے ہمار اور آباد کے رہائشی علاقے سے بانیٹک نکال لی اور آرام سے عروسہ کے گھر پہنچ کر اس کے سیل پر مس ٹیل دی تو چند لمحوں میں ہی عروسہ آکر اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”ہیملٹ تو تارو،“ تاکہ دیکھنے والوں کو پتا چلے کہ میں لڑکی کے ساتھ بیٹھی ہوں۔“
 ”تمہیں پتا ہے نا! بس کافی ہے۔“ اس نے کہہ کر بانیٹک بھگادی۔
 ”کافی نہیں ہے یا رازی اگر کسی جاننے والے نے دیکھ لیا تو حوفا سنانے نہیں گے۔“ عروسہ اپنی محتاط طبیعت سے مجبور ہو کر بولی تھی۔
 ”سنئے دو۔ اپنا ضمیر مطمئن ہو تو کسی کی پروا مت کیا کرو، سمجھیں۔“ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر عروسہ کو دیکھنے کی کوشش کی، لیکن نظریں قریب سے گزرتی گاڑی میں بیٹھے شہباز ربانی سے ہو کر یا سمین پر ٹھہرتے ہی اس کے اندر کی دنیا تہہ و بالا کر گئیں۔
 یا سمین شہباز ربانی کے کندھے پر سر رکھے، آنکھیں بند کیے دنیا وانیہا سے بے خبر بیٹھی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سفالگر

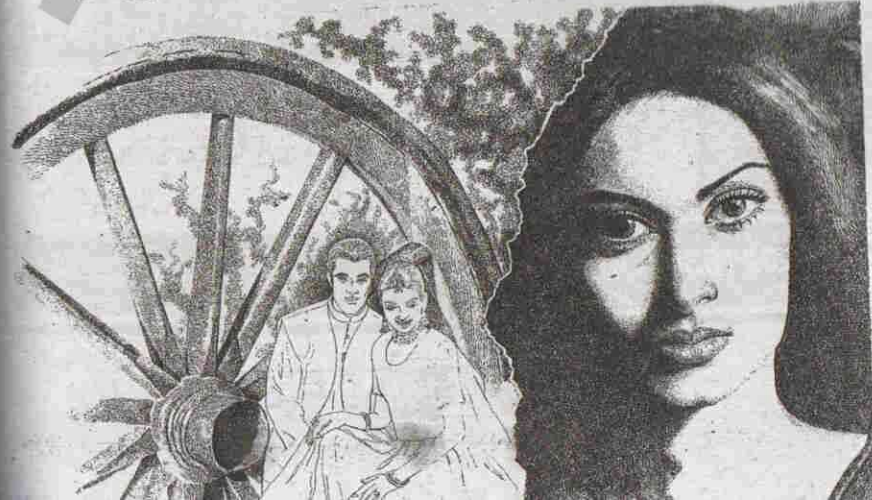
ساغر جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

انسان شخصی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں ”گلی مٹی“ کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا ”کھار“ تربیت کے ”چاک“ پر دھرتا ہے اور بازار حیات کی ”ٹانگ“ کو مد نظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی ”انگلیاں“ ہر ”برتن“ کے بدن پر ریتوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذلوں، غواہوں اور سراہوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گلی مٹی کے یہ ”سانچے“ حالات کے ”آوے“ میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا مظرف ”اور“ نصیب ”اس کی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ ”سفال گر“ کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں، کچھ اس کے انٹروی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ ”آوے“ کی ”دوبک“ برواشت نہیں کیا تے اور ترخ جاتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی ”خریدار“ میسر نہیں آتا۔ ان کا نصیب اور بازار کا اسلوب ہر ”ظرف“ کا مقام طے کرتا ہے۔ کل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہ ہی میرے ناول کی تھم ہے۔

محض چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرواروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی، کیونکہ میرا قصہ اور اک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں میں آپ کو خود بہتر منصف پاتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے ٹانگ رہی ہوں۔ آپ اس ناول کو جس بھی تاظر میں دیکھیں، مگر اسے مٹی کے بے جان برتنوں کی کمائی مت سمجھیے گا۔

بشری سعید



وہ شخص جسے اپنی کل کائنات مان کر اس نے تمام رشتوں کو بے مصروف کترینوں کی طرح لائق کی صورتوں میں بند کر چھوڑا تھا۔ جس کے سوا وہ کچھ دیکھتی نہ تھی اور جس کے سوا کچھ سوچتی نہ تھی۔ جس کو اپنا کروہ خود کو بھول گئی تھی۔ جس کو اپنی زمین سمجھ کر وہ ایک حقیر رینگنے والی بیل بن گئی تھی اور جسے اس نے آسمان کی مانند اوڑھ لیا تھا۔

وہ شخص اسے پہچانتا نہیں تھا۔ اپنی زندگی کے پچھلے ایکس بائیں سالوں میں اس نے بے شمار دفعہ گرانٹ اور خود کو رو بہ سوچا تھا اور وہ گرانٹ سے ہر تکلیف کی امید رکھتی تھی۔ وہ بے رحمی سے پیش آسکتا تھا، حقارت ظاہر کر سکتا تھا، اس پر ہنس سکتا تھا، اس سے نفرت کر سکتا تھا۔ لیکن وہ اسے پہچانے گا نہیں، یہ پر نیوں کی ترتیب دی ہوئی ممکنات اور ناممکنات کی فہرست میں کہیں درج نہ تھا۔

”عمر اسے باہر جانے کو کہو میں کسی اجنبی کو اپنے آس پاس برداشت نہیں کروں گا۔“ وہ اس کی جانب سے رخ پھیرے عمر سے کہہ رہا تھا۔

ایک بار اس نے کہا تھا ”تمہیں بھولنا گناہ ہے“ اور آج وہ بے دھرم کہہ گناہ کر رہا تھا۔

پر نیوں کے بدن کو دھکے ہوئے سرخ زوے سے واقف جا رہا تھا۔ وہ نہ آگے بڑھتی تھی اور نہ پیچھے ہٹتی تھی۔ وہ ایک بے جان کنکر تھی۔ اس میں حرکت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی تو وہ کیسے ہلتی۔

”میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں کہ اس عورت کو کمرے سے باہر نکال دو۔“

اب کیا کرنا چاہیے تھا خاموش رہ کر انتظار کرنی کہ اسے ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکال دیا جائے۔

وہ اس کی زندگی سے بھی تو نکل گئی تھی، کمرے سے نکلتا کیا مشکل تھا۔ وہ دوبار کا سارا لے کر لوٹھڑاتے ہوئے قدموں سے چلنے لگی۔ دروازہ دھکیلتے ہوئے اس

کی نظر کاریڈور کے درمیان کھڑے داؤد پر پڑی تو اس نے بے اختیار خود کو روک لیا۔ اسے احساس تھا کہ اس وقت اس کے چہرے اور سر دھانے میں پڑی ہوئی کسی لاش کے چہرے میں کچھ خاص فرق نہیں تھا۔ وہ اس چہرے کے ساتھ داؤد کا سامنا کیسے کرتی؟ وہ دروازے کا پٹ دونوں ہاتھوں میں جکڑے اسی جگہ تھمی رہی۔

”کیا آپ حقیقت میں ان کو نہیں پہچان سکتے؟“ عمر کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ ”میں آپ کو بتاتا ہوں وہ کون ہیں۔“

”نہیں میں کچھ نہیں سننا چاہتا، تم بھی چلے جاؤ، مجھے تھرا رہے۔“

”مجھے کوشش تو کرنے دیں۔ آپ کو یاد آجائے گا۔“

”میں اسے نہیں بھولا۔ میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں میں چاہ کر بھی اسے نہیں بھول سکتا۔“ گرانٹ کی آواز کلبہ رہی تھی۔

پر نیوں کو لگا کہ اس کا دل اب کبھی نہیں دھڑکے گا۔ ”تو پھر آپ نے انہیں اجنبی کیوں کہا؟“

”کیونکہ اس کے علاوہ۔۔۔ کیونکہ میں کچھ اور نہیں کہہ سکتا تھا“ تم کسی کو اندھی کھائی میں دھکا دے کر اسے مرنے کے لیے چھوڑ جاؤ اور وہ زندگی میں کبھی اچانک تمہارے سامنے آجائے تو کیا تم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکو گے؟ کیا تم منہ نہیں چھپاؤ گے۔ ہمیں نے پر نیوں کے ساتھ جو کیا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ خوفناک ہے۔ میں اس کی نظریں اپنے چہرے پر برداشت نہیں کر سکتا۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔“ عمر آٹم میری مدد کیوں نہیں کرتے؟ تم ایک بہت اچھے لڑکے ہو اور بھلے میں نے تمہارے ساتھ

کوئی ایک اچھا بھی نہیں کی پھر بھی مجھے یقین ہے کہ تم مجھے یا اس نہیں روکے۔ مرنے میں میری مدد کرو۔

ڈروڈ نہیں میں تمہیں قتل کرنے کو نہیں کہہ رہا۔ تم نے میری کلنگ (اڈوہ دم کلنگ) کا نام تو سن رکھا ہو گا۔

میرے اڑیاں رگڑ کر مرنے سے کسی کو کیا فائدہ ہو گا مجھے تو مرنا ہی ہے۔ اس کے نہیں تو چند لمحوں بعد۔ تم ڈاکٹر فرڈیننڈ کو راضی کرو۔ آج تو پر نیوں لوٹ گئی ہے، وہ ایک بار پھر یہاں آئی تو میں کیا کروں گا۔“

”آپ نے صرف اس لیے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔ کہ آپ ان کا سامنا نہیں کر سکتے۔ میں ان کو بلا کر لاتا ہوں۔ آپ کو ان سے ملنا ہو گا، ان سے بات کرنا ہو گی۔ میں ابھی ان کو لے کر آتا ہوں۔“

”عمر! میں تمہاری مفت کرتا ہوں، مجھے اس آزمائش سے بچاؤ۔ خدا کے لیے نہ جاؤ۔ میرا تصور معافی کے قابل ہوتا تو میں گڑگڑا کر معافی مانگتا میں رحم کے لائق ہوتا تو رحم طلب کرتا۔ میں تو ایک نظر کا مستحق بھی نہیں ہوں، تم مجھے اس سے ہم کلام ہونے کو کہتے ہو؟ کیسی نادانی کی بات کرتے ہو۔“

پر نیوں دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ گرانٹ کی آنکھیں اسے دیکھ کر پھیل گئیں پھر اس نے گروں جھانکی۔

”تمہیں کس چیز کی معافی چاہیے، کہیں تمہیں میرا دل خالی کرنے پر معافی تو نہیں چاہیے؟ مجھے زندہ درگور

کرنے پر بھی تمہیں معافی چاہیے ہوگی؟ مجھے دنیا میں تماشایانے پر بھی۔ ہمیں کیا کیا معاف کروں؟ تم نے

اس وقت مجھے چھوڑ دیا، مجب میں تمہاری خاطر ساری دنیا چھوڑ چکی تھی۔ اس کے لیے بھی یقیناً تمہیں

معافی چاہیے ہوگی۔ میں عام تھی تم نے مجھے خاص کر دیا۔ کالنگ ملے ہوئے چہرے جوم میں بھی آسانی

سے پہچانے جاتے ہیں، تم نے مجھے ایک تنکے سے بوجھ کر بے وزن کر دیا، گرانٹ! اس پر بھی تمہیں معافی

چاہیے۔ میں کیا کیا معاف کروں؟“

وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی مگر آنسو کب کسی کی مانتے ہیں۔ اس پر وہ ہی بیت رہی تھی جو

آگ کی قربت میں موم پر بنتی ہے۔

”مجھے تمہاری بدعا مل گئی ہے پر نیوں! دیکھو میں کیا ہو گیا ہوں۔“

اس نے گرانٹ کو روک لیا، ”پتا نہیں کتنی بار اس نے خواہش کی تھی کہ وہ اتنے رو بہ دیکھے۔ اسے خبر

ہی نہ تھی یہ منظر اتنا تکلیف دہ ہو گا۔ وہ بلکنے لگی۔

”میں نے تمہیں بدعا نہیں دی۔ میں نے کبھی تمہیں بدعا دینے کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔“

عمر اٹھا اور کچھ بھی کہنا کمرے سے چلا گیا اس کی موجودگی میں دونوں شاید کچھ ہلکا پاٹ محسوس کرتے۔

”تم نے کیوں بدعا نہیں دی؟ مجھے برا بھلا کو پر نیوں! میرے بوجھ میں اضافہ نہ کرو پر نیوں! اچھے تلوے کا ایک ہمارے جس کے نیچے میں برسوں سے پس رہا

ہوں، دم نکلتا ہے پر نہیں نکلتا میں نے جب جب تمہیں سوچا، میرے وجود میں ایک خنجر سا گڑ گیا اور میں

نے تمہیں کتنی بار سوچا اور کتنے خنجر میرے وجود میں اترے۔ میں شمار نہیں کر سکتا۔“

”تم پچھتاتے رہے اور میں محبت کرتی رہی۔ تمہیں ان دونوں باتوں کا فرق معلوم ہے گرانٹ؟“

وہ اس کے نزدیک آگئی۔

”تم کیا جانو کہ محبت کرنا کیا ہوتا ہے اپنے ہاتھوں سے خود کو لاشی چھری سے ذبح کرنا اور مرنے کی چاہ میں

ختم کرنا کیا ہوتا ہے۔“

گرانٹ نے بستر سے اترنے کی کوشش کی۔ اس کے سونہ زوہ پاؤں اسے اٹھنے نہیں دیتے تھے۔ وہ کس کس کر رہا تھا۔

”میرے قریب آ جاؤ پر نیوں! میں اٹھ نہیں پاؤں نہ خود تمہارے پاس آ جاؤں۔“

”جب میں نے تمہیں پاس آنے کو کہا، تم نے مجھے دور کر دیا، اب میں کیسے پاس آؤں؟“

وہ بے بسی سے اسے دیکھتا رہا اور آنسو بہتے رہے۔

”جب آخری بار میں نے تمہاری آواز سنی تو تم نے کہا تھا۔ البتہ کہہ رہی ہے تم میرے پاس کے کلرے کاٹ لیتے، مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس

ایک جملے سے ہوئی، تم کچھ بھی نہ کہتے خاموش رہتے۔ میں البتہ باتوں کو جھوٹ مانتی رہتی۔ مجھے اتنا درد تو نہ

ہوتا۔“

”اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں اس کی دھمکی سے ڈر گیا تھا میں اسے ناخوش کرنا تو۔“

”اس کی خوشی کے لیے تم نے میری زندگی چھین

لی؟“ وہ کراہ کر بولی۔

”اس کی خوشی کے لیے نہیں۔ میں اس کی بات تسلیم کرنے سے انکار کرتا تو میرے ہاتھ سے وہ موقع چلا جاتا۔ تم تو اچھی طرح جانتی ہو تب وہ میرے لیے کتنا اہم تھا۔“

”یہ میری قیمت ہے جو تم نے مقرر کی۔ ایک اہم موقع“ کے عوض مجھے نیچا دینا۔ ترازو کے ایک پلڑے میں ایک اہم موقع اور دوسرے پلڑے میں غیر اہم پریناں۔ جس پلڑے میں پریناں تھیں وہ بھگائی نہیں، تمہاری پیالہ کو کیا الزام دوں؟ ایک پیالہ میں نے بھی کی تھی۔ ایک پلڑے میں پوری دنیا اور میرا ایمان اور دوسرے پلڑے میں احمد گرانٹ۔ تمہارے والا پلاڑا اور اٹھایا نہیں۔ یہ تمہاری قیمت ہے جو میں نے طے کی۔“

گرانٹ خاموش رہا۔ اسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ دھندلی آنکھوں سے دیر تک پریناں کو دیکھتا رہا، پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مدہوم سی مسکراہٹ آگئی۔

پچھلی بار جب ہم ملے تھے تو تم جتنی حسین تھیں، آج بھی ویسی ہی نظر آتی ہو۔ لفظ ”حسن“ تمہارے لیے ہی بنا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ تم چاند کی مٹی سے تخلیق ہوئی ہو۔ میں نے درست کہا تھا۔“

”ہوں تو مٹی ہی نہ۔ مٹی کا کام ہے مٹی میں مل جانا۔ تم نے یہی کیا مجھے مٹی میں ملا دیا۔“

وہ کھڑے کھڑے تھک گئی تھی، مٹی کے ڈھیر کی مانند کرسی پر گر گئی۔ گرانٹ کے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر آٹھریں سے لیس آج بھی اسے جلا رہا تھا۔ گرانٹ کے ہاتھ کی پشت پر دو گرم پوندیں گریں اور پریناں کا سر جھک کر اس کے سینے سے آگیا۔

عمر نے پریناں کو کمرے سے باہر آتے دیکھا تو تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ رو رہی تھی۔ عمر کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ لفٹ کے بجائے میٹریوں سے نیچے جا رہی تھی، عمر

نے اسے ٹوکا نہیں۔ جب وہ باہر سڑک پر پہنچ گئے تو عمر بولا۔

”آپا! کہاں جا رہی ہیں؟“

”اسی کی پاس۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”تو کیا آپ بس میں جائیں گی؟“ میں ڈاکٹر فرڈینینڈ سے کہتا ہوں، وہ آپ کو گاڑی میں بھجوا دیں گے۔“

پریناں نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ سڑک کے پار خلا میں گھور رہی تھی۔

”آپا! امیر انتظار کیجئے میں ابھی۔“

پریناں نے سرخ آنکھیں اس پر جمائیں اور طیش سے کھولتے ہوئے بولی۔

”دباؤ مجھے آیا نہ کہنا۔ تم مجھے مخاطب نہیں کرنا چاہتے تو کوئی بات نہیں، تمہاری مرضی لیکن ایک اور دفعہ تم نے مجھے آیا کہہ کر بلایا تو میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں گی اور مجھے حق ہے تم پر ہاتھ اٹھانے کا، جاؤ اور جا کر داؤد سے گاڑی بھیجے کو کہو۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ وہ ہٹا ہٹا۔

عمر نے رومال کے کونے سے گرانٹ کے ہونٹوں کی نمی صاف کی اور اس کے ماتھے پر پھسلے ہوئے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا۔

”آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ آپ سے ملنے کوں آیا ہے۔“ گرانٹ نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس کے پونے لرزتے رہے اور ان پر پسینے کے دھارے گرتے رہے۔

”میری آنکھیں نہیں کھلتیں، مجھے نظر نہیں آتا۔ مجھے دیکھنا ہے، مجھے پریناں کو دیکھنا ہے۔“ وہ وحشت سے چلانے لگا۔

”میری پریناں آخری بار مجھ سے ملنے آئی ہے۔ میں اسے لیسے دیکھوں؟“ اس پر رقت طاری ہو گئی۔

پریناں آگے آتے ہوئے اس کے بستر بیٹھ گئی۔

”میں تمہیں دیکھ رہی ہوں گرانٹ! میں تمہارے علاوہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی اور میں ایک مدت سے ایسا ہی کرتی آ رہی ہوں۔“ اس نے انگلیوں کی پوروں سے

گرانٹ کے تھر تھراتے ہوئے پونٹوں کو چھوا۔

اس کی آنکھیں نیم وا ہوئیں اور اس نے پریناں کے چہرے کو خود پر جھکے ہوئے دیکھا۔

”پریناں! مجھے سینکڑوں فلموں کے مکالمے زبانی یاد ہیں۔ میں ان میں سے کوئی تمہیں سنانا چاہتا ہوں مگر مجھے وہ یاد کیوں نہیں آ رہے جو میں اس وقت بول رہا ہوں، انہیں یہ کسی فلم کے مکالمے تو نہیں۔ کیا یہ کمرہ حقیقت میں ایک سیٹ ہے؟ ہاں۔ تم ایکشن کہو اور میں مکالمے شروع کرتا ہوں، ”جنوب کا ایک سیاہی“

ہے جو تم سے محبت کرتا ہے۔ اسکا لیٹ جواب دے کرو تمہاری ہانہوں کو محسوس کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے بوسوں کی یادداشتیں اپنے ساتھ جنگ میں لے جانا چاہتا ہے۔ مجھے چاہئے کہ بارے میں کچھ خیال نہ کرنا۔ تم وہ عورت ہو جو ایک سیاہی کو اس کی موت کی طرف روانہ کر رہی ہے۔ ایک حسین یاد کے ساتھ، اسکا لیٹ! مجھے بوسہ دو، مجھے بوسہ دو، ایک بار۔“ اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔

”کیا میں تمہیں پارسے اسکا لیٹ پکارا کرتا ہوں پریناں! کیا میں واقعی ایک سیاہی ہوں اور میں جنگ پر روانہ ہو رہا ہوں؟“

”عمر! تم کسی کو بلا کر لاؤ۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی ہیں۔“ پریناں نے روتے ہوئے اوچی واز میں کہا۔

عمر جگت میں دروازے کی سمت بھاگا۔

گرانٹ کے ہونٹوں پر خون کی پٹریاں جمی تھیں۔ آواز نکالنے کے لیے وہ جڑوں کو بھیچتا اور گردن کو اکڑا کر زور لگاتا۔

”مرنے والوں سے آخری خواہش پوچھی جاتی ہے، تم نہیں پوچھو گی؟“

”مجھے اور کتنا لاؤ گے گرانٹ! مجھے اتنا دکھی کیوں کرتے ہو؟“

”میری خواہش ہے کہ ہم دونوں پوری رات کھلے آسمان تلے ساحل پر گزاریں۔ ساتھ موسیقا بچا رہے۔ ہم ایک پل بھی نہ سوئیں۔ میں تمہیں کہیں کی شاعری سناؤں اور چاند کی پٹریاں گھبر کر کہیں

دیکھیں۔“

نہیں، وہاں غوطہ خور ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھ لیں گے اور وہاں ستارے ٹوٹتے ہیں اور میرے جوتوں میں ریت چلی گئی تو کیا ہو گا۔؟“

”اچھا تو میں تمہارے سامنے سر کو خم کرتے ہوئے ایک ٹھنڈا فرش پر بٹھا کر اپنا دایاں ہاتھ تمہیں پیش کروں گا اور فرمائش کروں گا کہ بار موازل! (فرانسیسی طرز مخاطب) کیا مجھے تمہارے سنگ رقص کرنے کا اعزاز مل سکتا ہے؟“

”اور میں انکار کروں گی، مجھے رقص کرنا آتا ہی نہیں۔“

”تو پھر ہم اس قدم گا تھک عمارت میں تین جل پریوں والی تاند کے سائے میں چھپ کر بیٹھیں گے۔ وہاں گلابی مکڑیوں جیسے پھول ہمارے پیروں کے تلوؤں کو گدگدائیں گے اور بارش ہوگی تو جل پریاں بھیگ جائیں گی۔“

”لیکن تم بارش میں سگریٹ کسے پیو گے؟ لا سٹر کا شعلہ باور بار مجھے گا اور مجھے ٹھنڈ لگے گی۔ لا اس اینجلس کے نومبر میں بھی ٹھنڈ لگتی ہے، کیونکہ ہمارے ہاں صرف ساون میں بیگیا جاتا ہے۔“

”تم نے مجھے اپنا ساون بھی تو نہیں دکھایا۔ بھلا کیسا ہوتا ہے وہ؟“

”اس میں کچھ ہوتی ہے، پتنگے اور مینڈک، کچھ آٹھ اور کچھ پورے ننگے بچے اور گیت ہوتے ہیں۔ پھول، جس اور جھولے ہوتے ہیں۔ اور وہ سال کا سب سے خوب صورت وقت ہوتا ہے۔“

”نہیں، سب سے خوب صورت وقت وہ ہوتا ہے، جس میں تم اور میں قریب ہوں اور ہم شادی کی انگوٹھی خریدنا تو بھول ہی گئے اگر وقت اتنا کم نہ ہوتا تو انگوٹھی ضرور بنا لیتے اب تصویریں اتارتے ہوئے نوٹوگرافر پوچھے گا کہ انگوٹھی کہاں ہے تو تم کیا جواب دو گی۔“

گرانٹ کی آنکھوں کی پٹلیاں اٹھ گئے ہوئے پونٹوں کے نیچے گھنے لگی تھیں اور آواز ڈوب رہی تھی۔

ایک ڈاکٹر دو زمیں اور ان کے پیچھے عمر کرے میں آیا۔ گرانٹ کا معائنہ شروع کرتے ہوئے ڈاکٹر نے پریناں اور عمر کو باہر جانے کی ہدایت کی تھی۔ وہ دونوں کمرے کے دروازے کے سامنے کارڈیور میں کھڑے رہے اور ان میں کوئی بات نہ ہوئی۔ خاصی دیر بعد دروازہ کھلا تھا۔ رخصت ہونے سے قبل ڈاکٹر نے عمر کو ایک طرف لے جاتے ہوئے اس سے کچھ کلمات پریناں بغور ان کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی۔

”ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“ ڈاکٹر کے جاتے ہی اس نے عمر سے سوال کیا۔ وہ چپ تھا۔ اس کی خاموشی بیان سے زیادہ پریشان کن تھی۔ پریناں سے سوال دہرایا نہیں گیا۔

”میں دعا کرتا ہوں۔ آپ بھی دعا کیجئے۔ اللہ اس مشکل کو ان پر آسان کر دے۔“

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عمر نے کہا تھا۔

”میں کلمہ پڑھنا چاہتا ہوں۔“ گرانٹ بڑبڑایا۔

”اگر آپ آسمانی سے کلمہ طیب کے الفاظ ادا کر سکتے ہیں تو ضرور پڑھیں آپ بہت اچھا محسوس کریں گے۔“

عمر نے کہا تو گرانٹ سہمی ہوئی نظروں سے اسے نکتہ لگا تھا۔

”مجھے۔ مجھے یاد نہیں آ رہا۔“ اس نے شرمندگی اور خوف سے کاٹتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں، آپ گھبراہٹ میں نہیں۔ میں پڑھتا ہوں اور آپ میرے پیچھے دہراتے رہیں۔ آپ کو یاد آجائے گا۔“

”میں کوئی معبود اللہ کے سوا۔“

”نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا۔“ گرانٹ نے پریناں کا بازو زور سے دوچار رکھا تھا۔

”نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔“ اس کی زبان سے خود بخود ادا ہوا۔

اس کی گردن کی تہی ہوئی رگوں میں نرمی آگئی۔ اس

کے چہرے پر رنگ لوٹ آیا۔ پھر وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں چلا گیا۔ اس کا تنفس اتنا پر شور تھا، جیسے کوئی زندگ کھائی چرخی لوہے کے تنگ کڑے میں گھوم رہی ہو۔ پریناں نے اپنے بازو سے اس کا ہاتھ ہٹائے ہوئے اسے گود میں رکھ لیا اور بے خیالی میں اس پر پھیلے ہوئے روئیں کو انگلیوں سے محسوس کرنے لگی۔

عمر نے اٹھتے ہوئے قیص کی آستینیں کندھوں سے اوپر چڑھائیں اور وضو کرنے چلا گیا۔ واپس آکر وہ بستر گرانٹ کے سرہانے بیٹھا اور تسبیہ پڑھنے لگا۔

”یا سبین“

”سب سے قرآن حکیم کی یقیناً“ عمر رسولوں میں سے ہو سیدھے راستے پر ہو۔“

اس نے آیات کی تلاوت کا آغاز کیا۔

”یہ (قرآن کریم) نازل کر دہ ہے غالب اور مہمان ہستی کا۔“

ناکہ تم متنبہ کرو ایسی قوم کو کہ نہیں متنبہ کیے گئے ان کے باپ دادا، اسی وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔“

گرانٹ کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ اس نے عمر کو روکتے ہوئے پوچھا۔ ”تم کیا پڑھ رہے ہو؟“

”سورہ یاسین۔ یہ قرآن کا دل ہے۔ جب کوئی سخت تکلیف میں ہو تو اسے پڑھنے کی ہدایت ہے۔“

گرانٹ کو یاد آ گیا۔ اس کے باپ نے اسے یہ سورہ یاد کرائی تھی۔ اسے اپنے باپ کی موت یاد آگئی۔ اس نے خود کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چمچے کی بیٹل تھی اور ابراہیم ایک کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے مونے مونے آنسو گرتے تھے جو اس کی بے ترتیب واڑھی کو بھگو رہے تھے۔ اچانک ابراہیم حرکت میں آیا اور ایک سفید کھڑی اس پر اچھال دی۔ اس نرم گھڑی نے اس کی ناک اور منہ کو ڈھانپ لیا تھا۔ دراصل وہ ایک تکیہ تھا جو اس کے چہرے سے الگ نہ ہوا تھا۔ اس نے جاس لینا چاہا۔

سانس کمال تھی؟ وہ کیسے نہیں تھی۔ عمر کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

”یقیناً“ پوری ہو چلی اللہ کی بات ان میں سے اکثر پر لہذا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

بلاشبہ ہم نے ڈال دیے ہیں ان کی گردنوں میں طوق نہ وہ ٹھوڑا سا تک ہیں تو یہ اوپر کو منہ اٹھائے رہ گئے۔“

ابراہیم نے کہا تھا کہ اس سورہ کو پڑھنے سے تکلیف کم ہو جاتی ہے تو پھر تکلیف بڑھتی کیوں جا رہی تھی۔ اس کی آنتوں اور سارے اندرونی اعضاء کو آپس میں گچھیں دے کر ایک گچھا سا بنادیا گیا تھا اور وہ گچھا کسی کانٹوں بھری جھاڑی میں الجھ گیا تھا۔

وہ ایک برف سے اٹے ہوئے میدان میں بھاگ رہا تھا اور اس کی موتی لونی جراب گیلی ہو چکی تھی۔ وہ گھٹنوں تک برف میں کھسا جاتا تھا، پھر اس کے آگے بھر بھری برف میں سے پام کے دو درخت پھوٹ نکلے جو چشمِ نفلان میں آسمان تک اونچے ہو گئے۔ وہ رک گیا اور اس نے مڑ کر دیکھا۔

ستوں ناک اور بھی ہوئی نیلی آنکھوں والی لڑکی نٹوں کا مخصوص لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس کے گالوں پر بہت سے زرد اور بھدے مل تھے۔ وہ اسے نہیں پہچانتا تھا۔ ایک گرگڑا ہٹ گوجی اور پام کے درخت اس پر ڈھیر ہو گئے۔ وہ بھاگ نہیں سکا۔ برف نے اس کی ٹانگوں کو مقفون کر دیا تھا۔ وہ گردن تک برف میں دھنس گیا۔ اس کا خون جم رہا تھا۔

اسے حرارت چاہیے تھی مگر میلوں تک برف ہی برف تھی۔

عمر ٹھہر ٹھہر کر واضح اور صاف لب و لہجے میں پڑھ رہا تھا۔

”اور ہم نے کھڑی کر دی ان کے آگے ایک دیوار اور ان کے پیچھے ایک دیوار اور اس طرح ہم نے انہیں ڈھانک دیا تو انہیں کچھ نہیں سوچتا۔“

وہ ساؤنڈ اسٹیج پر اسرار گیا ایک سیٹ تھا جہاں وہ موجود تھا اور اپنے مکالمے یا کرانے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔

رہا تھا مگر ایک بھی لفظ اس کے ذہن میں نہ آتا تھا۔ یہاں تک کہ گھنٹی بجادی گئی اور ڈائریکٹر نے صدا دی۔

”ایکشن۔“

وہ چپ چاپ نظریں نیچے کیے شرمسار ہوتا رہا، پھر اسے خیال آیا کہ مکالمے تو اس تختی پر لکھے تھے جو اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ وہ سیاہ تختی پر تحریر شدہ سفید حرف کو پڑھنے لگا۔ وہ عجیب سے مندرجات تھے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ کے الفاظ کے نیچے دو تاریخیں لکھی تھیں اور ان کے ساتھ کسی کا قد اور وزن درج تھا۔ آخر میں ایک نام تھا۔ احمد ابراہیم۔ وہ کس قسم کے مکالمے تھے اور وہ نام کس کا تھا؟ وہ ان تاریخوں پر غور کرنے لگا اور اسے یاد آ گیا کہ ان میں سے ایک اس کی تاریخِ پیدائش تھی۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ تختی تک شلٹس اتارتے ہوئے گرفتار کیے جانے والوں کو تھمائی جاتی تھی۔ اس نے بے اختیار ڈائریکٹر سے پوچھنا چاہا کہ اسے مسکراتے ہوئے تصویر کھنچانی چاہیے یا معصوم تاثرات کے ساتھ؟ لیکن اسے ڈائریکٹر نظر نہیں آیا۔ اسے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ اس کے چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اندھیرا اسے نگل رہا تھا۔

اس نے روئی کو ڈھونڈا۔ وہ پائید ہو چکی تھی۔

ایک آواز نے اسے جھنجھوڑا ڈالا۔ وہ ساحل پر تھا اور چنگدر ستاروں سے منور آسمان ناقابلِ یقین حد تک نزدیک تھا۔ ایک لڑکی جس کے بالوں پر ستاروں کی روشنی کا پرتو تھا، اس کی جانب پشت کیے سمندر کے رخ پر بڑھ رہی تھی۔ اس Poncho (لباس) ہو اسے لہرا رہا تھا اور وہ اس کے دامن کو ہاتھوں سے پکڑ کر اسے پوچھ پڑھنے سے روک رہی تھی۔ وہ نم ریت پر بھاگتا ہوا اس لڑکی کے سامنے آ گیا۔ وہ پریناں تھی اور کسی بات پر اس سے روٹھی ہوئی تھی۔

وہ حسِ قدر حسین تھی۔ وہ بھی اس کے چہرے سے نظرنہ ہٹا کر عین اوپر ٹوٹ کر نگروں میں بیٹھا ہوا ایک

ستارہ اس کا دھیان نہ بھٹکا دیتا۔

اس نے ہاتھوں کا چالہ بنا کر گرتے ہوئے ستارے تلے کر دیا۔ وہ ستارے کی گرد جمع کر کے پر نیوں کو تحفے میں دینا چاہتا تھا مگر وہ ماں جانے ایک دم اسے یاد آیا کہ ستارے تو آگ ہوتے ہیں۔ لیکن تب دیر ہو چکی تھی۔ وہ ہاتھ نہیں بٹاسکا اور ستارے کی سلگتی ہوئی راگھ نے اس کے ہاتھوں میں آگ بھڑکا دی۔ آگ اس کی کہنیوں کی سمت اور وہاں سے آگے کندھوں اور سینے تک پھیل رہی تھی اور پھر وہ اس کے دل تک پہنچ گئی۔ وہ اپنے دل کو جلتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے دھڑکن محسوس کی۔ وہ غم چکی تھی۔

”تم تو اسی شخص کو خیردار کر سکتے ہو جو ہر صیحت پر چلے اور بے دیکھے رحمن سے ڈرے تو اسے مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دو۔“ وہ ایک جھیل کی سطح پر جت لیٹا تھا اور ڈوبتا نہ تھا۔ پانی کے بھاؤ کا شور اسے شامی نہ دیتا تھا اور وہ پانی اسے گلیا بھی نہ کرتا تھا۔ ہوا اسے چھوتی تھی اس کا لمس کوئی احساس نہ جگاتا تھا۔ اچالا بھی تھا لیکن وہ اندھیرے سے کسی بھی طرح مختلف نہ تھا۔ اس بار اس نے کچھ نہیں ڈھونڈا۔ اسے کسی بھی شے کی تلاش نہ تھی۔

داؤد نے گلا کھار کر پر نیوں کی محبت تو ڈدی۔ ”اسے کل دفن کیا جائے گا۔ میں صبح تک سارے انتظامات کروں گا۔ اب تمہارے ہاسپٹل میں رہنے کا کوئی مطلب نہیں۔“ وینس آنٹی میرے آس میں تمہاری منتظر ہیں۔ وہ تمہیں گھر لے جانے آئی ہیں۔ تم چلی جاؤ اور ہو سکے تو سو جاؤ۔“

پر نیوں نے داؤد کو نہیں دیکھا اور زیری میں بولنے لگی۔ ”اسے تو دفن کر دو گے لیکن مری ہوئی تلیوں کا کیا کرو گے۔ تمہیں خبر نہیں کہ قتلہاں مرجائیں تو انہیں دفن کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مامی رنگوں کے ڈرے ہوا میں بکھر جاتے ہیں۔ ایسی ہوا میں کوئی سانس

کیسے لے؟“

”پر نیوں! تمہارا ذہن منتشر ہے۔ تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔ تم اس ماحول سے نکلو اور پلیز گھر چلی جاؤ۔“

”داؤد! پر نیوں نے تمہیں گریڈ لہجے میں پکارا۔“ وہ زندہ تھا تو مجھے مرنے نہیں دیتا تھا۔ اب مر گیا ہے تو مجھے جینے نہیں دے گا۔“

شاہ بلوط کے بچے ہتھیلیاں پھیلائے تنکھی شعاعوں کو ان تک پہنچنے سے روک رہے تھے۔ جو کر نیں ان کا سبز گہرا ڈونڈ کر پیچے آنے میں کامیاب ہو تیں۔ وہ گھاس کے تنکوں پر ایک چمکیلے سفوف کی مانند بکھر جاتیں۔ زردی بالکل سفید سفوف کی کئی ڈھیریاں ان کے ارد گرد نظر آتی تھیں اور ان مقابلتہ پر گھاس کا سبز رنگ دم دیا گیا تھا۔ ایسی ہی ایک ڈھیری صوفیہ کے پیروں پر قابض تھی جس نے اس کے ناخنوں کو گلابی چمک سے معمور کر رکھا تھا اور ایسا لگتا جیسے اس کے پیروں کے ناخنوں سے گلابی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔

عمر آتی پانی مارے ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ شاہ بلوط کا فراخ تنا اس کی پشت پر تھا اسے دھوپ اور چھونے میں یکسر ناکام تھی۔ ان دونوں کے بیچ کافی سے بھرے دو کانڈی کپ گھاس پر رکھے تھے جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

وہ بہت دنوں بعد اس جگہ اکٹھے ہوئے تھے۔ گرانٹ کی موت سے چند روز پہلے وہ تھوڑی دیر کے لیے یہاں آئے تھے۔

صوفیہ نے گرا ہوا ایک پتا اٹھایا اور اسے ہاتھ پر دھرتے ہوئے ایک چھونک سے عمر کی جانب اڑا دیا۔

”تم بھی بات کرنے میں پہل نہیں کرتے ہمیشہ میرے بولنے کا انتظار کرتے ہو۔“ اس نے شکایت کی۔

”میں جان بوجھ کر نہیں کرتا۔ میری عادت ہی کچھ

ایسی ہے۔“

”شکر ہے تم میں کوئی برائی بھی ہے ورنہ تمہیں انسانوں کی صف سے خارج کرنا پڑتا۔“

”نہیں مجھے میں اور بھی کئی برائیاں ہیں۔“

”اچھا وہ کیا ہیں مجھے ضرور بتاؤ۔“ صوفیہ نے دلچسپی ظاہر کی۔

”چونکہ وہ خامیاں ہیں اس لیے مجھے ان کا تذکرہ کرنا پسند نہیں۔ تم بھی انہیں دریافت کرنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ ہو سکتا ہے میں تمہیں برا لگنے لگوں۔“

”تم مجھے برے لگنے لگو تو میرے کئی مسائل حل ہو جائیں۔“ صوفیہ نے ہنسی بہت کی۔

”کیسے مسائل؟“

صوفیہ کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ ہتھیلی کو کھوری گھاس سے رگڑنے لگی۔ عمر کو اس کے بدلے ہوئے مزاج نے حیران کیا تھا۔ ”تم نے مجھے جواب نہیں دیا۔“

وہ اپنے سامنے بڑا ہوا کافی کا کپ اٹھا کر منہ کے قریب لائی لیکن گھونٹ لیے بغیر واپس رکھ دیا۔

”تم مجھے برے لگنے لگو تو شاید مجھے نیند آنے لگے گی مجھے بھوک لگنے لگے گی۔ میری ہر دم ایک کیف اور بخار میں جھلنے والی کیفیت ختم ہو جائے گی۔ میں اکیلی بیٹھ کر بے مقصد مسکراتا ہوں کروں گی۔ میں اپنے آپ سے باتیں کرنا چھوڑ دوں گی۔ ہر جگہ تمہارے نظر آنے کی امید ختم کر دوں گی۔ میں آسانی چاند کو اپنے ارضی ہاتھوں سے چھو کر محسوس کرنا چھوڑ دوں گی۔ دیکھو عمر ایک اس وجہ سے کہ تم مجھے برے نہیں لگتے، میری زندگی میں کتنے مسئلے ہیں۔“

عمر یہ سب سننے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اسے فوری طور پر کچھ کہنے میں ہچکچاہٹ ہوئی۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری وجہ سے تمہیں اتنی پریشانی لاحق ہیں پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں تمہیں برا لگوں۔ البتہ میں واپس پاکستان جا رہا ہوں۔ میرے ویزے کی معیار پوری ہوئے والی ہے۔ میں چلا ہاؤں گا تو شاید میری پیدا کردہ ناخوشیں دور ہو جائیں۔“

”فاصلہ کسی کام آتا تو رونا کس بات کا تھا۔ تم سے جان چھڑانے کی غرض سے میں قطب شمالی میں جا سکتی۔ یہ معاملہ سادہ ہے نہ آسان۔ میری جان میری انگلیوں کے ناخنوں میں اٹکی ہے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میری حالت کیسی ہے؟“

اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے اور وہ آنسوؤں کو واپس دھکیلنے میں کوشاں تھی۔

”عمر! اس رات تم نے میرا پیچھا کیوں کیا؟ تم نے اپنی سب سے مہنگی ملکیت اتنی کم قیمت پر کیوں بیچی؟ تم بغیر شرم۔ کے بھیڑ والی جگہوں پر ننگے پاؤں کیوں چلے؟“

”میں نے جو بھی کیا اللہ کے لیے کیا۔ اس میں میری ذاتی غرض شامل نہیں تھی۔“

”کیا تم نے میرے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کیا؟ میں ہمدردی کے علاوہ پوچھ رہی ہوں۔ میں محبت کے بارے میں سوال کر رہی ہوں۔ کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟“

وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

عمر دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔“

صوفیہ کا رنگ بگڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈرے یکدم خون کی لکیوں میں بدل گئے۔

”تم مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ کیا اس لیے کہ میں نے ماضی میں کچھ غلطیاں کی ہیں جبکہ تمہارے کردار میں ایسی کوئی خرابی نہیں اور اس حوالے سے تم مجھے خود سے کمتر تصور کرتے ہو۔“

”نہیں صوفیہ! مجھ سے بہت سے گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ مجھے اچھے تو کیا کم برے لوگوں میں بھی نہیں گناہا سلگتا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ میں نے اپنی ماں کو اتنا عاجز کیا کہ انہیں زندہ رہنے کی خواہش نہ رہی۔“

صوفیہ نے اضطرابی کیفیت میں کافی کا کپ دوبارہ گرفت میں لیا اور اسے اپنے گھٹے پر نکا دیا۔

”مجھے احساس ہے کہ میں ویسی لڑکی نہیں ہوں

جس سے تم محبت کرو لیکن میں تمہاری پسند کے مطابق بن جاؤں گی۔ میں بدل رہی ہوں۔ میں تیزی سے تبدیل ہو رہی ہوں۔ میں بھی کبھی الگوصل استعمال کرتی تھی اب بالکل نہیں کرتی اور یہ سوچ کر کہ تمہیں سگریٹ پینے والی لڑکیاں پسند نہیں ہوں گی، میں نے پچھلے کئی ہفتوں سے ایک بھی سگریٹ نہیں پیا میں ایسا لباس پہننے لگی ہوں جس میں پورا بدن پوشیدہ رہے۔ میں نے مردوں سے بے تکلفی برتاؤ ترک کر دیا ہے۔ میں عبارت بھی کروں گی۔ میں ہر وہ کام کروں گی جو تمہیں پسند ہو۔ کیا پھر بھی تم مجھ سے محبت نہیں کرو گے؟

اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اسے آنسوؤں کو ضبط کرنے میں کتنی دقت ہو رہی تھی۔ اس کے کپ والے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”تم ایک انسان کے لیے یہ سب کر رہی ہو۔ اگر یہ تمام کام تم اللہ کی خاطر کرو تو کتنا اچھا ہو۔“

”تم مجھے لا جواب کر سکتے ہو اور ہمیشہ کر دیتے ہو۔ لیکن مجھے خود سے محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اچھا تو عمر ایسا تمہیں مہلت درکار ہے کہ تم اچھی طرح سوچ سکو۔ شاید چند دن بعد تمہیں ایسا لگے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگے ہو؟“

اس بار بھی جواب دیتے ہوئے عمر نے بہت وقت لیا تھا۔

”میں جتنا چکا ہوں۔ بار بار ایک ہی بات نہ پوچھو۔ یوں بھی میرے پاکستان جانے میں۔“

صوفیہ نے اس کی بات کاٹ لی۔

”مجھے نہ بتاؤ کہ تم کب واپس جا رہے ہو۔ میں تم سے ایک آخری چیز مانگ رہی ہوں۔ میں یہاں تمہارے سامنے بیٹھ کر رونا چاہتی ہوں۔ چاہے تمہیں اچھا لگے یا برا۔“ وہ اچانک چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی

عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہہ کر اسے چپ کروائے اس کے گالوں پر روانی سے کرتے ہوئے آنسو اسے بے حد دکھ دے رہے تھے۔

”عام طور پر میں روتی نہیں ہوں کیونکہ لوگ آنسوؤں کو کمزوری پر محمول کرتے ہیں اور میں نے کبھی لوگوں پر ظاہر نہیں کیا کہ میں کمزور ہوں۔“

ایک آنسو اس کے ہونٹوں سے پھسل کر ٹھوڑی پر آیا اور اس کے ہاتھ میں تھامے ہوئے کپ میں جا گرا۔

”میں اس لیے تمہارے سامنے نہیں رو رہی کہ تم مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں اس لیے بھی نہیں رو رہی کہ تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہو۔ میں نہیں جانتی کہ میں کیوں چاہتی ہوں تم مجھے روتے ہوئے دیکھو۔“ ایک اور آنسو کپ میں گرا۔

”میں نے ساری زندگی اہمیت کے بغیر گزاری۔ مجھ پر کسی نے اتنی توجہ بھی نہیں دی جتنی کوئی عادی سگریٹ نوش اپنے راگہ دان پر دیتا ہے۔ تم نے اتنی اہمیت ایسی توجہ دی تو یہ آنسو تمہارے موجودگی میں کیوں نہ بہیں؟ تمہارے لیے ہیں۔ میں ان کو تم سے نہیں چھپاؤں گی۔“

ایک ساتھ ہی شفاف قطرے کپ میں ٹپکے تھے۔ اس نے روتے ہوئے نظار اٹھائی اور شکرانی۔ وہ دل کو چیر دینے والی مسکراہٹ تھی۔

”کافی تو رہی گئی۔ چلو جلدی پو اسے تاکہ میں جا سکوں۔“ اس نے اپنا کپ ہوا میں بلند کیا۔

”تم میرا کپ لے لو۔“ عمر نے پیشکش کی۔

”تمہاری کافی میں آنسو ملے ہیں۔ مجھے یہ مناسب نہیں لگتا کہ تم اسے پیو۔“

صوفیہ بولی۔ ”اگر کافی کے اس کپ میں تمہارے آنسو گرے ہوتے تو جانتے ہو میں کیا کرتی۔“ اس نے بات مکمل نہیں کی۔ ”رہنے دو یہ کافی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اسے پینے میں اب کوئی مزا نہیں۔“

اس نے کپ ایک طرف رکھتے ہوئے اپنا برس کھولا اور کچھ نقدی نکال کر عمر کے پیروں کے نزدیک گھاس پر ڈھیر کر دی۔

”تمہارے دیے ہوئے تین سو bucks میں نے بچا کر رکھے تھے۔ میرا ان پر کوئی حق نہیں ہے۔ یہ میں

تمہیں لوٹا رہی ہوں۔ یہ پورے نہیں ہیں۔ پچھلے بہت سے دنوں سے میں کوئی ملازمت نہیں کر رہی تو انتہائی مجبوری میں اندازاً تیس بیکس خرچ کرنا پڑے۔“

عمر نے ہاتھ سے نوٹوں کو اس کی طرف دھکیلا۔

”میں یہ واپس نہیں لوں گا۔ تمہیں ان دنوں رقم کی ضرورت ہوگی۔ کل جب تم کوئی ملازمت کرنے لگو تو بے شک لوٹا دیتا۔“

صوفیہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”آنے والے کل کی بات نہ کرو۔ ابھی تو مجھے آن کو بھگتنا ہے۔“ وہ پھر سے بالک بلیک کر رہی تھی۔

”میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ وہاں گزرے ہوئے وقت کی ہری یادیں ہیں۔ میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ آئندہ میں کہاں رہوں گی۔ میں نے پچاس بیکس کے نوٹ پر اپنا نیا سیل فون نمبر لکھ دیا ہے۔ کانڈر اس لیے نہیں لکھا کہ کانڈر کا ایک ٹکڑا سنہال کر رکھنا مشکل ہے لیکن پچاس بیکس کے نوٹ کو کم کر دینا آسان نہیں۔ میں رابطے کا ایک ذریعہ چھوڑے جا رہی ہوں۔ مگر تم اسے صرف اس صورت میں استعمال کرو گے اگر تمہیں مجھ سے محبت ہو جائے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری بات کرنے کے لیے مجھے کال نہ کرنا۔“

وہ ایک ہاتھ سے اسکرٹ سے چپکے تنکے جھاڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے گیلیا چرو صاف کر رہی تھی۔

”تم پہلے سے طے کر کے آئی تھیں۔ کیا تمہیں شک تھا کہ میرا جواب مثبت نہیں ہو گا؟“ عمر نے پست آواز میں کہا۔

”مجھے اچھے واقعات ذرا کم ہی پیش آتے ہیں تو میں مٹی پہلو ہمیشہ نظر میں رکھتی ہوں۔ میں ایک قنوطی لڑکی ہوں۔“

روتے روتے اس کا گلاب بیٹھ چکا تھا۔

”مجھے ایک بات رخت جب ہے عمر! تم مجھے خدا کی محبت کے لائق سمجھتے ہو اور اپنی محبت کے لائق نہیں سمجھتے۔ تم تو ایک انسان ہو۔“

اس کے چہرے پر جیسے نشتر سے چیرا دیا گیا ہو۔

”تم منہ پھیر لو! اس طرح مجھے جانے میں آسانی ہو گی۔“

اس نے بحث نہ کی اور رخ بدل کر شاہ بلوط کے تنے پر آنکھیں گاڑ دیں۔

”تم سو تنک لگتی کرنے کے بعد مڑ کر دیکھنا۔ یہ کھیل میں بچپن میں کھیلنا کرتی تھی۔ جب کتنی کرنے والا مڑ کر دیکھتا ہے تو دوسرا کھلاڑی نظر سے اوجھل ہو چکا ہوتا ہے۔“

عمر نے لگتی نہیں کی۔ اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ کافی کی مٹی ہوئی رخ تھک اس کی سانسون میں پھندے انکار رہی تھی جو اس کے عقب میں دو کانڈری کپوں سے اٹھتی تھی اور ان میں سے ایک میں آنسو ٹپکے ہوئے تھے۔



وہ آنکھیں موندے بستر پر راز تھی کہ اس نے کسی کے اندر آنے کی آہٹ سنی۔ قدموں کی چاپ پاس کے سرہانے اگر رک گئی۔ اس نے پلوں میں بھری پیدا کر کے عمر کو دیکھا۔

”میں یہاں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟ اگر آپ کو نیند آ رہی ہے تو بتادیں۔ میں چلا جاتا ہوں۔“

”بیٹھ جاؤ۔“ پر نیلیاں نے لیٹے لیٹے اشارہ کیا۔ وہ اس کے بستر پر بیٹھ گیا تھا۔ ”میں بہت تھک گیا ہوں۔ آج مجھے بڑی دیر تک پیدل چلنا پڑا۔ دھوپ بھی تیز تھی۔ میرا پورا جسم دکھ رہا ہے۔“

وہ واقعی تھکا ہوا نظر آتا تھا۔

”تم لیٹ جاؤ۔ ذرا جسم کو آرام ملے گا۔“ پر نیلیاں نے ایک طرف پٹے ہوئے اسے لینے کی جگہ دی۔ وہ خود پہلو کے بل ہو گئی تھی۔

عمر گردن کے نیچے تکیے کو دہرا کرتے ہوئے لیٹ گیا۔

”پانی پیا ہے تم نے؟ یا میں لے کر آؤں۔“

”جی پانی پیا ہے۔“

”تم اتنی گرمی میں پیدل کیوں پھرتے رہے ہو؟“ اس کے انداز میں تشویش تھی۔

”مجھے ایک خاص چیز کی تلاش تھی اور وہ کہیں ملتی ہی نہ تھی۔ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے برا حال ہو گیا۔“

”لیکن وہ کیا چیز؟“

”آپ کو ابھی معلوم ہو جائے گا!۔“

وہ لفظ کہتے ہوئے عمر ٹھٹھا نہیں اور اس کے منہ سے سنتے ہوئے برنیاں چونکی نہیں۔ ان دونوں نے یوں ظاہر کیا جیسے عمر کا اسے ایسا نامعلوم کی بات ہو۔

”میرا سر بھی درد سے پھٹ رہا ہے۔ آپ چھو کر دیکھیں، ہمیں مجھے بخار تو نہیں ہو رہا۔“ عمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ماتھے پر رکھ دیا۔

برنیاں اس کے ماتھے کی جلد پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”میرے اس ہاتھ کی تین انگلیاں قریب قریب بے حس ہیں۔ میں نے اپنی رگوں کو زخمی کر دیا تھا۔ تمہیں تو علم نہیں ہو گا کہ میں چند دن ایک میڈیکل اسکول میں بھی جاتی رہی ہوں۔ میں نے وہاں کچھ بھی نہیں سیکھا، کلائی کو درستی سے کاٹنا تو بالکل نہیں۔“

”مجھے کیسے علم ہو گا امی! آپ نے کبھی مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔“

برنیاں کی انگلیاں اب اس کے بالوں میں چلنے لگی تھیں۔

”میں تمہیں کیا بتاتی؟ یہ کہ تمہاری ماں کا ماضی کو تباہوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ اپنی راہ میں آنے والی پہلی ترغیب پر ہی پھسل گئی اور پھر کبھی سنبھلی ہی نہیں۔ اس نے ہمیشہ دل کی مانی اور دلوں کو ٹھکین کیا۔ اس میں اپنی غلطیوں کو سدھارنے کا حوصلہ نہیں تھا اس لیے اس نے مزید غلطیاں کیں۔ ان میں کون سی بات بتانے کے لائق تھی۔“

عمر نے برنیاں کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جب ہم غلطی کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ ہمیں معاف کر دیا جائے اور جب کوئی دوسرا غلطی کرتا ہے تو ہم معاف کرنا نہیں چاہتے ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟“

برنیاں بہت قریب سے عمر کے چہرے کے نقوش دیکھ رہی تھی۔

”عمر! مجھے یہ کہنے میں سخت جھجک ہو رہی ہے۔ اگر تم۔۔۔ وہ ٹھہر کر اپنی گہراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرنی رہی۔“ عمر نے اگر تم پرانہ مانو تو میں تمہیں چوم لوں۔ جب تم پیدا ہوئے تھے تو میں نے تمہیں ایک بار بھی نہیں چوما اس ڈر سے کہ تمہیں چھوڑ کر جاتے ہوئے مجھے زیادہ اذیت نہ ہو۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا میں کس شے سے خود کو محروم کر رہی ہوں۔ میرے جیسا بے وقوف زمانے میں نہ ہو گا۔“

برنیاں نے سب سے پہلے اس کی ناک کی نوک کو چوما تھا، پھر اس کے ماتھے کو۔ باری باری دونوں گالوں کو اور اس کی آنکھوں کو چومتے ہوئے وہ آنسوؤں سے اس کے چہرے کو بھگو رہی تھی۔ عمر کو شرم محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔

”آپ صوفیہ کے متعلق تو جانتی ہیں نا۔“ اس نے عجیب لمبے کو گزارنے کی غرض سے جو پہلا موضوع اسے سوجھا وہ اسی پر بولنے لگا۔

”کون صوفیہ؟“ برنیاں نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

”الہامیہ کی بیٹی صوفیہ۔“

”ہاں! داؤد اس کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے ایک دو دفعہ اسے گود میں لیا تھا۔ تب وہ پانچ چھ ماہ کی ہوئی۔ بڑی پیاری بچی تھی۔ کیا تم اس سے ملے ہو؟“

”میں نے بار بار ملا ہوں۔ وہ ہسپتال آئی تھی تو اس کے بعد ہم دونوں میں اکثر ملاقات رہی تھی۔“

”مجھے بھی ملو!۔ اسے دیکھنے کا اشتیاق ہے مجھے وہ کیسی ہو گئی ہے؟“

”میرا قیاس تھا کہ آپ اس سے ملنا پسند نہیں کریں گی کیونکہ وہ البانیا کی بیٹی ہے۔“

برنیاں نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگالی۔

”میرے لیے یہ بات اہم نہیں ہے۔ میرے لیے اہمیت اس بات کی ہے کہ اسے گرانٹ نے پالا ہے۔“

وہ نے تم نے اچانک اس کا ذکر کیوں چھیڑ دیا ہے۔ کیا تم اسے پسند کرنے لگے ہو؟ کیسی لڑکی ہے وہ؟“

عمر اب پچھتا رہا تھا کہ اس نے یہ موضوع کیوں چنا۔

برنیاں کہہ رہی تھی۔

”میں جس لڑکی کو اپنی بیوی کے طور پر منتخب کرو۔ اسے ضرور بتا دینا کہ اس کی دو سائیں ہوں گی۔ ایک میں اور دوسری تمہاری ہے جی۔“ وہ دھڑکے سے ہنسی۔

”بلکہ تم صوفیہ کو ساتھ لے کر آنا میں خود سے خزاں کروں گی۔ کہیں بعد میں وہ شکوہ نہ کرے۔“

”میں نے یہ کب کہا کہ میں اس سے شادی کر رہا ہوں۔“ عمر نے احتجاج کیا۔

”یہ بھی تو نہیں کہا کہ تم نہیں کر رہے۔ صوفیہ کا نام لیتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں جو تاثر آیا۔ وہ کسی خاص جذبے کی گواہی دیتا ہے۔ اس وقت میں اتنے قریب سے نہیں دیکھ رہی تھی۔“ اس نے انگلی اور

انگوٹھے کی مدد سے فاصلہ نب کر دکھایا۔

”میرا کلف میں غلطی پر بھی ہو سکتی ہوں۔ تم تصحیح کر سکتے ہو اگر تم چاہو تو۔“

عمر ایک اور کڑھب لمبے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ فرار کے طریقے سوچنے لگا اور کامیاب رہا تھا۔ وہ اٹھ کر گیا اور میز پر پڑے ہوئے دو لفافوں میں سے ایک کو اٹھاتے ہوئے اسے برنیاں کو دے دیا۔

”مجھے اس کی تلاش میں کئی جگہوں پر جانا پڑا۔ مارکیٹ میں مل ہی نہ رہا تھا۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد یہ پھول میں آپ کو لا کر دوں۔“

برنیاں ساکن آنکھوں سے اس کا سنی پھول کو دیکھ رہی تھی۔ ”Gloxinia“ عمر کے مزید کہنے سے قبل وہ بول اٹھی۔

”یہ Gloxinia ہے۔ پہلی نظر میں محبت کی علامت۔ وہ پھولوں کی زبان میں مجھ سے ہم کلام ہوتا تھا۔ جب ہم پہلی بار ایک دوسرے کے روبرو ہوئے تو اس نے مجھے یہ ہی پھول دیا تھا۔ میں اسے کیسے بھول

سکتی ہوں۔ اس نے جانے میں جلدی کی، میں ایک بات پوچھ ہی نہیں پائی کہ میرے دل میں ہی رہ گئی۔ اسے مجھ سے محبت تھی یا وہ شخص پچھتاوے میں مبتلا تھا؟“

عمر نے ایک نگاہ میز پر دھڑکے دوسرے لفافے پر ڈالی اور دروازے کے نزدیک جاتے ہوئے بولا۔

”مجھے یقین ہے کہ اس کا جواب اس دوسرے لفافے میں ہے۔ اسے کھول کر دیکھ لیں۔“



وہ وائٹن نوازوں کا ایک گروہ تھا، جو بے گھر بچوں کی فلاح کے لیے چندہ جمع کر رہا تھا۔ سازندے ایک خاص ترتیب سے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے اور اپنے سازوں کو ٹھونڈیوں اور کندھوں کے نیچے دوائے ایک طرف دھن بجا رہے تھے۔ ایک قلیل تعداد میں لوگ ان کے گروہ حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں بیٹے ہوئے پارچے پر بھجوتی پالت کے چند نوٹ اور کچھ شے پڑے تھے۔ جب تماشاخیوں میں سے کسی کا جی وائٹن کی آوازوں سے بھر گیا تو اس کے پاس مزید وہاں ٹھہرنے کی فرصت باقی نہ رہتی تو وہ اس پارچے پر ایک ڈالروالا نوٹ یا کواریٹ کا ایک سکہ (پینیس سینٹ) اچھال کر اپنی راہ لیتا۔

صوفیہ بھی ان تماشاخیوں میں موجود تھی اور پرس میں ہاتھ گھسائے ان نوٹوں کو ٹٹول رہی تھی جو اس نے گھر کا فرنیچر، ٹیلی ویژن سیٹ اور اپنی سائیکل بیچ کر حاصل کیے تھے۔ وہ کب سے غور کر رہی تھی کہ اللہ کی خاطر وہ کیا کرے اور وائٹن نوازوں کی ٹٹول پر نظر پڑنے ہی اسے لگا تھا کہ یہ ایک ایسا کام ہو سکتا تھا جس سے اللہ خوش ہوتا۔ اس نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے پرس میں سے ساری نقدی نکال کر اسے گنا تھا حالانکہ اسے پہلے سے ہی معلوم تھا کہ وہ کتنی تھی۔

اسے بالوں نے گھیر لیا۔ وہ اس رقم میں سے ایک سینٹ بھی کسی کو دینے کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ایک بار پھر رقم کو گننے لگی۔ اس کا ارادہ متزلزل ہو رہا

تھا۔

وہ وائٹن نوازوں کا ایک گروہ تھا، جو بے گھر بچوں کی فلاح کے لیے چندہ جمع کر رہا تھا۔ سازندے ایک خاص ترتیب سے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے اور اپنے سازوں کو ٹھونڈیوں اور کندھوں کے نیچے دوائے ایک طرف دھن بجا رہے تھے۔ ایک قلیل تعداد میں لوگ ان کے گروہ حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں بیٹے ہوئے پارچے پر بھجوتی پالت کے چند نوٹ اور کچھ شے پڑے تھے۔ جب تماشاخیوں میں سے کسی کا جی وائٹن کی آوازوں سے بھر گیا تو اس کے پاس مزید وہاں ٹھہرنے کی فرصت باقی نہ رہتی تو وہ اس پارچے پر ایک ڈالروالا نوٹ یا کواریٹ کا ایک سکہ (پینیس سینٹ) اچھال کر اپنی راہ لیتا۔

صوفیہ بھی ان تماشاخیوں میں موجود تھی اور پرس میں ہاتھ گھسائے ان نوٹوں کو ٹٹول رہی تھی جو اس نے گھر کا فرنیچر، ٹیلی ویژن سیٹ اور اپنی سائیکل بیچ کر حاصل کیے تھے۔ وہ کب سے غور کر رہی تھی کہ اللہ کی خاطر وہ کیا کرے اور وائٹن نوازوں کی ٹٹول پر نظر پڑنے ہی اسے لگا تھا کہ یہ ایک ایسا کام ہو سکتا تھا جس سے اللہ خوش ہوتا۔ اس نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے پرس میں سے ساری نقدی نکال کر اسے گنا تھا حالانکہ اسے پہلے سے ہی معلوم تھا کہ وہ کتنی تھی۔

اسے بالوں نے گھیر لیا۔ وہ اس رقم میں سے ایک سینٹ بھی کسی کو دینے کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ایک بار پھر رقم کو گننے لگی۔ اس کا ارادہ متزلزل ہو رہا

تھا۔

وہ وائٹن نوازوں کا ایک گروہ تھا، جو بے گھر بچوں کی فلاح کے لیے چندہ جمع کر رہا تھا۔ سازندے ایک خاص ترتیب سے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے اور اپنے سازوں کو ٹھونڈیوں اور کندھوں کے نیچے دوائے ایک طرف دھن بجا رہے تھے۔ ایک قلیل تعداد میں لوگ ان کے گروہ حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں بیٹے ہوئے پارچے پر بھجوتی پالت کے چند نوٹ اور کچھ شے پڑے تھے۔ جب تماشاخیوں میں سے کسی کا جی وائٹن کی آوازوں سے بھر گیا تو اس کے پاس مزید وہاں ٹھہرنے کی فرصت باقی نہ رہتی تو وہ اس پارچے پر ایک ڈالروالا نوٹ یا کواریٹ کا ایک سکہ (پینیس سینٹ) اچھال کر اپنی راہ لیتا۔

صوفیہ بھی ان تماشاخیوں میں موجود تھی اور پرس میں ہاتھ گھسائے ان نوٹوں کو ٹٹول رہی تھی جو اس نے گھر کا فرنیچر، ٹیلی ویژن سیٹ اور اپنی سائیکل بیچ کر حاصل کیے تھے۔ وہ کب سے غور کر رہی تھی کہ اللہ کی خاطر وہ کیا کرے اور وائٹن نوازوں کی ٹٹول پر نظر پڑنے ہی اسے لگا تھا کہ یہ ایک ایسا کام ہو سکتا تھا جس سے اللہ خوش ہوتا۔ اس نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے پرس میں سے ساری نقدی نکال کر اسے گنا تھا حالانکہ اسے پہلے سے ہی معلوم تھا کہ وہ کتنی تھی۔

اسے بالوں نے گھیر لیا۔ وہ اس رقم میں سے ایک سینٹ بھی کسی کو دینے کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ایک بار پھر رقم کو گننے لگی۔ اس کا ارادہ متزلزل ہو رہا

تھا۔

وہ وائٹن نوازوں کا ایک گروہ تھا، جو بے گھر بچوں کی فلاح کے لیے چندہ جمع کر رہا تھا۔ سازندے ایک خاص ترتیب سے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے اور اپنے سازوں کو ٹھونڈیوں اور کندھوں کے نیچے دوائے ایک طرف دھن بجا رہے تھے۔ ایک قلیل تعداد میں لوگ ان کے گروہ حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں بیٹے ہوئے پارچے پر بھجوتی پالت کے چند نوٹ اور کچھ شے پڑے تھے۔ جب تماشاخیوں میں سے کسی کا جی وائٹن کی آوازوں سے بھر گیا تو اس کے پاس مزید وہاں ٹھہرنے کی فرصت باقی نہ رہتی تو وہ اس پارچے پر ایک ڈالروالا نوٹ یا کواریٹ کا ایک سکہ (پینیس سینٹ) اچھال کر اپنی راہ لیتا۔

صوفیہ بھی ان تماشاخیوں میں موجود تھی اور پرس میں ہاتھ گھسائے ان نوٹوں کو ٹٹول رہی تھی جو اس نے گھر کا فرنیچر، ٹیلی ویژن سیٹ اور اپنی سائیکل بیچ کر حاصل کیے تھے۔ وہ کب سے غور کر رہی تھی کہ اللہ کی خاطر وہ کیا کرے اور وائٹن نوازوں کی ٹٹول پر نظر پڑنے ہی اسے لگا تھا کہ یہ ایک ایسا کام ہو سکتا تھا جس سے اللہ خوش ہوتا۔ اس نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے پرس میں سے ساری نقدی نکال کر اسے گنا تھا حالانکہ اسے پہلے سے ہی معلوم تھا کہ وہ کتنی تھی۔

اسے بالوں نے گھیر لیا۔ وہ اس رقم میں سے ایک سینٹ بھی کسی کو دینے کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ایک بار پھر رقم کو گننے لگی۔ اس کا ارادہ متزلزل ہو رہا

تھا۔

تھا۔ اس نے سب سے زیادہ حالت کا نوٹ جو بیس ڈالر کا تھا، الگ کر لیا۔ وہ کئی ٹائپے شش وچ میں مبتلا بیس ڈالر کے اس نوٹ کو انگلیوں میں مروٹی رہی۔ آخر کار اس نے نقدی والے پارچے کی طرف پیش قدمی کی اور کھولی ہوئی کیفیت میں نوٹ کو دیکھا۔ اس کی پشت پر درج شدہ الفاظ نے اس کی نظر کو جکڑ لیا تھا۔

In god we trust

اس نے بار بار وہ الفاظ دیکھے ہوں گے لیکن باضی میں وہ اس کے ذہن میں کوئی تاثر نہ ابھارتے تھے۔ اس وقت انہیں پڑھ کر وہ جتنی فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے نوٹ کو پارچے پر پھینک دیا تھا۔ مطرووں کے سرخیل نے کمانچے کو وانٹن کے تاروں سے دور لے جا کر ہاتھ کو ہوا میں اونچا کیا تو سارے مطرووں نے وانٹن بجانے بند کر دیے اور ٹھوڑیوں کو کندھوں سے جدا کرتے ہوئے گردنیں سیدھی کر لیں۔ سرخیل خوشی سے اعلان کر رہا تھا۔ ”اس لمحے تک یہ آج کے دن کا سب سے زیادہ چندہ ہے جو اس رحم دل لڑکی نے ہمیں دیا۔ یہ خصوصی داد کی محنت ہے۔“

سب حاضرین اس کی طرف متوجہ ہوئے اور تالیاں بجانے لگے۔ مطرووں نے پھر سے کمانچے سنبھالے اور نئے جوش سے وانٹن کے تاروں سے سر نکالنے لگے۔ صوفیہ خفت سے سرخ ہو گئی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس مقام سے دور ہو گئی تھی۔

”کیا میں نے یہ نیکی محض اللہ کی خوشی کو مد نظر رکھ کر کی ہے؟“ اس نے اپنے من کو کیر دیا۔

”اگر ایسا ہی ہے تو میں خوش کیوں نہیں ہوں؟ اللہ کی راہ میں کیے جانے والے کام تو خالص خوشی دیتے ہیں۔ شاید اس کام میں دکھاوہ بھی شامل تھا۔ میں نے سوچا کہ بیس بیس خیرات میں دینے پر لوگ مجھے سراہیں گے۔ مجھے ایک اچھی لڑکی تصور کریں گے۔ بدلے کی امید تو لگاؤ کی میں نے، صلہ تو چاہیے تھا مجھے اور بیس بیس کی اوقات کیا ہے۔ اللہ جو اپنی لا تعداد مخلوقات میں سے مجھ پر بطور خاص مہربان ہوتا

ہے۔ اس کی محبت کا جواب میں بیس بیس کیس سے دیتی ہوں۔ اس قدر ادنیٰ ایثار اتنا پست حوصلہ ہے میرا۔“ وہ شرم سے مری جا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے بڑھ کر غم زدہ تھی۔

اس شام اٹارنی، آرچی گرن کے دفتر پر تین چیزوں کا تعلق تھا۔ تمباکو کا دھواں، خاموشی اور مایوسی۔ وہ اتنا بیزار تھا کہ اس نے اپنا سیل فون بند کر رکھا تھا اور دفتر کے لیٹی فون سیٹ کا ریسیور اتار کر ایک طرف ڈال دیا تھا۔ راکھ دان میں سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹوٹوں اور راکھ کی مقدار میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے منہ سے ہلکی ہلکی فائل کو میز کے آخری سرے پر پٹا اور در سے بھری کینٹیوں کو انگلیوں سے دبائے لگا۔ وہ ایک یقینی شکست سے دوچار تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس سے قبل بھی اس کا شکست سے پالانہ پڑا ہو۔ وہ کوئی زیادہ کامیاب شخص نہیں تھا۔

وہ ایک بلیک ڈیفنڈر تھا اور اپنی موجودہ حیثیت سے کسی بھی طرح مطمئن نہ تھا۔ اس نے ہمیشہ سے کسی بڑی پرائیویٹ لاء فرم میں پارٹنر بننے کا خواب دیکھا تھا لیکن یہ خواب تب پورا ہوا جب وہ غیر معمولی قابلیت اور لیاقت کا مظاہرہ کیا تا اور بڑے نجی اداروں کی نظر میں خود کو برکشت ثابت کیا۔

اس کے برعکس اس نے دوسرے درجے کی ایک بڑی شہرت والی یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی تھی اور کم و بیش ہر معاملے میں اوسط واقعہ ہوا تھا۔ اگر وہ اپنی صلاحیتوں کو حقیقت پسندی سے جانتے ہوئے فیصلہ کرتا تو وہ بلیک ڈیفنڈر کے طور پر کام کرنے کا بھی اہل نہیں تھا لیکن انسانوں کی اکثریت کی طرح وہ بھی خوش فہم تھا۔ وہ ہر ناکامی کا الزام قسمت کے کھاتے میں ڈال کر اپنی انا کو مطمئن رکھتا تھا۔ اس کاوتیرہ تھا کہ وہ کسی متوقع ناکامی پر جی بھر کے مایوس ہو کر اٹھا اور جدوجہد کرنے کے بجائے اپنے پلوں پھوڑ کر بیٹھ رہتا تھا۔

اس بار ناکامی کا نام میبل تھا۔ ویسے یہ اس کا اصل نام نہیں تھا۔ یہ تو وہ نام تھا جس سے نکارا جانا اسے پسند تھا۔ اس کے والدین کا رکھا ہوا نام ٹولی کریگ تھا۔ بد قسمتی سے آرچی گرن کو میبل کا اٹارنی مقرر کر دیا گیا تھا۔ وہ بد نیت سیاہ فام لڑکا نہایت اچھے ہوئے کروار کا حامل تھا۔ فسادات میں اس کے باپ اور بہن بھائی مارے گئے تھے۔ تب سے وہ اکیلا رہا تھا۔ اس کا نہ تو کوئی حلقہ تھا اور نہ ہی احباب۔ اس کا آئی کیو لیول ستر سے اسی کے درمیان تھا۔ اسے انجی بہن سے جس کا نام میبل تھا، غیر معمولی جذباتی وابستگی تھی۔ وہ کبھی بھی اس کی موت کو تسلیم نہیں کر لیا تھا۔ غالباً اسی سبب اس نے خود کو میبل کہلوانا شروع کر دیا۔ اس پر ایک لڑکی کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ بلکہ الزام کیا تھا ایک لحاظ سے ثابت ہو چکا تھا۔ تمام واقعاتی اور مادی شہادتیں اس کے مجرم ہونے کی نشاندہی کرتی تھیں۔

مقتولہ کے ناخنوں سے ملنے والے انسانی گوشت کے ذرات میبل کی کھال کا حصہ قرار پائے تھے یعنی وہ مرتے ہوئے مزم سے جسمانی مزاحمت کر رہی تھی۔ پولیس نے میبل کو اس حال میں پکڑا تھا کہ وہ لڑکی کی لاش کو فٹ پاتھ سے نیچے کھینچ رہا تھا۔ آلہ قتل جو ایک چھوٹی آگنی ہتھیوڑی تھی، مردہ لڑکی کے لباس کے اندر سے ملی تھی۔ اگرچہ اس پر سے نشانات انگشت دستاب نہیں ہوئے تھے لیکن اخبار پڑھنے والے اور ٹیلی ویژن دیکھنے والے کسی مجرم کے لیے یہ انتظام کرنا معمولی بات تھی۔ میڈیا کی دی ہوئی غیر ضروری انگلی نے جرائم پیشہ افراد کو محتاط اور چالاک بنادیا تھا۔

ڈاؤن ٹاؤن لاس اینجلس میں واقع جوتوں کی ایک بڑی دکان کے سیلزوائے نے کوئی دی تھی کہ اس نے کل کے دن سے پہلے میبل کو مقتولہ سے ہاتھ باندھ کر لے دیکھا تھا۔ یہ تصدیق بھی ہو چکی تھی کہ وہ لڑکی انٹھونی ہڈ کے گیارہویں جاتی رہتی تھی، جہاں میبل کام کرتا تھا۔ یہ سارے حقائق پیش پیری کے نظریے کو تقویت دیتے تھے اور باقی کا محرم تو اس مسئلے کا

حل بھی اسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی نے نکال لیا تھا۔ وہ ایک دلچسپ کہانی لے کر آیا تھا۔ میبل کو سفید فاموں سے نفرت تھی۔ مبینہ طور پر اس کے والدین اور بہن بھائی سفید فام لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے رشتے کے بچا انٹھونی ہڈ کے بقول میبل نے ایک سے زیادہ مواقع پر سفید فاموں سے انتقام لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ جیوری، جو آٹھ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل تھی اور جس میں سب کے سب سفید کھالوں والے تھے، اس مفروضے سے مکمل متفق نظر آتی تھی۔ پروسیکیوشن (استغاثہ) کے پاس لاش تھی، آلہ قتل تھا۔ premeditation کی بنیاد میں شہادتیں تھیں۔ ایک معقول محرک تھا اور ایک مہربان جیوری بھی تھی۔ وہ میبل کو فرسٹ ڈگری مژدہ میں سزایاب کروانے کی پوری طاقت رکھتے تھے۔

دوسری طرف ڈیفنس اٹارنی (وکیل صفائی) آرچی گرن تھا، جس کو خود بھی میبل کے بے گناہ ہونے کا یقین نہ تھا۔ اس کی اپنی کہانی میں جوتوں کے ایک جوڑے کے ذکر کی بھرمار تھی۔ وہ اس درجہ بھونڈی اور حقیقت سے ماورا داستان تھی کہ اگر اسے جیوری کے ممبران کے گوش گزار کیا جاتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ آرچی کو فائز العقل تصور کرتے۔ آرچی نے میبل سے حقائق اگلوانے کی حتی الوسع کوشش کی تھی مگر وہ اپنی فیری ٹیل کا ایک حرف بھی ادھر سے ادھر کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

پروسیکیوشن اپنا کیس پیش کر چکی تھی اور کل ڈیفنس کی شروعات کرنا تھیں۔ میبل اتنا بد شکل تھا کہ جیوری کو اس سے ہمدردی ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ جیوری تو ایک طرف رہی، خود آرچی کے اندر اس کی صورت دیکھنے پر نفرت لڑتی تھی۔ وہ معذور تھا اس کے باوجود اس کی جسمانی قوت کے بارے میں کسی غلط تاثر دینا آسان نہیں تھا۔ وہ ایک دیو جتنی جسامت رکھتا تھا۔ کئی ہوئی ٹانگ کے ساتھ بھی وہ مرنے والی دلی سلی، سفید نازک لڑکی پر حاوی دکھائی دیتا تھا۔

جب اسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی نے عدالت میں

تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے شامل بلحقہ گیارے میں داخل ہو گیا۔ اب وہ اسے نظر آتا نہ ہو گیا تھا۔ پھر اس کی مدھم گنگناہٹ عمر کے کانوں تک آنے لگی۔ وہ اجنبی زبان میں گاربا تھا اور cucu cucu کی تکرار کر رہا تھا۔

وہ نوٹ صوفیہ کا آخری سراغ تھا اور وہ اس سے دور جا رہا تھا۔ صوفیہ اس کی زندگی سے جانے والی تھی۔ وہ چاچکی تھی۔ وہ چند قدم چلا اور دوبارہ رک گیا۔ اسے گلی میں جھانکتے ہوئے شامل کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی تھی۔

”مجھے ایک بات بر سخت تعجب ہے عمر! تم مجھے اللہ کی محبت کے لائق سمجھتے ہو اور اپنی محبت کے لائق نہیں سمجھتے۔ تم تو ایک انسان ہو۔“

کوئی بھاری شے اس کے سینے میں پھڑپھڑانے لگی۔ اس کا جم تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پھیلنے سے ٹھن ہونے لگی۔ وہ اتنی پھیل گئی کہ سانس کی راہ مسدود ہو گئی۔ وہ دروازے پر پسیوں کو توڑ ڈالنے کے درپے تھی۔ بے اختیار وہ شامل کے تعاقب میں چلنے لگا۔ وہ اس گلی میں پہنچا تو شامل کو تیز رفتاری سے جاتے ہوئے پایا۔ وہ بے لگ بھرنے لگا۔

”شامل! رو۔“

اس کے آواز دینے پر شامل نے رے کے بغیر کچھ کہا جو اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

”وہ نوٹ مجھے واپس دے دو۔ میری بات سنو۔“ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے شامل بھاگ رہا تھا۔ وہ بھی بھاگنے لگا اور اسے مسلسل پکارنے لگا۔ شامل ان سنی کر کے ناک کی سیدھ میں دوڑ رہا تھا۔ وہ پوری قوت سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ شامل ایک پھر تیار لڑکا تھا۔ وہ دیر تک اسے بھاگاتا رہا۔ اگر وہ ایک بندگی میں پھنس کر رہے بس نہ ہو گیا ہوتا تو جانے کب تک عمر کے ہاتھ نہ آتا۔ وہ شامل کے سر پر پہنچ گیا اور اس سے نوٹ لوٹانے کا مطالبہ دہرانے ہی والا تھا کہ شامل نے جھٹکے سے جیب میں انگلیاں گھسا کر نوٹ کو باہر کھینچا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے درمیان سے

پھاڑ ڈالا۔

”جنم میں جاؤ Sanamagan۔“ نوٹ کے ٹکڑوں کو ہوا میں اچھالتے ہوئے اس نے غصے سے چلا کر کہا۔

یقیناً وہ اسے گلی دے رہا تھا۔ عمر کو اس پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس نے تیزی سے نیچے جھٹکتے ہوئے نوٹ کے پھنے ہوئے حصوں کو مٹھی میں دبوچ لیا۔ اس نے نظر اٹھائی تو شامل بری طرح رو رہا تھا۔ بے قابو غصہ اور آنسوؤں کی ٹہنی بھٹکتے سے اس کا کمر و بدن ہل رہا تھا۔

”رونا بند کرو۔“ عمر نے سانس بحال کرتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے یہ رقم چھین نہیں رہا۔ میں تو صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ پچاس ڈالر میں ایک اچھی پکنک نہیں ہو سکے گی۔ کیوں نہ میں تمہیں سو ڈالر دے دوں تاکہ تم بس بھالی خوب عیش کرو۔“

بھبرایا ایک بار پھر سکے میں چلا گیا۔ ”اگر تم سو ڈالر دو گے تو میں Diantre ضرور کموں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔“



صوفیہ پولیس آفیسر کے ہمراہ عدالت سے باہر آئی تو لوگوں کے پھرتے ہوئے جھوم نے اس پر گالیوں اور دھمکیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ اس پر ہر وہ برا لفظ آزما رہے تھے جو ان کے ذخیرہ الفاظ میں موجود تھا۔ وہ اسے زندہ جلانے اور اس کا سر کاٹ ڈالنے کا اعلان کر رہے تھے۔ وہ قتل ہونے والی لڑکی کے رشتہ دار اور دیگر سو گواران تھے۔ وہ ہر صورت میں کو اس قتل میں سزا پاب کروانے پر کمر بستہ تھے لیکن عدالت میں دیے گئے صوفیہ کے بیان کے بعد یہ ممکن نظر نہ آتا تھا۔ لہذا ان کا معاندانہ رویہ باعث حیرت نہ تھا۔

صوفیہ نے کسی پر توجہ نہیں دی تھی، آفیسر کی حفاظت میں وہ اس ہنگامے سے دور سڑک پر آگئی تھی۔ اسے پولیس کار میں بٹھایا گیا اور کار فوراً ہی

روانہ ہو گئی۔ وہ کھڑکی کے شیشے میں سے گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھنے لگی۔ پولیس آفیسر نے اس سے کوئی بات کی جس کو اس نے نظر انداز کر دیا۔ وہ کچھ کہنے یا کچھ سننے کی حالت میں نہیں تھی۔

وہ خوش تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ اس کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ اس تجربے سے گزر رہی تھی۔ جس سے کوئی بد صورت عورت ایک خوب صورت بننے کو جنم دے کر گزرتی ہے۔ اس نے ایک ایسا کام کیا تھا جس سے کوئی بھی غرض بندھی ہوئی نہ تھی۔

اس نے میبل کی بے گناہی دنیا برا واضح کر دی تھی اور میبل کون تھا؟ کوئی بھی نہیں۔ نورے ڈیم کا کپڑا جو اس کا شکر یہ تک ادا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھید بھاؤ کا انٹر نہیں سمجھتا تھا۔ ایچ بی سے انجان تھا۔ صوفیہ نے کسی کو خوش نہ کیا تھا، صرف اللہ کو خوش کیا تھا تو اسے خوش کیوں نہ لیتی؟

اس نے کھڑکی سے باہر آسمان کی سمت نگاہ کی۔ بادلوں والی دھوپ پر اام کے اونچے درختوں کے آر پار ہو رہی تھی۔

صوفیہ نے ڈرائیو کرنے والے آفیسر کو گاڑی روکنے کو کہا۔

”مجھے اسی جگہ اتار دو۔ یہاں سے آگے میں پیدل جاؤں گی۔“

”یہ موزوں نہیں ہو گا۔ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ تم نے جسے ناراض کیا ہے وہ گینگسٹرو ہے۔“

اس تنبیہ پر صوفیہ مسکرائی تھی۔ ”میں نے جسے راضی کیا ہے اس کا نام تمہیں بتا دوں تو تم جا کر اس گینگسٹر کو سمجھانے لگو۔“

”کیا؟“

صوفیہ اس کی حیرانی سے محفوظ ہوئی تھی۔

”اس شہر میں ایسا موسم پھر کبھی نہیں آئے گا۔ تم مجھے میرے حصے کی ہوا سے محروم نہ کرو۔“

وہ بغیر رہی تو گاڑی روک کر اسے اتار دیا گیا۔ پولیس کار کے فاصلے پر جانے تک وہ ایک جگہ کھڑی

رہی۔ پھر اس نے اپنے پیروں سے جوتے الگ کیے اور انہیں احتیاط سے سڑک کے کنارے رکھ دیا۔ عمر کے اس کھٹے کی وہ ہر ممکن حد تک حفاظت کرتی تھی۔ اس نے سیل فون بھی جوتوں کے ساتھ رکھا اور ننگے پاؤں سڑک پر پھرنے لگی۔ ہوا میں بارش کی مہک اس کی پوروں میں بستی تھی۔ درختوں تلے لمبا اندر تھا۔ وہاں ہوا بھی بالکل اور ان کی نمی تھی اور خوشی تھی۔ ایک بے کنار مسرت جو اس کے وجود میں سمائی نہ تھی۔ اس نے کسی پر بندے کی مانند بائیں پھیلائی اور بچوں کے بل کھونٹے لگی۔

spanish dancer ! turn around
اس کے ہونٹوں پر ایسا کاکیت آگیا۔ اس نے زور سے چکر کاٹا۔

”spanish dancer ! get out
of the town
وہ ایڑیاں اچکا کر گھومی۔

”They called me out for
the world to see“
اس کا گھیر وار اسکرٹ اس کے جسم کے گرد لپٹا اور اٹھتا تھا اور اس میں ہوا بھر رہی تھی۔

”Spanish dancer ! get
out of the town“
وہ ایک اور چکر پورا نہ کر پائی۔ سڑک پر قدموں کی گہری دھمک گونجی تھی۔

”اسے سزا دو۔ اسے ایک عبرتناک سزا دو۔“ کسی نے چلا کر کہا تھا۔ وہ خوف سے سن ہو گئی۔ وہ لوگ دوڑتے ہوئے اس کے نزدیک آگئے۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔ اسے کھینچ کر زمین پر گر ادیا گیا تھا۔ اس نے بوچھا جاپا کہ وہ اس پر ہر نام کیوں تھے لیکن بولنے کے لیے منہ کھولا تو کوئی لفظ برآمد نہ ہوا۔ وہ منہ کو بند بھی نہیں کر سکی تھی۔ ان میں سے ایک صمیم مرد نے اس کے پیٹ سے کھوکھاری تھی۔ درونے اس کے جسم کو چیر ڈالا تھا۔ وہ آخری شوکر نہیں تھی۔ وہ تو آغاز تھا۔

”اسے مار ڈالو۔ یہ چیزیل ہے۔ یہ اس کا لے جانور

کی مددگار ہے۔“

دوسری ٹھوکر پر وہ گھٹ کر پڑے ہوئی۔ وہاں کوئی ”پرے“ نہیں تھا۔ صرف کرخت جوتے تھے جو بے جان سڑک اور زندہ گوشت میں تیز نہیں کرتے تھے۔ پیلوں میں پڑنے والے ٹھنڈے نے اسے دہرا کر دیا۔ اس نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے ان بے رحم جوتوں کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ دو تھے لیکن اسے پکڑنے والے پاؤں کتنے تھے؟ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اگر وہ جیتی تھی تو شاید اس کا سانس رواں ہو جاتا۔ وہ اندر ہی کہیں قید ہو گیا تھا اور سانس نہ لپانے سے وہ کسی آدمی کی ہوئی گردن والے پرندے کی طرح تڑپتی تھی۔ وہ اب بھی اسے گالیاں دے رہے تھے۔ لیکن یہ پریشان ہونے کی بات نہیں تھی۔

تشویش تو اس بات پر تھی کہ وہ اب تک سننے اور سمجھنے کے قاتل کیوں تھی؟ وہ بے سُدھ کیوں نہیں ہو جاتی تھی! اس کی حیات کام کرنا کیوں نہیں چھوڑتی تھیں۔ ایک بار اس کا ہوش چلا جائے تو اسے کیا کہ وہ اسے گالیاں دیں یا اس کے ٹکڑے کر دیں۔ ٹھوکر میں اسے لڑھکائیں، اچھائیں، سیدھا کر دیں، ٹھنڈوں کے بل یا اونڈے منہ۔ اپنے اعضاء اس کا اختیار ختم ہو چکا تھا۔ اگر وہ اپنی مرضی سے حرکت کر سکتی تو اس میں سے کسی ایک کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ کم از کم ایک سب سے تو اس کا جسم محفوظ ہو جاتا۔

اس کی زبان مردہ گوشت کا ٹھنڈا ہو چکی تھی ورنہ وہ ان کی منت سماجت کرتی۔ وہ پیچھے مڑ کر زور ڈالتے ہوئے چیخنے کے لیے سخت جدوجہد کر رہی تھی۔ اس کے تڑپنے میں کمی آنے لگی۔ وہ لفظ بے لفظ ساکت ہو رہی تھی۔ پھر اندھیرے کا مہمان مکر ایک ریشمی تار سے جھونکا ہوا اس پر اتر اور اسے نرم جالے میں لینے لگا۔ حواس سلب ہونا بعض اوقات کتنا راحت بخش ہوتا ہے۔

وہ ایک تاریک اتھاہ میں ڈوبنے لگی۔ وہ ہرگز اس گہرائی سے ابھرتا نہیں چاہتی تھی مگر کوئی جھنجھٹا ہٹ تھی جو اس کو اوپر کھینچ رہی تھی۔ وہ جھنجھٹا ہٹ بدترج

ایک گیت میں ڈھل رہی تھی۔ اس کے گرد جلال مٹا ہوا مکر بادک کر آسمان کی طرف اڑنے لگا۔ درد لوٹ رہا تھا۔ وہ پہلے سے بڑھ کر بھیاک روپ میں لوٹا تھا۔ اس کے گال کے نیچے کھردری زمین گیلی تھی۔ اس پر ان گنت ننھے ننھے ٹنگر گر رہے تھے جو اسے بھگو رہے تھے۔

اگلے چند لمحوں میں اسے اور اک ہو گیا کہ بارش رہی تھی۔ وہ گیت اس کے کان میں گھسا جا رہا تھا۔ اس کا منہ کمال تھا؟ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اس کا سیل فون تھا جو کہیں پاس ہی بچ رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ وہ ممبر صرف ایک شخص کے علم میں تھا۔ کیا عمر اسے کل کر رہا تھا؟

اس خیال نے اسے سر سے پاؤں تک جھنجھوڑ ڈالا۔ اس نے بے چینی سے سیل فون کو تلاش کیا۔ وہ اس کے ہاتھ سے ذرا ہی دور تھا۔ کوشش کیے بغیر بھی وہ جانتی تھی کہ وہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بازو اس نے زمین کو پھیلنے سے پکڑتے ہوئے خود کو آگے دھکیلا اور تب اسے ہاتھوں پر لگا ہوا خون دکھائی دیا۔ جانے وہ ہاتھوں سے بہا تھا یا جسم کے کسی دوسرے حصے سے نکل کر ہاتھوں پر لگ گیا تھا۔ یہ تعین کرنے کی فرصت کسے تھی؟ اس نے کسی نہ کسی طرح سیل فون کو ٹھیک کر منہ کے قریب کیا اور کا پتی ہوئی انگلی سے بٹن دبا تو بے اسپیکر آن کر دیا۔

”صوفی! شکر ہے کہ تم نے فون اٹھالیا۔“ وہ عمر تھا۔

اس نے ہاتھ کی آؤ بنا کر بارش کی بوندوں کو سیل فون پر گرنے سے روکا اور گردن میڑھی کر کے نیچے دبے ہوئے کان کو زمین سے جدا کیا۔

”ہم لوگ ایرپورٹ جا رہے ہیں۔ میں، میری امی، ثانی اور میرے بامول۔ ہم پاکستان جائیں گے۔ تم سن رہی ہو صوفی!“

”ہاں۔“

”میں بڑی دیر سے تمہیں کال کر رہا ہوں۔ کیا تم مصروف تھیں یا مجھ سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی

ہیں۔“ وہ خاموش ہو کر اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا تھا۔

”بولتے رہو عمر!“ اس نے گراہ کر کہا۔

”ہماری فلائٹ میں تھوڑا ہی وقت باقی ہے۔ میں ہلدی میں ہوں۔“

”میں بھی جلدی میں ہوں۔“

”میں پاکستان پہنچ کر تم سے پھر رابطہ کروں گا۔“

”جو بھی کہنا ہے، ابھی کہو۔ پاکستان جانے پر۔“

اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ بارش کے قطرے چسپاں ہو رہے تھے۔ ان کے گرنے میں تیزی آ رہی تھی۔

”بہت شور ہے۔ تمہارے الفاظ وضاحت سے سنائی نہیں دے رہے۔“

”بارش ہو رہی ہے۔“

”تم کسی دوسری جگہ کیوں نہیں چلی جاتیں، بارش سے دور تاکہ یہ شور نہ ہم پر جائے۔“

”میں نہیں چا سکتی۔ تم بائیں کرتے رہو عمر!“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔“

سڑک پر بہتا ہوا پانی فون میں داخل ہونے لگا تھا۔

مگر کی آواز غیرواضح ہوئی جاری تھی۔

”تم تو جھوٹ نہیں بولتے۔“ اس نے حلق کے بل چلا کر کہا تھا۔

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“

”اب تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ اس نے آری کے دندانوں جیسے درد سے لرزتے ہوئے پوچھا۔

”صوفی! میں اگلے سال دوبارہ امریکہ آؤں گا تو میرے آنے کا مقصد محض سمسٹر میں شرکت کرنا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں لینے آؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلو گی نا؟“

”ہاں تم جہاں لے جاؤ گے میں جاؤں گی۔“

”تمہاری آواز بالکل ڈوب گئی ہے۔ میں تم سے اب محبت کرتا رہوں گا۔ میں تمہیں ابھی دھکی نہیں

ہوئے دوں گا۔ تم میرا انتظار کرو گی نا؟“

”ہاں میں کروں گی۔ میں مرنے تک تمہارا انتظار کروں گی۔ تمہیں پتا ہے عمر! میں نے قیمت ادا کی ہے۔ تم ہی تو کہتے تھے کہ بعض چیزوں کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ کوئی میں چھپ کر بیٹھنے سے بات بنتی ہی نہیں۔ قیمت ادا کرنے والے اچھے لوگ ہوتے ہیں عمر!

خدا ان سے خوش ہوتا ہے۔“

”صوفی! صوفی!“

نمی نے فون کو ناکارہ بنا دیا تھا۔

قطرے اس کی آنکھوں میں گر رہے تھے، ہاتھوں اور باپچوں میں گھس رہے تھے۔ اس نے چہرہ موڑ کر زمین پر گال نکال دیا۔

عمر کہتا تھا کہ مشک آہو جان سے جاتا ہے تو کستوری حاصل ہوتی ہے۔ ریشم کا کیرا فانا ہوتا ہے تو ریشم ملتا ہے۔ وہ فنا ہو رہی تھی۔ وہ اللہ کی خاطر فنا ہو رہی تھی۔

اس کے حلق میں کوئی شے اٹکی تھی جو اس کا دم گھونٹ رہی تھی اور وہ یاد کرتی تھی کہ عمر نے ایک اور بات بھی کہی تھی جس کا یاد آنا ہی بت ضروری تھا۔

روشنی کم ہونے لگی۔ روشنی مٹ رہی تھی۔

روشنی اس کی پتلیوں میں سمٹ رہی تھی اور اچانک اسے وہ بات یاد آئی۔ عمر نے کہا تھا کہ اسے اللہ کہہ کر پاکارو۔ یہ اس کا ذاتی نام ہے۔ اس میں قہر ہے۔

اس نے زور لگا کر جڑوں میں پھنسی ہوئی زبان کو ہلایا اور وہ نورانی لفظ اس کے ہونٹوں تک آگیا۔

”اللہ۔“ اس کا دل پھٹنے ہوئے موم کی پیالی بن گیا اور پیالی پھٹنے لگی۔ اس لمحے میں قہر تھی اور ایک انوکھی لذت تھی۔ ایک مکمل خوشی اور سہمی۔

اس کے حلق میں اٹکی ہوئی کسمبلی شے اچھل کر باہر آگئی تھی اور اس کے منہ اور ناک سے رس رہی تھی۔ اس نے اپنے خون کو زمین پر رنگتے اور پیالی سے پھسل کر دھلتے ہوئے دیکھا۔ تب اس نے ایک نقوش سے عاری چہرہ بھی دیکھا۔ اس چہرے پر آنکھیں، ناک، ہونٹ کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اس سے خائف نہیں ہوئی وہ غمگین بھی نہیں ہوئی۔

کائنات میں کیا تھا جو اس لمحے صوفیہ کی مٹھی میں نہ تھا۔

تھا۔
اللہ نے اسے گرائنڈ کے دل سے کبھی نہیں نکالا تھا۔ اللہ اس سے ناراض نہیں تھا۔

ایک سفید دھبہ تھا جس کا پھیلاؤ اس کی آنکھوں پر قابض ہو رہا تھا۔ اس میں چمک بھی، جو چھپتی تھی اور پوٹوں کو اٹھنے نہ دیتی تھی۔ چند لمحے کو شش کرنے کے بعد اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔
”صوفیہ! کیا تم جاگ چکی ہو۔“

اس نے جیسے والی روشنی کی پروا کیے بغیر آنکھیں کھول دیں۔ وہ اسپتال کا کمرہ تھا اور وہ سفید چادر والے بستر کے کدے کو اپنی کمر کے نیچے دے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ وہ دو آؤں کی بو سونگھ سکتی تھی۔ درد کی ٹیسوں اور ان کی وجہ کو بھی اس نے شعوری طور پر قبول کر لیا تھا لیکن وہ اپنی بصارت پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی کہ وہ حقیقت میں عمر کوئی دیکھ رہی تھی۔

”تم جاگ گئی ہو پوٹوں! اکثر اطلاع دیتا ہوں۔“
”میں سوئی کب تھی جو جاگتی۔ میں تو مر گئی تھی۔“
”ان وحشیوں نے تمہیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ان میں سے دو کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ ایک راہ گیر عورت نے ان کی گاڑی کا نمبر دیکھ لیا تھا۔ اسی نے پولیس کو تمہارے متعلق اطلاع دی۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“
”تم نے پوچھا ہی نہیں تھا۔“

”میں کیا پوچھتا صوفیہ! کہ تم مر گئی ہو یا ابھی تمہارے مرنے میں کچھ رہا ہے؟“ وہ پہلی بار غصے میں نظر آیا اور اس سے پہلے وہ صوفیہ کو کبھی انتاد گلش نہیں لگا تھا۔
”مجھے پتا ہی نہ چلا اور میں پاکستان چلا جاتا تو پھر کیا ہوتا؟“

”تو پھر کیا ہوتا عمر؟“ اس نے عمر کے چہرے کو ہلک جھپکے دیکھتے ہوئے تھامت سے چور آواز میں کہا۔

”جو بھی ہوتا وہ اچھا ہرگز نہ ہوتا۔ ہماری فلائٹ کی انٹرنسٹ ہو گئی تھی۔ اگر میں انتظار گاہ میں نصب ہوں تو وین پر نشر ہونے والا نیوز لیڈر نہ دیکھ لیتا تو میں دنیا جاکر ہوتا۔ تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ تم مرنے تک میرا انتظار کرو گی۔“

”میں نے مرنے تک ہی تو انتظار کیا۔“
”میں ڈاکٹر کو بتا کر آتا ہوں۔“
عمر جانے لگا تو وہ بول پڑی۔ ”ٹھہر جاؤ اور میری تعریف کرو۔“
”اس کا کیا مطلب ہوا؟“

”مجھے یقین نہیں ہے کہ تم میری تعریف کر سکتے ہو۔“
”میں کر سکتا ہوں لیکن اس وقت میں غصے میں ہوں۔“

”تو میں کیا کروں؟ میں بیمار ہوں۔ ایک غصے میں آئے ہوئے شخص کو کسی بیمار پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔“

عمر حسب عادت جھجک رہا تھا اور اس کی نظریں ہاتھ سے لے کر فرش تک صوفیہ کے سوا کمرے کی ہر شے پر باری باری ٹک رہی تھیں۔

”میں تمہیں دیکھتا ہوں تو میرا دل تشکر سے بھر جاتا ہے کہ اللہ نے مجھے آنکھیں دی ہیں۔“

”تم تو مجھے دیکھتے ہی نہیں۔ تم اب بھی مجھے نہیں دیکھ رہے۔ تم ڈرپ اسٹینڈ کو دیکھ رہے ہو، دروازے کو دیکھ رہے ہو، اسٹول کو دیکھ رہے ہو۔“
صوفیہ نے اسے جھٹلایا۔

”تم بولتی ہو تو میرا جی چاہتا ہے کہ کسی اور کو نہ سنوں۔ میں اپنی آواز تک برداشت نہیں کر سکتا۔“
”کیونکہ تمہیں بولنا پناہ ہے۔ تم دنیا کے سب سے کم گوانسان ہو۔“

”مجھے تو کوئی نہیں ورنہ میں اور تعریف نہیں کروں گا۔“
”بھجھلا رہا تھا۔“

”اچھا مزید کہو۔“

”تم ہنسی ہو تو ساری کائنات خوشی سے لبریز ہو جاتی

ہے۔ میرے اندر رہا ہر اجالا ہو جاتا ہے۔“

”تم مجھے ہنسنے ہی کب دیتے ہو۔“

”میں نے تمہیں روتے ہوئے دیکھا تو مجھے خبر ہوئی کہ دکھ کس جنس کا نام ہے، درد کتنے کے ہیں۔ تم نے بتایا نہیں کہ کافی کے کپ میں میرے آسٹو گرے ہوتے تو تم کیا کرتیں۔“

”میں نہیں بتاؤں گی ورنہ تم غرور کرنے لگو گے اور تمہاری برائیوں میں ایک اور اضافہ ہو جائے گا۔“

”میں پوچھ کر رہوں گا۔“ اس نے اصرار کیا۔

”میں کسی کی پائی میٹھن سے اس کا تجزیہ کرواتی کہ آنسوؤں کی آمیزش سے کلائی کی ماہیت میں کوئی تبدیلی آتی ہے یا نہیں؟“

اس کے زرد چہرے پر چاندی جیسی ہنسی کی دھوپ تھی۔

وہ گھومتے ہوئے چاک اور قالب بدلتی مٹی کو مشتاق نگاہوں سے نکتی تھی۔ مٹی کا بے ڈھب تودا کس صورت میں ڈھلے گا؟ کوئی ٹانڈ، گنورا، کلسی یا مٹیا، وہ حیرت سے مٹی کے مقدر کو بدلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

حکیم بیگم نے سفید بالوں والا سر اٹھا کر عمر کو مخاطب کیا۔ ”کل سن لے کا! اے کڑی میری بولی نہیں جاندی۔ (یہ لڑکی میری زبان نہیں سمجھتی۔)
اس نے مٹھی سے اٹھڑی ہوئی انگلی سے چاک میں کھوئی ہوئی صوفیہ کی سمت اشارہ کیا۔

”تو اس نول دس دے۔ میں لکھ ان دلی سہی بے عقلی سہی پر میری نیت وچ کھوٹ نہیں۔ میرے من وچ میل نہیں۔“
(تو اسے بتا دے۔ میں لاکھ بے ہنر سہی بے عقل سہی پر میری نیت میں کھوٹ نہیں۔ میرے من میں میل نہیں۔)

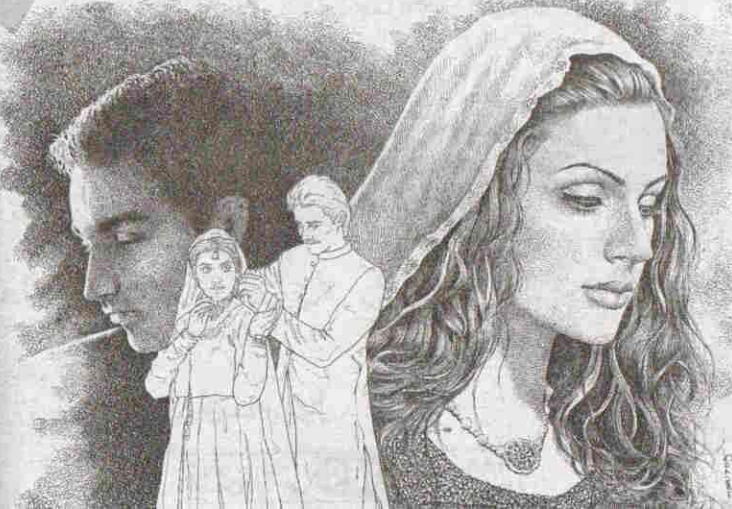


چچیں سنگریٹو

H شہیار خان ایک نہایت معزز اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ذہانت میں بھی بے مثال اور نہایت سحر انگیز شخصیت کے مالک ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خاصے مغرور ہو گئے ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے شہیار خان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن (امریکا) میں مقیم ہیں۔ ان کی بیوی بھی نہایت خوب صورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ گھر اور بچوں کی نگہداشت کی خاطر ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ ایک گھریلو خاتون ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا سکندر اپنے باپ کا عکس ہے۔ گو چھوٹا بیٹا زین بھی ذہین اور خوب صورت ہے مگر سکندر باپ کا عکس ہونے کی وجہ سے شہیار خان کی تمام توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ باپ کے اس امتیازی سلوک کی وجہ سے زین بچپن سے ہی بے حد حساس اور کم گو ہو گیا ہے۔ وہ اپنے بھائی سے نفرت کرنے لگا ہے۔

لیڈا لندن میں رہتی ہے مگر اس کا وطن روم ہے۔ اسے اپنے وطن سے بے حد محبت اور انسیت ہے چنانچہ وہ ہر سال اپنی چشتیاں روم میں گزارتی ہے۔ روم میں اس کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی ہے جو اپنا تعارف ”سکندر“ کے نام سے کرواتا ہے۔ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں روم آیا ہوا ہے۔ مغرور اور ہینڈ سم سا سکندر لیڈا کو بے حد اچھا لگا۔ وہ اس سے دوستی کی خواہاں ہے۔

مبھل تاؤلی



لیزا ایک مصورہ ہے۔ سکندر کی مکمل مشابہت شخصیت اور اس کے تنیکے مغرور نقوش لیزا کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ وہ اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے لیکن سکندر صاف انکار کر دیتا ہے۔

ایک دو اتفاقاً ملاقاتوں کے بعد لیزا سکندر سے مزید متاثر ہو جاتی ہے لیکن سکندر کا وہی اکہ مغرور انداز ہے۔ لیزا کا روم میں اپنا اپنا ٹمنٹ ہے جو اس کے باپ نے اسے خرید کر دیا ہے۔ جہاں وہ بیٹی کے ساتھ رہتی ہے۔ سکندر کو نیپلز میں ایک مینٹگ اینڈ کرینی ہے لیکن طبیعت کی خرابی کی بنا پر اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھلتی ترین مس ہونے کی بنا پر اسے مجبوراً "لیزا کی مدد لینا پڑتی ہے۔ لیزا اس کو نیپلز لے کر جاتی ہے۔ اور واپس بھی لاتی ہے۔ لیزا کے والد محمود خالد نے ایک مغربی عورت سے شادی کی تھی لیکن وہ اس کو ایک مشرقی ماں اور بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے جو ظاہر ہے ممکن نہیں تھا۔ اور تھے دو بیٹیاں لیزا اور سیم کی پیدائش بھی اس کو نہ بدل سکی۔ وٹوریا (لیزا کی ماں) کو لیزا اور سیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سیم ذہانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین اور بے حد چہن جبکہ لیزا اپنی ماں پر لگی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اور درمیانہ درجہ کی تھی۔ والدین کی علیحدگی کے بعد معاہدہ کے مطابق سیم کو وٹوریا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔ وٹوریا جو ظاہر کی طور پر مسلمان ہوئی تھی۔ علیحدگی کے بعد وہ اپنے اصل مذہب پر آگئی اور ایک ارب پتی بزنس من سے شادی کر لی۔ اس کے ساتھ میلان چلی گئی۔

لیزا اپنی بہن سیم سے بہت قریب تھی اسے اپنے روم سے بھی بہت پیار تھا ان دونوں کی جدائی اسے بہت شاق گزری۔ محمود خالد سیم کے اخراجات کے لیے رقم بچھواتے تھے اس کے باوجود وٹوریا کا شوہر اسے بوجھ سمجھتا تھا۔ ایک دن وہ نشہ کی حالت میں سیم کے کمرے میں آگیا۔ مگر اس کے شور مچانے پر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ جان کر لیزا کو اپنے والدین سے نفرت محسوس ہوئی وہ اپنے والدین سے مزید دور ہو گئی۔ محمود خالد نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن لیزا اپنی سوٹی ماں کے بھی قریب نہ ہو سکی وہ اپنے والد کی کوئی بات یا مشورہ قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ اسے پاکستان لے جانا چاہتے تھے۔ لیزا نے صاف انکار کر دیا۔ باپس ہو کر وہ اپنی بیوی عاتشہ کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔

محمود خالد نے سیم کی شادی اپنے ایک کاروباری واقعہ ہاشم اسد سے کرادی تھی جو اس سے عمر میں پورے پندرہ سال بڑا تھا۔ انہوں نے اپنا کاروبار بچانے کے لیے یہ شادی کی تھی۔ لیزا نے عیسائی ماں ہونے کے باوجود خود مطالعہ کر کے اسلام کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اپنے۔ باپ اور بہنوئی کی وجہ سے وہ پاکستانی مردوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔

سکندر کے بھائی زین شہراری کی زندگی میں ایک لڑکی ام مریم آجاتی ہے۔ ام مریم غیر معمولی ذہانت کی مالک ہے۔ وہ نصابی اور غیر نصابی دونوں طرح کی سرگرمیوں میں شان دار ریکارڈ رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد حسین بھی ہے۔ ام مریم نے زین شہراری کو اہمیت دی تو اس نے ام مریم کو پروپوز کیا۔ ام مریم نے اس کا پروپوزل بہت خوش دلی سے قبول کر لیا۔ زین شہراری نے اپنی والدہ کو فون کر کے بتادیا۔ زین کو یقین تھا کہ ام مریم جیسی لڑکی کو اس کے والد انکار کر ہی نہیں سکتے۔

۳ تیسری قسط

ہفتے کی پوری رات اور اتوار کا پورا دن ان اعلیٰ درجہ میں گزار کر کیمبر کے روزہ آفس میں موجود تھا۔ ابھی بھی اسے شدید درد تھا۔ اس کے آدھے سر میں درد تھا۔ اس کی گردن کے پچھلے حصے سے درد کی شدید لہر وقتاً فوقتاً اٹھ رہی تھی اور وہ اس کے بازوؤں تک پھیل رہی تھی۔ ہفتے کی دوپہر لیزا کے ساتھ جو اس نے کھانا

کھایا تھا اس کے بعد سے آج پھر کے دن تک اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا فقط جو چیز اس کے حلق سے نیچے اڑی تھی۔

وہ بے حساب چائے اور کافی کے کہیں تھے یا پھر درد سے نجات کے لیے ڈاکٹری تجویز کردہ ادویہ۔ اس پر خود سے بھی اور زندگی سے بھی بیزار ہو پوری طرح حاوی تھی۔ اپنی زندگی ختم کرنے کا بھی چاہ رہا تھا مگر فتر میں اس نے کسی کو بھی نہ اپنی طبیعت کے متعلق کچھ بتا لکھنا چاہتا تھا۔ اپنا چہرہ اپنا اور بد مزاجی کسی پر ظاہر کی تھی۔ کام کی بات کے علاوہ وہ یہاں کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا جو کوئی کام کی بات سے آگے جا کر کچھ اور بات کہتا اور وہ جواباً کسی بد مزاجی کا مظاہرہ کرتا۔ ایک دور ٹوٹا تھا یہاں جس سے دوسروں کی نسبت اس کی زیادہ بات چیت ہو جایا کرتی تھی مگر اسے بھی دوستی یا بے تکلفی کے زمرے میں ہرگز شامل نہیں کیا جاسکتا تھا چنانچہ اگر دور ٹوٹا وہاں آج بھی چکا ہوتا ہے وہ کم بولتا اور اپنے کام سے کام رکھتا اور اس پر اپنے مزاج کی کوئی تبدیلی آشکار نہ ہونے دیتا۔

یہاں تو وہ چند ہفتوں کے لیے آیا تھا۔ وہاں جہاں وہ اب مستقل رہا کرتا تھا وہاں اس نے کسی کو خود سے ایک حد سے زیادہ نزدیک نہیں آنے دیا تھا۔ اس کے کوئی بہت تھے اس کے واقف بہت تھے اس کے ملنے والے بہت تھے مگر اس کا دوست کوئی نہ تھا۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ دوستی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ایک کلیئر کھینچ کر رکھتا تھا وہ اپنے اور اپنے سے واقف ہر شخص کے بیچ۔ اس حد فاضل سے آگے آنے کی اس نے کبھی کسی کو جرأت نہیں دی تھی، سوائے اس لڑکی لیزا محمود کے جو زندگی اس کے نزدیک آنے کی کوشش کر رہی تھی زبردستی اس سے بے تکلف ہونے اور دوستی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اتوار کا پورا دن اس نے اپنا موبائل آف رکھا تھا۔ لیزا محمود سے کسی بھی طرح کا کوئی تعلق کوئی واسطہ

نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ چند لمحوں کی ہنسی کی اتنی کڑی سزا اور کی اٹھتی شدید لہر کو برداشت کرتے ہوئے اس نے سوچا وہ اب لیزا سے کبھی نہیں ملے گا۔ نہ وہ اس سے ملے گا نہ ہی پھر وہ کبھی ہنسے گا نہ خوش ہو گا نہ فتنے لگائے گا اور نہ ہی پھر اسے خود کو یوں سزا دینے کی ضرورت پڑے گی، مگر اسے پتا نہیں تھا وہ آج پھر اس کے آفس آدھنٹے والی ہے۔ وہ ڈاکٹر فنانس کے آفس سے سنجیدہ پیشہ ورانہ نوعیت کا ڈکشن کر کے باہر نکلا تو اسے لیزا سامنے ہی کھڑی نظر آئی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے وہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔



"سکندر!" اسے سکندر کی آفس سے نکل کر کوریڈور میں آگے بڑھتا نظر آیا تو اس نے حسب عادت بے تکلفانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ یقیناً سکندر نے اسے دیکھا نہیں تھا ورنہ وہ ہائے پہلو کرنے ضرور رکھتا۔ یہاں کمپنی کے اس آفس کے لیے اس نے جو ہینٹنگز بنا کر دی تھیں، انہیں کے حوالے سے آج اس کی کمپنی کے چند سینئر ایگزیکٹو کے ساتھ دوبارہ مینٹگ تھی۔

اس کی یہاں گزشتہ مینٹگ خاصی کامیاب رہی تھی۔ کمپنی اسے اس کا منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھی۔ آج ہینٹنگز کا موضوع ملے کرنا تھا، کچھ میٹھیز پر ان سب نے گزشتہ مینٹگ میں بات چیت کی تھی، کچھ پروپوزلز وہ آن لائن تھی۔ آج موضوع ملے کر لیے جانے کے بعد اس نے اس پروپوزل پر کام شروع کر دیا تھا۔ وہ آج یہاں لانے کے لیے کل سارا دن مختلف آئیڈیاز پر کام کرتی رہی تھی، خاص مصروف رہی تھی مگر مصروفیت میں بھی اس نے دن میں دوبارہ

سکندر کو کالی کی تھی اور دونوں مرتبہ اس کا نمبر بند ملا تھا۔

ہفتے کے روزہ اس کے ساتھ جو شگوار موڈ میں رہا تھا۔ انہوں نے بہت باتیں کی تھیں۔ سکندر نے اسے

اپنی تازہ تازہ بنی دوست قرار دیا تھا اور اس کی نئی نئی بنی دوست ٹرک ڈرائیوروں والی اردو زبان بولتی ہے اس پر اظہار افسوس بھی کیا تھا۔ آخر میں آکر اس کاموڈ ٹھوڑا اپ سیٹ ہو گیا تھا وہ کچھ ڈسٹرب سا نظر آنے لگا تھا ورنہ بانی تو وہ سارا وقت بڑے اچھے اور دوستانہ موڈ میں اس کے ساتھ رہا تھا۔ ایسے میں وہ یہ تو ہرگز نہیں سوچ سکتی تھی کہ سکندر نے اپنا موبائل اس کی وجہ سے آف کر رکھا تھا۔ اس نے سوچا تھا تو بس یہی کہ شاید وہ آرام کرنا چاہتا ہو گا یا پھر شاید اسے اس کے کاموں کی کوئی مصروفیت لاحق تھی اور وہ ڈسٹرب نہیں ہونا چاہتا ہو گا۔ اس لیے سیل آف کر دیا ہو گا مگر اس کے یہ تمام اندازے اور تمام خیالات اس وقت سکندر کے سرد اور سپاٹ سے چہرے کو دیکھ کر غلط ثابت ہو گئے تھے۔

وہ اس کے آواز دینے پر رکا تھا۔ لگا ہوں میں اجنبیت نہیں تھی مگر ایک سرد سا تاثر موجود تھا۔ جیسے وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”چاؤ۔“ بغیر مسکرائے، سنجیدہ اور سپاٹ سے انداز میں اسے کہتا وہاں بالکل بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ جواباً کیا کہنے کے لیے لب کھول رہی ہے یہ سننے کی زحمت کیے بغیر وہاں سے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے کوریڈور میں کھڑے کھڑے ہی نظر آ رہا تھا وہ کوریڈور کے آخر تک جا کر دائیں طرف مڑ گیا تھا۔ اب وہ اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسے اپنے آپ میں بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے، کیسے آئی ہے، رکی سی خیر و عافیت کچھ بھی پوچھے بغیر وہ اس طرح اسے نظر انداز کرتا ہوا چلا گیا تھا، جیسے اس سے ہائے ہیلو بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے کوفت سی بھی ہو رہی تھی اور سکندر کی سرد مہر اور خاموش بد تمیزی پر غصہ بھی آ رہا

تھا۔

آپ زبان سے بد تمیزی کا مظاہرہ نہ کریں، بس اپنا رویہ بد تمیز بنالیں وہ ایسا ہی کیا کرتا تھا ناں؟ ایسا ہی ابھی بھی کر کے کیا تھا ناں؟ سکندر پر جتن بھلا ہٹ اور کوفت محسوس کرتی وہ میننگ کے لیے چلی گئی تھی۔

دو گھنٹے کی طویل میننگ جس میں ہر چیز حتمی طور پر طے کر لی گئی تھی کے اختتام پر وہ کمپنی دو آئینے کیلئے کے ساتھ ہی کالفرنس روم سے باہر نکلی تھی۔ ان دونوں سے خوشگوار انداز میں رسمی نوعیت کے الوداعی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہوئی تھی شام کے پانچ بج رہے تھے اور یہ آفس ٹائم ختم ہو جانے کا وقت تھا۔ اسے آتے جاتے مختلف لوگ جلدی جلدی کام سمیٹ کر گھر جانے کی فکر کرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ لفٹ کے پاس آکر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے لفٹ کا مین دیکھا تھا۔

لفٹ آگئی اور وہ لفٹ میں داخل ہونے لگی تب اس کے پیچھے کوئی اور بھی لفٹ میں داخل ہوا تھا۔ سیدھے ہو کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے دیکھا وہ سکندر تھا۔ اس کا بلیک لیدر بریف کیس اس کے دائیں ہاتھ میں تھا اور لیپ ٹاپ بلیک بایں کندھے پر لٹکا تھا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ اس بار سکندر نے بھی اسے ابھی ہی دیکھا تھا۔ لفٹ میں داخل ہو جانے کے بعد کم از کم اتنا وہ بتا سکتی تھی کہ اس نے اسے ابھی ابھی دیکھا ہے۔ سکندر کا دھنسنے میں کاروبار سے یاد تھا اس لیے وہ مسکرائی تو نہیں بس اخلاقاً ”سنجیدگی سے پوچھ لیا۔“

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

وہ بظاہر بالکل صحت مند اور نارمل لگ رہا تھا مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں اس بار لفٹ میں اس کے پاس کھڑے ہو کر جب اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں بہت سا درد، تکلیف اور رویہ رسی نظر آئی۔

”ٹھیک ہے۔“ سکندر کا جواب مختصر اور سنجیدہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی خاموشی اور درد نے اس کے غصے کو لب بھر میں لیں دور لے جایا تھا۔ نجانے کیا وہ لاحق تھا اسے جو وہ یوں اتنا عجیب، اتنا مختلف سا مزاج رکھتا تھا۔ وہ سکندر پر اپنا غصہ قائم نہیں رکھ پائی تھی۔ وہ آرٹ تھی اس لیے حساس زیادہ تھی شاید اسی لیے وہ اس شخص کے لفظ اور رویے نہیں اس کی آنکھیں پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کے لفظوں اور رویوں میں سرد مہر، بے گامگی، اجنبیت اور بے مروتی ہوتی تھی مگر اس کی آنکھوں میں؟ دردی درد غم ہی غم اتنی اداسی اور اتنی ویرانی اس نے کبھی کسی کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی۔

لفٹ گر اوپنڈ فلور پر آئی تھی۔ وہ سکندر کو دیکھ رہی تھی اور وہ لفٹ کے فرش کو اس سے لا تعلق بے نیاز، بے پرواہ، وہ دونوں لفٹ سے باہر آگئے تھے۔

”تمہیں تمہیں ڈراپ کروں سکندر؟“

”ہاں؟“ اس نے ایک دم چونک کر یوں اسے دیکھا جیسے یہاں پر موجود ہی نہیں تھا۔ وہ بہت الجھا اور بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

”میں تمہیں تمہارے ہوٹل ڈراپ کروں۔ یہ پوچھ رہی تھی میں؟“ اس نے ہلکی دوستانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا سوال دہرایا۔ سکندر نے اسے بغور دیکھا تھا، یوں جیسے وہ کچھ سوچنے لگا ہے۔ ایک دم ہی وہ اس سے بولا۔

”تمہیں اس وقت کوئی اور کام تو نہیں ہے لیزا؟“

”نہیں، کیوں؟“ وہ اتنا غیر متعلقہ سا سوال سن کر حیران ہوئی تھی۔

”تم مجھے کسی ایسی جگہ ڈراپ کر دو جہاں سبزہ ہو، تازہ ہوا ہو۔ میں کچھ دیر کھلی آب و ہوا اور ہریالی کے بیچ رہنا چاہتا ہوں۔“

اس نے بولتے ہوئے کھینچ کر یوں سانس لیا جیسے اس کی سانس گھٹ رہی ہو اسے سانس لینے میں وقت کا سامنا ہو۔

”ٹھیک ہے، چلو۔“ وہ جواباً مسکرا کر بولی۔ اب وہ یہ بات یقین سے کہہ سکتی تھی کہ سکندر کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں تھی۔ شاید اسے پھر Cervical pain ہو رہا تھا۔ نہیلا جانے ہوئے بھی اس نے سکندر کی یہی کیفیت دیکھی تھی۔ وہ دونوں باہر آگئے تھے۔ سکندر اس کے برابر والی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔ ایک دو سینکڑ خاموشی سے ڈراپ کر کے بعد اس نے سکندر کو دیکھا۔ ”تمہیں cervical pain ہو رہا ہے؟“ سکندر نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ ایک پل اسے بغور دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سر ہلایا۔

”تم کسی اچھے ڈاکٹر سے کنسلٹ کرو ناں۔ اتنی بیک اسج میں اس طرح کی تکلیف اور وہ بھی اتنی جلدی جلدی تو نہیں ہونی چاہیے۔“ وہ دوستانہ انداز اور پر خلوص لہجے میں بولی تھی۔

”تم مجھے کہاں ڈراپ کرو گی؟“ اپنی صحت سے متعلق اس کے جملے پر شخص ہلکا سا سہلرا کر سکندر نے فوراً ہی موضوع تبدیل کر دیا اور کویا بہت ساری باتوں کے ساتھ وہ اپنی صحت کے متعلق بھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ”ہم Villa borghese جا رہے ہیں بورگ، بیس گارڈز کا تم نے نام تو ضرور سن رکھا ہو گا؟“

”ہم؟“ اس نے سکندر کو حیرانی سے اپنی سمت دیکھتا پایا۔

”جی، ہم۔ تمہیں وہاں چھوڑ کر آجاؤں، تم اکیلے اکیلے وہاں انجوائے کرو اور میں اپنے اپارٹمنٹ جا کر بند ہو جاؤں۔ یہ تو کوئی انصاف نہیں۔ تم سے سن کر میرا بھی دل چاہ رہا ہے کھلی کھلی سرسبزی جگہ پر وقت گزارنے کا۔“

وہ عادتاً مسکرا کر بولی تھی۔ اس بار اس نے سکندر کے لبوں پر بدھم سی مسکراہٹ آئی دیکھی۔

”بیچے جناب پانچ گئے ہم del Popolo del Piazza۔ یہیں سے مین انٹرنس ہے ولا بورگیز کے اندر جانے کے لیے۔“

چند منٹوں کے بعد گاڑی ایک دوسری سڑک پر موڑتے ہوئے لیزا نے سکندر سے کہا۔

”Villa borghese gardens میں داخلے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں تھا۔ مگر اندر جانے کے بعد میں وہاں موجود میوزیمز یا آرٹ گیلریز وٹ کرنی ہوں تو اس کے لیے ٹکٹ خریدنا لازمی تھا۔“ آرٹ گیلریز اور میوزیمز میں جانے کے خواہش مند افراد وہاں طویل قطاریں لگائے نظر آ رہے تھے۔ چونکہ سورج غروب ہونے میں ابھی خاصا وقت باقی تھا چنانچہ گاؤنز میں سبزے اور ہریالی کو انجوائے کرنے کے لیے آنے والوں کی تعداد بھی کثیر تھی۔

”مجھے پتا ہوتا آج میں تمہارے ساتھ آنے والی ہوں تو آرٹ گیلریز میں جانے کے لیے آن لائن ٹکٹ خرید لیتی۔ اب اس وقت اتنی لمبی قطار میں لگنے کا تو کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔“ قدیم رومن آرکھیکچر والے داخلی راستے سے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ سکندر سے بولی تھی۔

”تمہیں آرٹ میں دلچسپی نہیں ورنہ تم یہاں موجود خوب صورت اور بے مثال آرٹ کلیکشن کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتے۔“

یہاں Raffaello Raphael Bernini ان سب کا برطانور کام موجود ہے۔ آرٹ کے شائقین کے لیے تو ناممکن ہے کہ وہ روم آئیں اور یہاں وٹ کیے بغیر چلے جائیں۔ ”وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بول رہی تھی۔“

”تم تو ابھی بہت سارے دنوں تک روم میں موجود ہو۔ پھر کسی دن ٹکٹ خرید کر یہاں آجانا اور یہاں موجود تمام آرٹ گیلریز اور میوزیمز کی سیر کر لینا۔“

سکندر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔ لیزا نے بغور اسے دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر تازہ دلی کیفیت نہیں تھی۔ سرد و سپاٹ تاثر کی جگہ چہرے پر دوستانہ سی مدہم مسکراہٹ نے لے لی تھی جیسے اسے یاد آگیا ہو کہ وہ دنوں کئی دفعہ لچکے ہیں بہت باتیں کر چکے ہیں اور بہت سارا وقت ساتھ گزار چکے ہیں۔ شاید

یہاں کے سبزے اور ہریالی نے اس کے مزاج پر خوشگوار اثر ڈالا تھا پھر اسے یہ بھول بیاتی یاد آگئی تھی کہ وہ لیزا سے دوستی کر چکا ہے۔ سوجہ جو بھی تھی بہر حال اب وہ قدرے پرسکون اور مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی خوشت اور سناٹا بھی کچھ کم نظر آ رہا تھا۔

”ہم لیک گاؤن میں چل کر بیٹھیں؟“ ارد گرد ہر طرف سبز ہی سبز تھا۔ وہ دونوں اس وقت چڑ اور صوبہ کے درختوں کے درمیان ایک خوب صورت راستے سے گزر رہے تھے۔

”یہ ایک نہیں دراصل کافی سارے گاؤنز کا مجموعہ ہے۔ ہر گاؤن کی اپنی اپنی الگ خوبی ہے۔ کہیں تمہیں پھلوں کے درخت زیادہ ملیں گے، کہیں مشہور فنکاروں کے بنائے قدیم مجسمے اور فاونٹین اور کہیں کسی جنگل کا ساندتی تاثر دینے والا گاؤن۔ مجھے ذاتی طور پر لیک گاؤن زیادہ پسند ہے۔ وہاں جمیل میں نشی چلائی جائے یا جمیل کنارے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھا جائے، مجھے تو دونوں میں بہت مزا آتا ہے۔“ سکندر کے چہرے کی سوالیہ سی حیرانی دیکھ کر اس نے وضاحت کی تھی۔

”جو جگہ تمہیں ٹھیک لگے، وہی مناسب ہے۔ تمہیں تو پتا ہے میں یہاں کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا۔ کبھی بہت پہلے روم کے متعلق کسی سفر نامے میں ضرور یہاں کے بارے میں پڑھا تھا مگر وہ بھی اب کچھ خاص یاد نہیں۔“

وہ اب مسکراتے ہوئے بالکل اسی طرح بات کر رہا تھا جیسے کلونیم میں اس کے ساتھ کی تھیں۔

”یہاں کے بارے میں میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔“ خوب صورت درختوں اور سبزے سے بھرے راستے سے گزرتے وہ دونوں لیک گاؤن تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ ارد گرد نگاہیں دوڑاتا اس جگہ کو تعریفی نظروں سے دیکھتا نظر آیا۔

”ہے ناں یہ جگہ خوب صورت؟“ اس نے فخریہ انداز میں یوں پوچھا گویا اس گاؤن کی تخلیق کرنے والی

یوہانس یا سترہویں صدی کی آرکٹیکٹ وہ خود ہی تھی۔ سکندر نے اس کی طرف فوراً دیکھا تھا اور ہر سانسے مسکراتا تھا۔

”تم جس طرح اپنے روم اور روبا کی ہر چیز سے پیار کرتی ہو، مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے لیزا۔“ دھوپ چھاؤں کا سا مزاج رکھتا وہ شخص اب یوں مسکرا رہا تھا یوں دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا گویا آج اس کے آفس میں لیزا سے سرومہری سے پیش آنے والا شخص کوئی اور تھا۔

”یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔“ جمیل سے نزدیک گھاس پر درختوں کی چھاؤں میں ایک جگہ سکندر کو بیٹھنے کے لیے اچھی لگی تھی۔ وہ سر ہلاتی اس کے ساتھ وہاں بیٹھ گئی تھی۔ سکندر کی نظریں پانی کی طرف تھیں جبکہ وہ ان لمبی کئی سو سال قدیم درختوں میں سے ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے سکندر کی نگاہوں کے تعاقب میں جمیل کی طرف دیکھا تھا۔ بہت سے سیاح جہاں میں چھوڑنے والی نشی چلاتے نظر آ رہے تھے۔ جمیل ہر طرف سے سبزے میں گھری تھی۔ اس کے ہر کنارے پر درختوں کے جھنڈ تھے، پھیلیں تھیں، پھلوں اور پھولوں سے لدی درختوں کے شاخیں تھیں۔

”پانی پر سبزے اور پھولوں کا جو یہ شید پڑا ہے کتنا خوب صورت لگ رہا ہے ناں سکندر؟“ اوہر دیکھو تو پانی سبز نظر آ رہا ہے، وہاں دیکھو تو سرخ، اوہر گلابی اور وہاں نیلا، ایک ہی جمیل بیک وقت کتنے سارے رنگوں سے سجی ہے۔“

وہ مسکرا کر سکندر سے کہہ رہی تھی۔ سکندر نے جواباً اس کی طرف دیکھا ضرور مگر لاپرواہی سے اس کی خاموشی بڑی عجیب سی لگی۔

”تمہیں رنگ اچھے نہیں لگتے سکندر؟“ ”پتا نہیں، مجھے رنگوں کو محسوس کرنا نہیں آتا۔“ وہ بے خیالی میں بول گیا مگر جیسے ہی اسے بے خیالی میں منہ سے نکلی بات کا وہ بیان آیا فوراً بات بدل کر اس سے پوچھنے لگا۔

”تم تو یہاں پہلے بھی بہت دفعہ آئی ہو گی؟“ ”ہاں۔“ سکندر کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ ان کے بالکل سامنے درختوں کے پاس سیاحوں کا ایک گروپ آکر کھڑا ہوا تھا۔ اس میں دو افراد اٹالین لگ رہے تھے جبکہ باقی تمام افراد امریکن تھے۔ شاید وہ امریکن ان اٹالینز کے مہمان تھے یہاں۔ وہ سب جیسے کسی موضوع پر زور و شور سے گفتگو اور بحث مباحثہ کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ گروپ میں شامل ایک امریکن جوڑے نے وہاں تصویر کھینچ لی تھی۔ وہ لوگ اس لیے وہاں رکے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی یہ چاہتے تھے کہ تصویر میں ان کے عقب میں جمیل اس طرح آئی چاہیے کہ جمیل کے پیچوں پہنچنا ٹیپل بھی نظر آئے۔ سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا کر تھا۔ جتنی دیر وہ میاں بیوی وہاں تصویر کھینچ رہے تھے باقی افراد وہیں کھڑے باہم گفتگو کر رہے تھے۔

امریکن مہمانوں کی خاطر ان کے اٹالین میزبان بھی انگریزی ہی میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان لوگوں کی گفتگو کے چند جملوں ہی سے سمجھ میں آگیا تھا کہ کیا موضوع ڈسکس کیا جا رہا ہے۔ کل رات یہاں والا بور گیز کے باہر والی سڑک پر ایک سترہ سالہ لڑکی کا رپ ہوا تھا۔ غالباً ”آؤمی رات سے بھی اوپر کا نام تھا۔ آج سارا دن یہ خبر تمام نیوز چینلز پر چلتی رہی تھی۔“

”نیوز چینلز کے پاس جب اور کچھ خبر نہیں چھتی تو وہ اس طرح کی خبریں چلا چلا کر لوگوں کی پانی ہانی کرواتے ہیں۔“ سیاحوں کا وہ گروپ تصویر کھینچنے کے بعد وہاں سے ہنوز اسی موضوع پر باتیں کر رہا ہوا جا رہا تھا تب وہ سکندر سے بولی تھی۔ سکندر بھی ان لوگوں کی گفتگو سنتا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے مجھے بھی ہمدردی ہے اس لڑکی سے“ اس کے ساتھ جو ہوا بہت برا ہوا ہے، مگر میں یہ پوچھتی ہوں رات کے دو ڈھائی بجے وہ اکیلی سڑکوں پر کیا کرنے نکلی ہوئی تھی؟ ایک تنہا خوب صورت لڑکی آؤمی رات کو سڑک پر کسی بد فطرت و بد کردار کو ٹکرائے تو کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ ماں باپ سے لڑائی

ہوئی تھی یا بوائے فریڈ سے جھگڑا تب بھی اس طرح
آدھی رات کو سڑکوں پر پھرنے کی تمک کیا تھی؟
اپنی دھن میں مگن ہوتے ہوئے اسے سکندر کے
تأثرات کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کے چہرے
کے بدلتے رنگوں پر اس کا دھیان گیا تو وہ حیران پریشان
سی رہ گئی۔ سکندر کے چہرے پر عجیب سا جھون اور
وحشت پھیلی تھی۔ وہ انتہائی سخت نگاہوں سے اسے
دیکھتا ہوا فوراً ہی وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”سکندر؟ کیا ہوا؟“ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پاری تھی
وہ بالکل ہکا بکا سی اس کے ساتھ ہی فوراً کھڑی ہوئی۔
”کیا ہوا سکندر؟“ اس نے بے حد حیرانی سے پوچھا۔

”کسی کے بارے میں کچھ بھی بول دینا جو مرضی
تبصرہ کرو دنیا بہت آسان ہوتا ہے لیزا محمود! کیا جانتی ہو
تم اس لڑکی کے بارے میں؟ بتاؤ مجھے؟“

وہ شدید غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اور انتہائی غیظ و
غضب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیزا نے اس کی سرد مہری
اجنبیت بے گانگی سب کچھ دیکھ رکھا تھا مگر یہ انداز
اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

”نیوز چینلز کے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی
اندازے لگا لیتا اس لڑکی پر تبصرے کر لیتا، تنقید کر لیتا،
مذاق اڑا لیتا بہت آسان ہے۔ کیا تم نے سوچا اس کے
ساتھ ایسا کیا ہوا ہو گا جو وہ آدھی رات کو سڑکوں پر تھی؟
کیا گزری تھی اس پر جو وہ اپنے گھر سے نکل پڑی؟
لیزا محمود! زندگی برباد ہو گئی ہے اس لڑکی کی۔ کل
رات جو کچھ اس کے ساتھ ہوا وہ اب زندگی بھر اس
خوف بے بسی اور ذلت سے باہر نہیں نکل سکے گی۔“

سکندر کے لفظوں میں سختی تھی بے پناہ غصہ اور
نفرت تھی۔ وہ فوراً ہی وہاں سے جانے کے لیے لیٹ
گیا۔ ایک بل تو وہ بالکل حیران پریشان، سکت اپنی جگہ
پر کھڑی رہی، مگر جیسے ہی اسے اس بات کا احساس ہوا
کہ وہ وہاں سے جا رہا ہے وہ فوراً اس کے پیچھے بھاگی۔
”سکندر! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم اس طرح ناراض
کیوں ہو گئے ہو؟ پلیز روکو تو سہی۔“

اس نے اسے پیچھے سے ہی چلا کر آواز دی تھی
کیونکہ وہ جس چیز رفتاری سے جا رہا تھا وہ اس کا ساتھ
دینے میں ناکام تھی۔ سکندر نے نہ مڑ کر اسے دیکھا نہ
کوئی جواب دیا، نہ ہی رک۔ اس نے اپنے قدموں کی
رفتار کچھ اور بھی تیز کر لی تھی۔

اس نے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ ارد گرد
سے گزرتے لوگ اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔
”سکندر پلیز رک جاؤ۔“ تھک کر یاپس سی ہوتی وہ
اپنی جگہ رک گئی تھی۔ بے ہنگم انداز میں بھاگنے کی
وجہ سے اس کی سانس پھول گئی تھی۔

وہ وہیں کھڑے ہو کر سانس بحال کرتے ہوئے
سکندر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اب اسے دلا بورا کینز سے باہر
جانا نظر آ رہا تھا۔

وہ چپکے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی اسی طرف
دیکھ رہی تھی۔ بونٹی بے مقصد گفتگو پرانے گفتگو کے
طور پر منہ سے نکلے اس کے وہ چند جملے سکندر کو اس
قدر ناگوار گزر جائیں گے کہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی
تھی۔ وہ بار بار ذہن میں اپنے کلموں کو دہرا رہی
تھی۔ اسے ان میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی
کہ اس پر یوں غصے سے قابو ہو جایا جائے۔

ایک واقعہ پر اس نے اپنی رائے دی تھی۔ وہ بھی
جواباً اس سے اختلاف کرتا اپنی رائے دے سکتا تھا۔
وہ حیران تھی کہ بے حد پریشان تھی۔ اسے سکندر پر
غصہ نہیں آ رہا تھا اسے تعجب ہو رہا تھا۔ حیرت ہو رہی
تھی حیرت میں گھری وہ سکندر کو مجھنے سے قاصر بھی
تھی اور بہت دکھی بھی تھی۔

آج اسے پھر درد ہو رہا تھا وہ کچھ وقت کسی کھلی
سر سبزی جگہ پر گزارنا چاہتا تھا اور اس کی اس
بے موقع بات نے سب کچھ ختم کر دیا۔ اس سے تو نہیں
بہتر ہوتا وہ سکندر کو دلا بورا کی تھوڑ کر خود باہر سے ہی
واپس چلی جاتی۔ وہ کچھ دیر وہاں کھلی ہوا میں سانس تو
لے لیتا وہ سبز، ہریالی، پھل کاپانی، آبی پرندے یہ
سب کچھ اس کی طبیعت کی اداسی اور پڑھو کی کو دور نہ
بھی کرتے، کم تو کر دیتے۔

اسے خود پر غصہ آنے لگا تھا وہ سکندر کے لیے فکر مند
ہو رہی تھی وہ اس کے لیے اداس بھی ہو گئی تھی۔
نجانے کیا عام کیا دکھ اسے لاحق تھا اس کے ساتھ نے
اس دکھ کو کم نہیں کیا تھا بلکہ بڑھا دیا تھا آج۔

بہت دل گرفتہ سی وہ اپنے پار ٹنٹ واپس آ گئی تھی
شکر تھا نئی گھر نہیں تھیں۔ وہ آج دوپہر سے اپنی
کسی سہیلی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ اس کا دل اتنا
اداس تھا کہ اس وقت اس کا کسی سے بھی بات کرنے کا
دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے نہ لباس تبدیل کیا تھا نہ
منہ ہاتھ دھو کر فریش ہونے کی کوشش کی۔ اندر آ کر
خاموشی سے لیونگ روم میں صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔
اب اسے یہ فکر شروع ہو گئی کہ وہ اپنے ہوٹل پہنچ گیا
ہو گا نا؟ وہ ٹھیک ہو گا نا؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہوئی؟
وہ کیا ابھی بھی غصے میں ہو گا؟ وہ کیا کر رہا ہو گا؟

روم میں ایک اور طویل شام کا اختتام ہوا تھا۔
سورج غروب ہو چکا تھا۔ بالکا کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو
گیا تھا۔ وہ اسی طرح صوفے پر اداس سی بیٹھی تھی۔
نئی بھی کچھ دیر قبل گھر واپس آ چکی تھیں۔ غالباً
مغرب کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ اسے سکندر کی شدید
فکر لاحق ہو رہی تھی۔

اس نے اپنا موبائل اٹھا کر سکندر کا نمبر لایا۔ وہ تلخی
سے بات کرنے لگا یا اس سے بات ہی نہیں کرے گا؟
اس کا فون ہی نہیں اٹھائے گا وہ جو کچھ بھی کرے گا مگر
وہ اب سکندر سے بات کیے بغیر نہ نہیں سکتی تھی۔
تیسری تیل پر اس کی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ ”ہیلو۔“
اس نے سکندر کی آواز سنی۔ اس کے لمحے اور آوازیں
غصہ نہیں تھا ناراضی بھی نہیں تھی مگر پھر بھی ایک غیر
معمولی بات تھی۔

”تم ٹھیک ہو سکندر؟ اپنے ہوٹل پہنچ گئے تم؟“
اس نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔
”ہاں“ میں ٹھیک ہوں۔ سوری میں اس طرح
تمہیں وہاں چھوڑ کر آیا۔“

اس کی معذرت بڑی پر تکلف تھی جیسے وہ خود کو پھر
اپنے اسی خول میں بند کر چکا تھا جو آج کچھ بل کے لیے

جنگ کیا تھا۔ اس نے نہ سکندر کی معذرت بردھان دیا
نہ اس کے پر تکلف انداز پر۔ اسے سکندر کے لمحے اور
انداز میں جو غیر معمولی پن محسوس ہوا تھا اور جسے وہ
فوری طور پر کوئی نام نہ نہ پائی تھی مگر اگلے ہی لمحے وہ
سمجھ گئی کہ سکندر تکلیف میں ہے اسے کہیں پر شدید
تکلیف یا درد ہو رہا ہے، وہ لمحے کو چاہے جتنا بھی نارمل
بنالیتا مگر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے وہ تکلیف سے
نکلنے والی اپنی کراہ کو دباتا، لب بھینچ بھینچ کر بات کر
رہا ہے۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے سکندر؟“ اس کی
معذرت کے جواب میں اس نے بے اختیار فکر مندی
سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس بار اس نے ایک دلی بی کراہ
کی آواز سنی تھی۔ اب تو وہ مان ہی نہیں سکتی تھی کہ
سکندر ٹھیک ہے۔

”تم کہاں ہو سکندر پلیز۔ مجھے بتاؤ؟ مجھے تمہاری
طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ پلیز بتاؤ تم کہاں پر ہو؟
تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

اس نے پریشان ہو کر قدرے بلند آواز میں پوچھا تھا
وہ اب مزید کوئی جھوٹ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اسے
وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

”لیزا میرا ایکسپینڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں ہسپتال میں
ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولا تھا۔
”اوہ مائی گاڈ۔“ وہ بے اختیار صوفے پر سے اٹھی
تھی۔

”کس ہسپتال میں ہو تم؟ مجھے نام بتاؤ۔“ اس نے
سینئر نیپل سے اپنا ہینڈ بیک اٹھایا۔
”تم زحمت مت کرو لیزا میں ٹھیک۔“

”تم مجھے ہسپتال کا نام بتاؤ۔“ اس نے غصے سے
سکندر کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ وہ تیزی سے جوتے
پہنتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑی تھی۔



تیز ڈرائیونگ کرتی وہ بہت جلدی ہسپتال پہنچ گئی

تھی۔ استقبالیہ سے معلومات لیتی وہ فوراً ہی مطلوبہ کمرے تک پہنچی تھی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اسے سکندر بیڈ پر لیٹا نظر آیا۔ اس کاویاں پیر پٹیوں میں جکڑا تھا۔ ماتھے پر بھی پٹی باندھی تھی اور ہاتھ بھی زخمی نظر آ رہے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”یہ سب یہ کیسے ہوا سکندر؟“ وہ اس کے نزدیک آ گئی تھی۔ وہ فکرمندی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارا دل دکھا کر نکلتا تھا، بلاوجہ تم پر چیخا چلاتا بس قدرت نے اس بد تمیزی کی فورا“ ہی سزا دی کہ بچے سکندر شہیار! اب اس دیار غیر میں جہاں لڑا محمود کے سوا کوئی آپ کی زبان سمجھنے والا نہیں بمبر پر پڑ جائے۔“

وہ ہنس کر یوں بولا گویا خود اپنا مذاق اڑا رہا ہو، وہ اس کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ کر فکر مندی اور تشویش سے اسے پٹیوں میں جکڑا دیکھ رہی تھی۔

”خوب تماشا ہو رہا تھا ہسپتال میں ڈاکٹر، نرسیں سب میرے گرد جمع انگلیں میں میری چونوں کا احوال پوچھ رہے تھے اور میں انہیں انگریزی میں ”میرے کہاں کہاں چوٹ لگی ہے۔“ سمجھانے کے جتن کر رہا تھا۔ آخر میں ہم نے اشاروں کی زبان میں ایک دوسرے کو بتا دیا سمجھایا تھا۔“

وہ یوں بول رہا تھا جیسے کوئی بہت لطف لینے والی بات بتا رہا ہو۔ جیسے اس کے لیے اس کا ایکسیڈنٹ کوئی مزا لینے والا واقعہ تھا۔

”اتنی غمگین شکل مت بناؤ لو کی! میں ٹھیک ہوں۔“

وہ بالکل سنجیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ سکندر کے لیے اس کا ایکسیڈنٹ مذاق ہو سکتا تھا اس کے لیے نہیں۔ نہ جانے اسے کہاں کہاں چوٹیں آئی تھیں۔ نہ جانے زبان کے مسئلے کی وجہ سے وہ ڈاکٹر کو اپنی چونوں کے بارے میں ٹھیک سے بتا بھی سکا تھا کہ نہیں۔ وہ ایک دم ہی کرسی سے اٹھی تھی۔ وہ ڈاکٹر کو دوبارہ بلا کر لانا چاہتی تھی، تاکہ ڈاکٹر اس کے سامنے سکندر کا دوبارہ تفصیلی معائنہ کرے۔

”کہاں چلیں؟ بیمار کی عیادت پھولوں کے ساتھ کی جاتی ہے تم میرے لیے پھول بھی نہیں لائیں۔ کہیں پھول لینے ہی تو نہیں جاری ہو؟“

اس کا وہ تلخ موڈ اس کا بیزار آکٹیا ہوا انداز جیسے وہ ساری دنیا سے خفا ہو، ایک دم ہی تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ایکسیڈنٹ کی بات کر کے، اپنی چونوں کا ذکر کر کے حفا اٹھا رہا تھا، جیسے اسے برا مزا آ رہا ہو، کیا وہ اپنا ایکسیڈنٹ ہو جانے پر خوش تھا؟

یہ بہت ہی عجیب ساختیں اس کے دل میں ابھرا تھا۔ نہیں وہ ایک نارمل انسان ہے۔ وہ ایک پریشان ہونے والی، فکر کرنے والی بات پر خوش کیونکر ہو سکتا ہے۔

”ڈاکٹر کو بلانے۔“ وہ ڈاکٹر کو، مگر کیوں؟“ وہ سکندر کی بات کا جواب دینے کے لیے وہاں رکی نہیں اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

دس پندرہ منٹ کے بعد ڈاکٹر کے ساتھ وہ دوبارہ وہاں موجود تھی۔ ڈاکٹر اسے مطمئن کرنے کے لیے سکندر کا دوبارہ تفصیلی معائنہ کر رہا تھا اگرچہ وہ اسے پہلے ہی یہ بتا چکا تھا کہ اس کے دوست کو فوری بروقت اور بہتر تر منٹ دیا جا چکا ہے۔ سکندر کی چونوں کے بارے میں ڈاکٹر سے اس کی تفصیلی بات کو ریڈور میں ہو گئی تھی۔

سب سے زیادہ چوٹ سکندر کے پیروں میں لگی تھی باقی چونیں فکر کرنے والی نہیں تھیں مگر پیر کی چوٹ کے لیے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو جانے کے بعد بھی اگلے ایک سے دو ہفتے بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ڈاکٹر سکندر کا دوبارہ معائنہ کر رہا تھا اور وہ اس سے اردو میں پوچھتی جارہی تھی۔

”تمہارے اور تو کہیں کوئی چوٹ نہیں لگی ناں؟“ وہ ”تمہیں کسی اور جگہ تو درد نہیں ہو رہا ناں؟“ وہ اسی طرح مسکراتا ہوا مطمئن سالیانہ تھا۔ ڈاکٹر معائنہ کر لینے کے بعد اسے اطمینان دلاتا وہاں سے جانے لگا۔ تب اس نے سکندر کی دواؤں اور احتیاط کے متعلق چند

اور سوالات کیے۔ ڈاکٹر اس کے سوالوں کے تسلی بخش جوابات دے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

”ہو گئی تھی؟“ صبح کہہ رہا تھا ناں کہ میں ٹھیک ہوں۔“ وہ بہت سچائی اور امانیت سے بولی تھی۔

جواب میں سکندر کی مسکرائی نظر سے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے قدرے برامانے والے انداز میں پھنوس اچکا نہیں۔

”تمہاری اردو ابجوائے کر رہا ہوں۔ تمہارے انگلیں لیے والی اردو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔“ وہ جواباً ”کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

”میں اردو بس نیکی کے ساتھ بولتی ہوں یا اپنے پایا اور ان کی وائف کے ساتھ یا پھر بھی بھسار سیم کے ساتھ اور اب تمہارے ساتھ بول رہی ہوں۔ دیکھو!

میرے غلط تلفظ اور لفظوں کی اداسی کی رہنمائی۔ میں کم از کم تمہاری زبان جانتی تو ہوں۔ تم تو میری زبان جانتے بھی نہیں ہو۔“

آج شام اسے کیا ہوا تھا وہ اتنے غصے میں کیوں آگیا تھا؟ اس نے اتنا جارحانہ رد عمل کیوں ظاہر کیا تھا وہ خود کو تکلیف اور اذیت میں پڑا دیکھ کر خوش کیوں تھا؟ شدید خواہش کے باوجود بھی اس نے ان میں سے کوئی بات نہیں پوچھی تھی۔

اسے سکندر سے یہ سوالات کرتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پھر ناراض ہو جائے گا اور وہ نہ تو اس کا موڈ خراب کرنا چاہتی تھی، نہ ہی اسے ناراض کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے سوئٹ ڈش بھی کھلا چلی تھی۔

”تمہیں کس لینا! تم مجھے دیکھنے آئیں۔ پتا ہے تمہارے آنے سے میرا موڈ اچھا ہو گیا ہے۔“

”یہ تو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ سینور سکندر کو میرا بتانا اچھا لگا ہے۔“ وہ شرارت بھرے انداز میں مسکرائی تھی۔ سکندر نے اس کی مسکراہٹ کا

ساتھ دیا۔
”کافی منگواؤں تمہارے لیے؟“
”نہیں، عجب اور کچھ بھی نہیں لوں گا۔ آرام کرنا چاہتا ہوں اب۔ تم بھی میرا خیال ہے اب اپنے گھر جاؤ۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔
”نی الحال تو میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔ سینور سکندر!“ وہ اسے اس حالت میں تنہا چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتی تھی۔

کیا وہ تکلیف تک مبتلا اپنے دوست کو تنہا چھوڑ کر گھر چلی جاتی؟ اس کی دیکھ بھال کرنے والا یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اس کے ملک اور اس کی زبان سے انجان تھا۔ سوال یہ پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر گھر چلی جاتی۔ وہ سکندر سے کچھ کہنے کے لیے لب واکر رہی تھی کہ اسی وقت اس کے موبائل پر نینکی کی کال آنے لگی۔

”ہیلو، نینکی؟“ وہ گھر سے نینکی کو دروازے سے بس یہ بتاتی نکلی تھی کہ کہیں باہر جا رہی ہے سو عجب فکر میں مبتلا ہو کر ان کا فون آنکارا لڑا تھا۔
”گھر کب آؤ گی؟“

”نینکی! میرا دوست ہے ناں سکندر اس کا ایک سیل فون ہو گیا ہے۔ میں اس کے پاس ہاسپتال میں ہوں۔ صبح آؤں گی گھر آپ سو جا سیں۔“
اس نے سکندر کی اپنی جانب اٹھتی نگاہیں دیکھیں جن سے وہ اسے منع کرنا چاہتا تھا کہ وہ یہاں نہ رکے لیذا نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے نینکی کو جواب دیا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر فون بند کیا۔

”لیذا! تم گھر جاؤ لیذا۔ میں ٹھیک ہوں اور ویسے بھی مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ تم میری وجہ سے۔“
بے آرام ہو۔“ وہ سنجیدگی و بردباری سے بولا۔

”میں آپ کے پاس یہاں رک رہی ہوں سینور سکندر! چاہے آپ کو اچھا لگے چاہے برا۔“ وہ دھونس جمانے والے انداز میں بولی تھی۔
”لیذا! لیذا۔“

”سکندر! لیذا۔“ اس نے اسی کے انداز میں دہرایا۔

”ہاں میں نہیں مانوں گی۔ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، پھر میں تمہارا پیچھا چھوڑوں گی مگر اس سے پہلے نہیں۔“ مغرور بد تمیز اور خود پسند سکندر شہر پار کو دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ مجھے یہ ہسپتال میں زخمی و بیمار پڑا سکندر شہر پار مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔“
”مصورہ! اس جملے میں آپ مجھ سے اپنی دوستی ظاہر کرنا چاہ رہی ہیں یا دوستی کی آڑ میں میری برائیاں گنونا چاہ رہی ہیں میں سمجھ نہیں سکتا۔“ وہ اسے کھور کر دیکھتا ہوا مصنوعی ناراضی سے بولا تھا اور وہ جواباً کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

”تمہارا جو دل چاہیے سمجھ لو۔“ نرس سکندر کو دوا دینے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے سکندر کو دی جانے والی دواؤں کے متعلق نرس سے سوالات کیے تھے۔ ان میں چند پین کلیرز تھے اور ایک فینڈلین کے لیے دی جانے والی دوا تھی کیونکہ ڈاکٹر کا اندازہ یہی تھا کہ اگلی چند راتیں اور دن سکندر کے بہت تکلیف میں گزرنے تھے اور وہ پراسکون نینڈ سو سکے اس لیے اسے ادویہ دی جا رہی تھیں۔

نرس دوا دے کر چلی گئی تب اس نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ بند کر دی۔
”سو نے کی کوشش کرو سکندر!“
”میں تو سو جاؤں گا مگر تم کیا ساری رات یہاں اسی طرح بیٹھی رہو گی؟“

سکندر نے بے چین ہو کر پہلو بدلا تھا۔ پیر پیٹوں میں جکڑے ہوئے کے سب وہ کوٹ لینے سے قاصر تھا۔ شاید ایک ہی طرح لیٹے لیٹے اسے آنکھن ہونے لگی تھی۔

”مجھے نینڈ آنے کی تو صوفے پر لیٹ جاؤں گی۔“
”تمہیں کوٹ دلاؤں؟“ وہ اٹھ کر اس کے پاس آگئی تھی۔ اس نے بڑی آہستگی سے اسے کوٹ لینے میں مدد دی تھی۔

”تھمکس۔“ وہ بہت ہلکی آواز میں بولا تھا۔

”اب تم آنکھیں بند کر کے سو نے کی کوشش کرو!“
”اب تم آنکھیں بند کر کے سو نے کی کوشش کرو!“
”اب تم آنکھیں بند کر کے سو نے کی کوشش کرو!“

سکندر نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ واپس کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سو گیا ہے۔ اچھا تھا اسے نینڈ آگئی تھی۔ ورنہ اس کی رات بڑی تکلیف میں گزرتی۔ سو نے میں وہ کئی بار تکلیف سے کرا رہا تھا، کئی بار بے چینی سے اس نے پہلو بدلا تھا، اپنے پیر کو ہلانے کی کوشش یوں کی تھی جیسے شدید درد ہو رہا ہو۔ تکلیف سے ہی اسے بخار چڑھ گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر اسے کبل اوڑھا دیا تھا۔

وہ ڈاکٹر کو بلا کر لائی تھی۔ ڈاکٹر کے اطمینان دلائے پر کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں اور یہ کہ بخار کے لیے بھی سکندر کو دوا رات دی جا چکی ہے وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ یہ ضرور چیک کر رہی تھی کہ بخار تیز تو نہیں ہو گیا۔



اسے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے حلق بالکل سوکھ گیا ہو۔ پیاس کے شدید احساس سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک اجنبی کمرے میں خود کو موجود پا کر حیران سا ہوا مگر اگلے ہی بل پیر سے اٹھتی درو کی بیٹوں نے اسے یاد دلادیا کہ وہ کہاں پر ہے۔ اس نے پہلے سر سے پاؤں تک خود کو دیکھا۔ وہ جس کوٹ سویا تھا اس سے اٹھا نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی اوڑھے بغیر سویا تھا، مگر کبل اوڑھ رکھا تھا۔ کمرے میں ہنوز اندیرا تھا مگر کھڑکی سے باہر نظر ڈالنے پر اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک نیا دن طلوع ہوا ہی چاہتا ہے۔ وہ لیٹے لیٹے ہر طرف نظریں گھما رہا تھا۔ اس نے لیذا کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ کے پاس برکھی کرسی پر اسی طرح بیٹھی تھی جس طرح رات کو بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کرسی سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ اس کی وجہ سے اس نے ساری رات اس طرح تکلیف میں

گزاری ہے اسے شرمندگی کا احساس ہوا۔
اس ساری زندگی کبھی کسی کا کوئی احسان نہیں لیا تھا اور اس وقت اس نے اپنے اندر شدید قسم کی بے چینی محسوس کی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر اس کا دھیان رکھتی رہی ہے۔ اسے کوٹ بدلواتی رہی ہے، اسے سردی تو نہیں لگ رہی، وہ بے آرام تو نہیں اس سب کا خیال رکھتی رہی ہے۔ ایسا کوئی دوستانہ اور غیر معمولی سلوک اس نے لیذا کے ساتھ کبھی روانہ رکھا تھا کہ بدلے میں اس کے خلوص اور اپنائیت کی توقع رکھتا مگر وہ تو ابھی ہی دوستانہ مزاج اور دوسروں کی پروا کرنے والی لڑکی تھی۔ یہی بتایا تھا ناں رو رہے تھے اسے لیذا کے بارے میں۔ مگر وہ اپنا خلوص اپنی اچھائی بہت ہی غلط جگہ محبت ہی غلط شخص پر ضائع کر رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے نفرت سے سوچا۔
اس نے پہلو بدلنے کی کوشش کی۔ لیذا اتنی چوکس نینڈ سو رہی تھی کہ معمولی سی آواز سے بیدار ہو گئی تھی۔ ایک دم ہی سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے اسے دیکھا۔

”کیا ہوا؟ کچھ چلے ہیے سکندر؟“
”پانی۔“ وہ آہستگی سے بولا۔
لیذا جلدی سے اٹھی، اس نے گلاس میں پانی ڈالا پھر اپنے ہاتھ سے ہی اسے لیٹے لیٹے پانی پلانے لگی۔ وہ اتنا پیاسا تھا کہ پورا گلاس دو گھونٹ میں پی گیا تھا۔
”اور لاؤں؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
گلاس واپس رکھ کر وہ پھر اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تھا۔
”شکر ہے ٹیمپرچر کم ہو گیا۔“ وہ اس کے پاس سے ہٹتی تھی۔

”تمہیں ٹھیک سے نینڈ آئی ناں سکندر؟“ وہ سوال پوچھتی ہوئی کھڑکی کے پاس جا رہی تھی۔
”نینڈ؟“ اس نے حیران ہو کر دیکھا۔ وہ اتنی بے خبری والی گہری نینڈ سو گیا؟ اس نے سو نے میں وہ خواب کیوں نہیں دیکھے وہ روتا اور چیخا ہوا بیدار کیوں نہیں

ہوا! لیزا کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا رہی تھی۔
 ”کھڑکی کھول دوں؟ صبح ہو رہی ہے۔ تازہ ہوا
 کمرے میں آنے کی تم اچھا محسوس کرو گے؟“
 وہ کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر کھڑکی کھلی۔ اس کی سوچوں
 سے انجان وہ گردن گھما کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ
 رہی تھی۔ اس سے کچھ بولا نہ جاسکا۔ اس نے سر
 انبات میں ہلا دیا۔
 لیزا نے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔
 صبح کی تازہ ہوا کمرے کے اندر آنے لگی تھی۔ باہر ایک
 نیا دن ظاہر ہو چکا تھا۔

اس کے لیے ناشتا آگیا تھا۔ اس بار اٹھ کر بیٹھنے کی
 کوشش میں وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے مدد نہیں
 مانگی تھی۔ وہ خود اٹھ کر بیٹھ رہا تھا۔
 ”آرام سے“ آہستہ آہستہ سکندر! تمہارے زخم
 ابھی بالکل نازہ ہیں۔“
 اس نے سکندر کے شانوں کے گرد اپنے ہاتھ رکھ کر
 اسے پیٹنے میں مدد دی تھی۔ وہ بیٹھا تو لیزا نے اس کی
 کمرے کے پیچھے کیلئے لگا دیے تھے۔ اس نے اس کے لیے
 سلاکس برقعہ لگا گیا تھا۔
 ”تم بھی ناشتہ کرو۔“ اس کے ہاتھ سے سلاکس
 لیتے ہوئے اس نے کہا۔
 ”یہ ناشتہ ہیشٹ کے لیے ہے۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”ہیشٹ چاہتا ہے اس کی تیاروار بھی اس کے
 ساتھ ناشتہ کرے اور ویسے بھی ہیشٹ اتنا خوش
 خوراک نہیں کہ یہ سب کھا جائے۔“ وہ اسی کے انداز
 میں جواباً مسکرا کر بولا تھا۔ لیزا نے اس کے ساتھ ناشتا
 شروع کر دیا تھا۔
 ”تم رات بھر سوئی نہیں ہوتاں؟“ اس نے آہستگی
 سے پوچھا۔ وہ بالکل روکھا ہوا لکھنے لگی۔
 ”تمہارے سامنے سو تو رہی تھی سینور سکندر! تم
 آلیٹ تو لو۔“ وہ جیسے اپنی اچھالی کے بارے میں زیادہ

بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔
 ”لیزا! میں تم سے اپنے کل کے رویے کی معذرت
 کرنا چاہتا ہوں۔ تم اپنے دس کام چھوڑ کر مجھے ولا
 بور گیزر گھمانے لے کر گئی تھیں۔ مجھے تمہارے ساتھ
 اس طرح بد تمیزی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔
 میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔“

وہ ناشتہ روک کر یکدم ہی اس سے سنجیدگی سے بولا
 تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا، اس کا
 مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنے اندر کی لڑکھائیاں
 دوسروں پر نکالنا پھرے اور دوسرے بھی کو نہ؟ یہ لیزا
 محمود! جو خلوص اور محبت سے لبالب بھری ایک بہت
 اچھی لڑکی تھی۔
 اپنے رویے کی بد صورتی پر وہ لیزا سے حقیقتاً
 شرمندہ تھا۔ لیزا نے بھی ناشتہ روک دیا تھا۔ وہ اس کی
 آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے
 سکندر! میں نے تمہاری کسی بھی بات کا برا نہیں مانا۔
 میں بس یہ نہیں سمجھ سکی کہ تمہیں اچانک ہو گیا گیا
 تھا۔“

”میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا لیزا! پلیز
 تم مائنڈ مت کرنا۔“ وہ جواباً بہت آہستگی اور نرمی سے
 بولا تھا۔

وہ اب کبھی بھی اس سے تلخ لہجے میں کوئی بھی بات
 نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا احسان مند ہو گیا تھا اس لیے
 نہیں بلکہ اس لیے کہ لیزا محمود کے اندر کی اچھائیاں اور
 محبتیں ختم کرنے کا باعث کم از کم وہ ہرگز نہیں بنے۔
 جلد یا بدیر زندگی لیزا محمود کو یہ سمجھا دے گی کہ نہ تو یہ دنیا
 اتنی اچھی جگہ ہے نہ ہی یہاں بسنے والے لوگ۔ مگر
 اسے دنیا اور لوگوں سے مایوس کروانے والوں میں وہ
 کیوں شامل ہو۔ اگر وہ محبتیں بانٹتی ہے تو اس کی
 خواہش ہوگی کہ وہ لڑکی سدا محبتیں ہی تقسیم کرتی
 رہے۔ زندگی کا بد صورت چہرہ بھی اس کے سامنے نہ
 آئے۔

لیزا انبات میں سر ہلا کر مسکرائی تھی۔

”تم نہیں بتانا چاہتے، ٹھیک ہے۔ میں نے بالکل برا
 نہیں مانا۔ اب تم لیٹ جاؤ، کافی دیر سے بیٹھے ہوئے ہو۔“
 وہ اسے سارا دینے کے لیے آگے بڑھی تو وہ فوراً
 بولا۔

”میں خود لیٹ جاؤں گا لیزا! تم بیٹھو۔“
 لیزا نے اس کے انکار کی پروا کیے بغیر اسے لیٹنے میں
 مدد دی۔ اس کے پیروں میں شدید تکلیف تھی۔ اٹھ کر
 بیٹھنے اور پھر واپس لیٹنے میں اسے بہت تکلیف ہوئی
 تھی۔ پیر کی تکلیف کے آگے بازوؤں اور سر پر لگی
 چوٹیں انتہائی معمولی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان
 تکلیف کی طرف دھیان ہی نہیں جا رہا تھا۔ پیر میں
 جتنی شدید درد کی ٹپسیں اٹھ رہی تھیں، اتنا ہی زیادہ وہ
 اپنے اندر سکون اور اطمینان اترتا محسوس کر رہا تھا۔ خود
 کو تکلیف میں مبتلا دیکھ کر اسے ایک ان جانی سی
 مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔

کل ایکسیڈنٹ کے بعد جب وہ سڑک پر زخمی پڑا
 تھا، اس کے پیر بازوؤں اور سر سے خون بہہ رہا تھا تب
 بجائے پریشان ہونے کے، تکلیف اور درد محسوس
 کرنے کے، وہ خوش ہو رہا تھا۔ اپنا خون ہٹا دیکھ کر
 اسے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ ہاں، وہ خون اتنا ہی
 ارزاں تھا، اسے بول ہی بہہ جانا چاہیے تھا، اس کا وجود
 اتنا ہی بے مصرف تھا، اسے اسی طرح کسی اجنبی
 سرزمین پر غیروں اور اجنبیوں کے پیچ دینا سے نا نا توڑ جانا
 چاہیے تھا۔

شعوری طور پر وہ یہ کبھی بھی قبول نہ کر سکا کہ یہ
 ایکسیڈنٹ درحقیقت ہوا اس کی وجہ سے تھا مگر
 لا شعوری طور پر وہ جانتا تھا کہ غلطی گاڑی والے کی
 نہیں اس کی تھی۔ خود کو انجان اور بے پروا ظاہر کرنا
 وہ اس تیز رفتار گاڑی کو آنا دیکھ کر بھی اپنے آپ کو
 بچانے کے لیے کہیں داییں یا بائیں یا پیچھے نہ ہوا تھا۔ وہ
 گاڑی اسے ٹکرائی ہوئی وہ قدم آگے جا کر رکی تھی۔
 ڈرائیور نے فوراً ”بریک لگا“ تھے مگر رکتے رکتے
 بھی گاڑی اسے ٹکرائی چکی تھی۔

وہ سڑک پر اونڈھے منہ بڑا سرشاری سے مسکرایا
 تھا۔ وہ نہ مدد کے لیے چلایا تھا، نہ درد اور تکلیف سے
 کسی کو پکارا تھا۔ اس نے گاڑی کے ڈرائیور سے یہ
 درخواست بھی نہیں کی تھی کہ وہ اسے ہسپتال لے
 جائے۔ وہ سڑک پر سکون سے پڑا تھا۔ اگر گاڑی کا
 ڈرائیور اسے اٹھا کر ہسپتال نہ لانا تو وہ اسی طرح سڑک
 پر پڑا رہتا تو فیکہ کوئی اور اس کی مدد کو نہ آتا جو کہ وہ
 چاہتا تھا ابھی بھی نہ آئے۔

بظاہر تو سکندر شہر پارڈینی طور پر ایک نارمل اور
 صحت مند شخص تھا۔ باشعور، فہم و فراست رکھنے والا
 مرد۔ وہ خود کشی کی کوشش کیونکر کر سکتا تھا؟ خود اپنے
 آپ سے بھی وہ یہی کہہ رہا تھا کہ ایکسیڈنٹ اس کی
 بے دھیانی اور کار کے ڈرائیور کی تیز رفتاری کے سبب
 ہوا ہے۔

اس کے اندر خود سے نفرت میں مبتلا شخص اس کے
 جھوٹ پر ہنس رہا تھا۔
 ڈاکٹر اسے دیکھنے کے لیے آیا، ساتھ میل نرس بھی
 تھا۔ ڈاکٹر اسے سکندر کے بازوؤں اور سر کی بیڈنچ
 تبدیل کرنے سے متعلق ہدایات دے رہا تھا۔ وہ
 سکندر کے زخمی پیر کو مختلف انداز میں ہلا جلا کر دیکھ رہا
 تھا۔ پیر کی پٹیاں فی الحال نہیں کھولی جانی تھیں۔ وہ دیکھ
 رہا تھا کہ لیزا ڈاکٹر کے پاس کھڑی اٹالین میں جلدی
 جلدی بولتی اس کی چوٹوں ہی کے متعلق ڈاکٹر سے بات
 کر رہی تھی۔ غالباً اس کی رات کی بے سکونی اور
 تکلیف ڈاکٹر کو بتا رہی تھی۔

ڈاکٹر اور میل نرس وہاں سے چلے گئے تب اس
 نے لیزا سے اپنا موبائل اٹھا کر دیکھنے کو کہا۔ آفس ٹائم
 شروع ہو چکا تھا اسے آفس فون کر کے بتانا تھا کہ وہ آج
 نہیں آسکا۔ اسے وہاں اپنے ہیڈ آفس بھی فون کر کے
 اپنے ایکسیڈنٹ کی اطلاع دینی تھی۔
 وہ ہسپتال میں بیٹھ کر آفس کا کچھ ضروری کام کرنا
 چاہتا تھا اس کے لیے اسے آفس سے کچھ معلومات اور
 چند فائلز درکار تھیں۔ اسے یہ تمام چیزیں ای میل کر
 دی جائیں اس کو آفس فون کر کے یہ بھی کہنا تھا۔ یہ

سب سوچتے کے ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آگیا تھا کہ کل والا اور گیز جاتے وقت اس کے ساتھ اس کا لپ ٹاپ بیگ اور بریف کیس بھی تھا۔ اس کے یہاں تمام ضروری کاموں کی تفصیلات لپ ٹاپ میں موجود تھیں۔ اسے اپنا لپ ٹاپ درکار تھا۔

”لیزا! تمہاری گاڑی میں میرا لپ ٹاپ بیگ ہوگا پلینز وہ مجھے لا دو اور پلینز اب تم گھر جا کر آرام کرو۔ ساری رات بے آرام رہی ہو، گھر جا کر ریسٹ کرو۔“ وہ نرم لہجے میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”تم خیریت سے ہو سکندر شہیار؟ کوئی ضرورت نہیں ہے آج آفس کا کوئی بھی کام کرنے کی۔ دو تین دن کام نہ کرنے سے کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ لپ ٹاپ پر کام کرنے کے لیے بیٹھو گے یا بار بار جسم کو ہلاؤ جلاؤ گے، ہاتھوں اور پیروں پر دباؤ پڑے گا۔ سکون سے لیٹو۔ جو ڈاکٹر نے کہا ہے، وہ کرو۔“

لیزا نے باقاعدہ اسے ڈنپا تھا۔ ”بہت ضروری کام ہیں لیزا! وہ بے بسی سے بولا تھا مشکل یہ تھی کہ فی الحال وہ خود اٹھ کر جا نہیں سکتا تھا ورنہ خود جا کر لڑکی گاڑی سے اپنا لپ ٹاپ لے آتا۔“

”ہوں گے ضروری، مگر وہ ضروری کام سکندر شہیار کی صحت اور اس کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے۔“

وہ بہت محبت اور اپنائیت سے بولی تھی، بہت پروا کرنے والا انداز تھا مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں دل میں کہیں بہت زور سے جا کر چھبی تھی اس کی بات۔

”سکندر شہیار کی زندگی۔“ لہجے سے بولتا وہ یکدم ہی چپ ہو گیا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ سکندر شہیار کی زندگی سے زیادہ بے مول اور بے وقعت اس دنیا میں کسی کی بھی زندگی نہیں، سلت سکندر دور، اس سے بہت دور بننے والی صرف ایک ہستی ہے، جو اس کی موت پر رونے کی پائی دنیا میں کسی کو بھی اس کی زندگی یا اس کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اس ہستی کے ساتھ شاید لیزا محمود بھی چند آنسو اس کے لیے بہا لے کہ یہ لڑکی سر تپا محبت ہے۔ یہ

صرف سکندر شہیار کی نہیں بلکہ ہر کسی ہی کی تکلیف پر رو پڑتی ہوگی۔ لیزا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ ”کیا ہوا؟ کیا کتے کتے رک گئے تم؟“ ”کچھ نہیں۔“ وہ بخند کی سے مختصراً بولا تھا۔ ”کاموں کے لیے پریشان مت ہو۔ تمہاری جو ٹیس ٹھیک ہو جائیں، کام بھی سارے ہو جائیں گے۔“ وہ اس کی طرف جھک کر دوستانہ انداز میں بولی تھی۔ ”میل نرس آتا ہوگا، تم اپنی بیڈنگ تبدیل کرواؤ۔“ میں گھر جا رہی ہوں، تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔“

اس نے خاموشی سے محض سر اثبات میں ہلایا تھا۔

☆☆☆

اس نے آفس فون کر دیا تھا۔ روبرو کل رات ہی اپنی فیملی کے ساتھ گھوم پھر کر واپس آیا تھا، اس نے آج سے ہی آفس جوائن کر لیا تھا۔ سکندر کی اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ اس کے ایک سیلفنٹ کاسن کر فکرمند ہوا تھا۔ تفصیلات پوچھ رہا تھا مگر وہ اپنی چونوں سے زیادہ آفس کے کاموں کے لیے فکرمند تھا۔ اس نے روبرو سے وہ تمام ڈاکومنٹس ای میل کرنے کو کہا تھا، جو اسے آفس سے دور بیٹھ کر آفس کا کام کرتے ہوئے درکار تھے۔ وہ اسپینج ہاتھ اور بیڈنگ کی تبدیلی والے تمام کاموں سے فارغ ہو چکا تھا۔ نیم گرم پانی سے ہاتھ منہ اور جسم کا اوپری حصہ دھونے سے وہ خود کو کافی تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا مزید کئی دنوں تک اپنی ان چونوں کے ناز اٹھانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

وہ آج ہی ہاسپٹل سے چھٹی لے کر چلا جانا چاہتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ کل کا دن اپنے ہوٹل میں گزارے گا پھر برسوں سے آفس۔

لیزا دوپہر میں پھر ہسپتال میں موجود تھی۔

”تم سوئیں نہیں گھر جا کر؟“

”سوئیں گی دو گھنٹے کی نیند لے لی کافی ہے۔ تم اپنی سناؤ تکلیف کچھ کم ہوئی؟“

وہ اس سے کیا کہتا کہ تکلیف جتنی زیادہ ہوتی ہے وہ اتنا ہی اچھا محسوس کرتا ہے۔ اس نے محض سر ہلایا تھا۔

”تم نے سچ کر لیا؟“ ”ہاں۔“

”تم میوزک سنو گے؟ میں تمہارے لیے اپنا آئی پوڈ لے آئی۔ میوزک میں تمہاری پسند تو مجھے پتا نہیں اس میں اٹلینن گانے بھی ہیں اور انگلش سونگز بھی ہیں۔“

اس نے بیگ سے نکال کر اپنا آئی پوڈ اسے دیا۔ وہ یہ کہہ کر اس کے خلوص کی تعریف نہیں کر سکتا تھا کہ اسے میوزک، موزون، کتابیں کسی بھی چیز میں رتی برابر بھی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو زندہ لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ برسوں ہوئے اس نے خود کو زندہ لوگوں میں شمار کرنا چھوڑ دیا تھا۔

”میں کچھ انگلش میگزینز اور کتابیں بھی لائی ہوں مگر پھر وہی بات کہ تمہاری پسند مجھے پتا نہیں تھی۔ بس جو مجھے پسند ہیں، وہ لے آئی۔“

وہ اس کے لیے یہ سارا اہتمام یوں کر رہی تھی گویا وہ یہاں کئی دنوں تک پڑا رہنے والا ہے۔ اسے سوچ کر ہنسی آئی۔

”تم مسکرا کیوں رہے ہو؟“ اس نے اس کے لبوں پر آئی مسکراہٹ فوراً دیکھ لی تھی۔

”کچھ نہیں، ویسے ہی۔“

”ویسے یہ موقع اچھا نہیں ہے سینور سکندر! تم زخمی ہو کر بیڈ پر پڑے ہو، تمہارے کہیں پر بھی چلے جانے، بھاگ جانے کا کوئی خطرہ موجود نہیں ہے۔ اس بہترین موقع سے فائدہ اٹھا کر میں تمہاری بیڈنگ کیوں نہ بنالوں۔ تم چلے جتنا بھی ناراض ہو گے، منہ پھلاؤ گے مگر اٹھ کر جاؤ تو نہیں نہیں سکونگے۔“

وہ شرارت بھرے انداز میں بولی تھی اور وہ

پراختیار قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”مصورہ! میں نے تمہیں اپنی دوست سمجھا تھا۔“

بڑے افسوس کی بات ہے کہ میری دوست میری

مجبوری کا فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔“

اس نے تاسف سے سر ہلا کر جیسے اسے شرمندہ

کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک اجنبی ملک میں بنے جلنے، چلنے پھرنے سے قاصر ہو کر ہسپتال میں پڑا تھا چاہے اسے اپنی صحت اور زندگی کی پروا بھی پائیں مگر ہر حال اسے یہاں وقت پر اپنا کام مکمل کر کے دوبا اپنے ہیڈ آفس رپورٹ کرنی تھی۔ یہ ایک پریشان کن صورت حال تھی اور وہ۔

وہ لیزا کے ساتھ بڑے بلکے موڈ میں ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ باتیں کرنے، اس کے ساتھ وقت گزارنے کو انجوائے کر رہا تھا۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً یہ کمال اس لڑکی کا تھا ورنہ ایک عمر گزری وہ تو ہنسنے والی باتوں پر بھی ہنسا بھول بیٹھا تھا۔

”نہیں سینور سکندر! میں آپ کی بیڈنگ کا فائدہ ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی بیڈنگ اس وقت بنالوں گی جب آپ خود مجھے اپنی خوشی سے یہ اجازت دیں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے جواباً بولی تھی۔

☆☆☆

لیزا اسے باتیں کرتے کرتے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ دو تین گھنٹے سو تا رہا تھا، بغیر کسی دوا کے؟ نہیں شاید دوپہر کو نرس نے جو پین کلر ڈیے تھے۔ ان میں سکون اور نیند لانے والی بھی کوئی دوا شامل رہی ہوگی۔ اس نے فوراً خود سے کہا تھا۔

چلو نیند دوا کے ساتھ آئی تھی مگر اس کے وہ خواب؟

اس نے فوراً ہی اپنے اندر سے ابھرتے اس سوال کو ذہن سے جھٹکا۔

”اٹھ گئے تم۔“ وہ اس کے پاس کرسی پر بیٹھی ہوئی

تھی۔ اپنے ساتھ لائی کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی

تھی۔

”ہاں کافی دیر سو گیا میں۔“

”اچھا ہے ناں۔ جتنا آرام کرو گے، خود کو ریلیکس

رکھو گے؟ اتنی ہی جلدی ٹھیک ہو پاؤ گے۔“ وہ مسکرا کر پر غلوں انداز میں بولی تھی۔

”تمہارے لیے اسٹینکس اور کافی آئی تھی، تم سو رہے تھے تو میں نے واپس لوٹا دیا۔ اب بول کر آئی ہوں۔ ویسے تم کافی کی جگہ چائے تو نہیں لیتا چاہتے؟ اصل میں یہاں کافی کا استعمال زیادہ ہے۔ لوگ چائے کچھ خاص پسند نہیں کرتے۔“

وہ کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولی تھی۔
”کافی ہی ٹھیک ہے بلیک، تم اپنے لیے بھی لے کر آنا۔“ وہ بغیر تکلف کے بولا تھا۔ لیزا سر ہلاتی وہاں سے چلی گئی۔

وہ مشرو مزاور پینر والا سینڈوچ کھا رہا تھا، لیزا کو کیر کھا رہی تھی۔ کھانے کے لیے اٹھ کر بیٹھنے میں اس نے لیزا کی مدد لینے سے منع کرنا چاہا تھا مگر اس نے پھر بھی اسے مدد دی تھی۔

”لیزا! ابھی ڈاکٹر آئے گا تاں تو تم اس سے کہنا مجھے ہسپتال سے چھٹی چاہیے۔“
ڈاکٹر ٹیک اپنا مدعا پینچانے کے لیے اسے لیزا کی ضرورت تھی۔ وہ آج ہی ہسپتال سے چلا جانا چاہتا تھا۔
”کیا مطلب؟“ وہ یکدم ہی بولی اچھلی تھی گویا کوئی بہت سی عجیب بات سنی ہو۔

”کل شام تمہارا ایکسٹنڈ ہوا ہے۔ ابھی تمہاری چوٹیں بالکل تازہ ہیں اور تم ہسپتال سے ڈسچارج ہونا چاہتے ہو، خیریت ہے ناں؟“ وہ ڈانٹنے والے انداز میں بولی تھی۔

”لیزا! بیڈ پر لیٹ کر آرام ہی کرنا ہے ناں وہ میں اپنے ہوٹل میں کر لوں گا۔ یہاں ہسپتال میں اس طرح پڑ کر مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں بالکل ہی معذور ہو گیا ہوں۔ تم اسے کچھ بھی کہو مگر ہسپتال کا رواجی ماحول مجھ پر نفسیاتی طور پر اتنا منفی اثر ڈال رہا ہے کہ اگر میں یہاں رہا تو ٹھیک ہونے میں بہت تاخیر ہو گا۔“

لیزا جواباً ”اس بات کی مخالفت میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر روپر ٹو انڈر آیا۔ اس کے ہاتھوں میں پچھلوں کا ایک گلدستہ تھا۔

”Buona Sera۔“ اس نے اٹالین میں شام اور رات کا سلام ان دونوں کو مشترکہ طور پر کیا تھا۔
”یہ کیا کر لیا تم نے میرے پیچھے ہیں؟“ وہ اس سے انگریزی میں مخاطب ہوا تھا۔ وہ جواباً ”مسکرایا تھا۔“
”بیٹھو روپر ٹو!“ لیزا نے اپنی کرسی روپر ٹو کے لیے خالی کر دی تھی۔ روپر ٹو نے مسکرا کر لیزا کو دیکھا تھا۔
”تم ہو سکندر کے پاس چلو یہ اچھا ہے۔ صبح جب سکندر نے مجھے اپنے ایکسٹنڈ کا بتایا میں یہی سوچے جا رہا تھا کہ اٹالین نہ آنے کی وجہ سے اسے یہاں مشکل ہو رہی ہوگی۔“

”دوستی کی ہے سینور سکندر سے تو اپنے دوست کا خیال تو رکھو کی ناں روپر ٹو!“
وہ سامنے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی وجہ سے روپر ٹو اور لیزا انگریزی ہی میں باتیں کر رہے تھے۔
روپر ٹو اس بات پر ذرا سا بھی حیران نہیں تھا کہ لیزا اس کے پاس ہسپتال میں کیوں ہے؟ وہ یونہی تو ہر کسی کے ساتھ نیکیاں اور اچھائیاں کیا کرتی تھی۔ روپر ٹو نے اسے لیزا کے بارے میں یہی تو بتایا تھا ناں؟ جب روپر ٹو اسپین میں تھا تو لیزا اس کی بیوی کو ہسپتال لے کر گئی تھی، اس کے پاس وہاں رہی تھی۔ یہ اچھائیاں، یہ غیر معمولی سلوک و توجہ خصوصیت کے ساتھ اس کے ساتھ نہیں تھا بلکہ یہ اس لڑکی کے مزاج کا حصہ تھا۔ یہ اس لڑکی کے واقف ہر شخص کے لیے تھا۔

پھر آخر روپر ٹو حیران ہوا بھی کیوں؟ وہ اس کی چچپن کی دوست تھی جانتا تھا وہ اپنی دوست کے مزاج کو۔
”ہاں! یہ بات تو ہے۔ تم سے اچھی دوستی بھانے والا کون ہو سکتا ہے لیزا؟“ روپر ٹو نے مسکرا کر لیزا کی بات کا جواب دیا تھا۔ ”میں نے سارے ڈاکٹر منٹس نہیں ای میل کر دیے تھے بلکہ تمہارے ہاں تمہیں؟“
”کمال دیکھ پایا ہوں میں۔ میرا لپ ٹاپ لیزا کی گاڑی میں پڑا ہے یہ مجھے لا کر نہیں دے رہی۔ اور اپنے موبائل پر میں نے ایچ منٹ کھولنے کی کوشش کی تو ساری ایچ منٹ کھل نہیں سکیں۔“
وہ روپر ٹو کی بات کے جواب میں قدرے فکر مند

ہو بولا تھا۔ اسے دفتر کے کاموں کی فکر تھی۔
”ہاں تو بالکل ٹھیک کر رہی ہوں میں۔ پانی داوے ہمارا لپ ٹاپ اور بریف کیس اب میری گاڑی میں نہیں بلکہ میں نے اپنے گھر لے جا کر حفاظت سے رکھ دیا ہے۔ باتیں سنو ذرا ان محترم کی روپر ٹو! مجھ سے فرما رہے ہیں عین ڈاکٹر سے کہہ کر انہیں ہسپتال سے ڈسچارج کروادوں۔ ذرا اس کی چوٹیں دیکھو اور پھر یہ بات سنو۔“

اس نے پہلے اسے اور پھر روپر ٹو کو ایک ہی وقت میں مخاطب کیا تھا۔
”مجھے ہاسپٹلز کا ماحول سوٹ نہیں کرتا۔ طبیعت انہی سے ہے جو روپر ٹو! اسے کرنا ہے باقاعدگی سے پیڈنٹ چینی کرواتے رہنا ہے تو یہ سب تو میں ہوٹل جا کر بھی باسانی کر سکتا ہوں۔ میرا یقین کریں آپ لوگ میں یہاں رہ کر اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہو سکوں گا جتنا جلدی یہاں سے جا کر ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

اس کے لیے روپر ٹو اتنا اہم نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے ہسپتال سے چھٹی کروانے کی وجوہات سے آگاہ کرنا۔ اس نے روپر ٹو سمیت اپنے کسی بھی جاننے والے ملنے والے کو یہ حق نہیں دے رکھا تھا کہ وہ اس کی ذاتیات میں دخل دے مگر یہاں مسئلہ لیزا محمود کا تھا۔ وہ اسے ٹوک نہیں سکتا تھا اور نہ ہی خفا ہو کر اسے اس موضوع پر بولنے سے روک سکتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ یہاں روپر ٹو موجود تھا بلکہ اس لیے کہ اب وہ لیزا کے ساتھ تلخ ہونا نہیں چاہتا تھا۔

”اگر یہ بات ہے تم نے یہاں سے جانا ہی ہے تو پھر تم میرے گھر چلو گے۔ ہوٹل تو میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔“

لیزا اس کی بات کے جواب میں فوراً ”دھونس بھرے انداز میں بولی تھی۔ اس کا اپنا سر پیٹنے کو دل چاہا تھا۔ وہ یہ کیسا نیا قصہ نکل بیٹھی تھی۔ اب یہ ایک نئی مصیبت تھی۔
”یہ بالکل بھی مناسب نہیں ہے لیزا!“ وہ بے حد سنجیدگی سے بولا تھا۔

”کیا مناسب نہیں ہے؟“ لیزا نے اسے غصے سے دیکھا تھا۔
”لیزا ٹھیک کہہ رہی ہے سکندر اگر تمہیں لگتا ہے کہ ہسپتال کا ماحول تمہیں سوٹ نہیں کر رہا تو پھر تمہیں کسی ایسی جگہ جانا چاہیے جہاں تمہاری دیکھ بھال ہو سکے۔ لیزا اگر تمہیں اپنے گھر لے جا رہی ہے تو یہ تو بہت اچھا ہے وہاں اس کی بیٹی ہیں وہ تمہارا خیال رکھ لیں گی تم سمجھو۔“

روپر ٹو نے اپنی رائے پیش کی تھی۔ وہ ہسپتال سے جانے کی بات بول کر چھٹا رہا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے انتظار پر بار آچکا تھا مزید کوئی بھی احسان لینے کا وہ تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔
”مجھے اصل میں عادت نہیں ہے اس طرح کسی کے بھی گھر پر رہنے کی۔ میں ایڑی قیل نہیں کروں گا۔“ اپنے سچے کو نرم رکھتے ہوئے اس نے لیزا کو انکار کیا۔

وہ اپنی عادت کے مطابق صاف، ڈو ٹوک اور بے مروتی بھر انکار اسے کر نہیں پاتا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر اسے اب لیزا سے بات کرتے ہوئے یہ فکر رہتی تھی کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے اس کا دل دھکے

”تم وہاں اچھا محسوس کرو گے، یہ میری گارنٹی ہے سکندر! اور اگر تمہیں اچھا نہ لگا تو تم مجھے صاف صاف بتا دینا۔ میں خود تمہیں اسی وقت تمہارے ہوٹل چھوڑ آؤں گی یہ میرا وعدہ ہے۔“

وہ صوفے سے اٹھ کر بیڈ کے پاس آگئی تھی۔ اور دوستانہ لہجے اور اہانتیت بھرے انداز میں بولی تھی۔
”مان جاؤ سینور سکندر! تمہاری دوست لیزا محمود کا گھر کم از کم تمہارے ہوٹل سے تو زیادہ آرام دہ ہے۔“

وہ بے بس سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی اہانتیت، غلوں اور محبتوں کو پانے کا ذرا سا بھی حقدار نہیں تھا مگر وہ اس لڑکی کو انکار کیسے کرے؟ اہانتیت بھرا اصرار کر رہی تھی۔ وہ دوستانہ انداز میں

حق بتا رہی تھی اور اس اپنائیت اور دوستانہ حق سے انکار کرنے کے لیے اسے لازماً بے مروتی اور سرد مہری کا مظاہرہ کرنا پڑا جو وہ اس کے ساتھ کر نہیں سکتی رہا تھا۔ وہ لیزا کو مدد کے گھر پر لڑ نہیں جانا چاہتا تھا مگر اخلاقی دباؤ میں یوں آگیا تھا کہ اسے اس کے گھر جانا ہی پڑا تھا۔

دو روٹو اوجھانوں گھنٹہ بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا تھا۔ لیزا نے اس سے اس کی چھٹی کی بات کی تھی۔ کئی مشکلوں سے ڈاکٹر نے اسے ڈسچارج کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ وہ بھی یہ کہہ کر مریض اپنی ذمہ داری پر جلدی ڈسچارج ہو رہا ہے۔ اس نے سکندر کو کل آکر کھانے کی نائیکدی تھی۔



”آرام سے آہستہ آہستہ اترو۔“ وہ اس کے پار ٹنٹ آگیا تھا۔ لیزا نے گاڑی بیس منٹ میں لے جا کر روکی تھی۔ آپ وہ اسے ہاتھ پکڑ کر باہر نکلنے میں مدد دے رہی تھی۔ اسے اپنے دائیں پاؤں پر بالکل بھی زور نہیں ڈالنا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر وہ راستے سے آگے نہ بڑھی۔ خرید کر لائے تھے ڈاکٹر نے نائیکدی تھی کہ کم از کم بھی وہ اگلے ایک ہفتہ زیادہ سے زیادہ آرام کرے اور اگر چلنا پھرنا گزیر ہو ہی جائے تو پھر میساجی کے سہارے اپنے دائیں پیر پر بالکل بھی وزن ڈالے بغیر چلے۔

وہ میساجی کے سہارے اپنا سارا وزن میساجی اور بائیں پاؤں پر ڈالے دائیں پاؤں کو محض گھینٹا ہوا چل رہا تھا۔ لیزا اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ”تمہیں درد تو نہیں ہو رہا ناں سکندر!“ تم سے چلا جا رہا ہے ناں؟

میں دردوازے سے اندر داخل ہوتے لفٹ میں جاتے باہر نکلتے اس کے پار ٹنٹ تک آتے آتے وہ یہ سوال نبھانے لگتی بار دہرائی تھی۔ اسے ہنسی آگئی تھی۔

”ہنسو مت“ مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے۔ ضدی اتنے ہو کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر ہی دم لیا ہے جبکہ ابھی دو تین دن ہمیں ہسپتال میں رہنا چاہیے تھا۔ وہ اس کے ہنسنے پر چڑ کر ناراضی سے بولی تھی۔ لیزا کے نیل بچانے پر پار ٹنٹ کا دروازہ ایک بڑی عمر کی خاتون نے کھولا تھا۔ وہ چونکہ عاتبانہ تعارف حاصل کر چکا تھا چنانچہ جانتا تھا یہ لیزا کی بیٹی ہیں۔ بچپن میں اس کی آیا تھیں اور اب روم میں لیزا کے فلیٹ کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے شلوار قبض اور دوپٹہ پہن رکھا تھا۔ بالوں کا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ چہرے پر نرمی اور محبت بھرا ناظر تھا۔

”السلام علیکم۔“ ساری زندگی کبھی اس طرح کسی کے گھر منہ اٹھا کر نہیں گیا تھا۔ بہت عجیب محسوس کر رہا تھا۔

”وعلیکم السلام بیٹا! آؤ اندر آؤ۔“ انہوں نے ہر شفقت انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ ان کی اردو میں گفتگو سننے ہی اسے لیزا کی گالیاں یاد آئیں۔ اپنی بیٹی ہی سے فرمائش کر کے اس نے اردو میں گالیاں لیکھی تھیں ناں۔ اسے لیزا کی وہ خطرناک اردو یاد کر کے دل ہی دل میں ہنسی آئی تھی۔

”بیٹی! آپ نے اور میں نے مل کر سکندر کی بہت کیڑ کرئی ہے۔ تیار رہیں۔ ڈاکٹر ابھی اسے ڈسچارج نہیں کر رہا تھا یہ ضد کر کے ہسپتال سے چھٹی لے کر آیا ہے۔“

وہ لیزا اور اس کی بیٹی کے ساتھ چلا ایک کمرے میں آگیا تھا۔ لیزا کا پار ٹنٹ خوب صورت تھا۔ آرٹسٹک لگ دے رہا تھا۔ لگ رہا تھا یہ لیزا کا اس کے عزیز از جان روم میں اپنا فلیٹ ہے جسے اس نے بڑی محبت سے سجا اور سنوار رکھا ہے۔

”بیٹا! تم بالکل تکلف مت کرنا۔ جس وقت جس چیز کی ضرورت ہوئے جھجک مجھ سے کہہ دینا۔“ وہ میساجی کو ٹائٹلز مضبوطی سے جھا کر اس پر اپنا وزن ڈال کر بیڈ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تب بیٹی اس سے بولی تھیں۔ اسے بیٹھنے میں کچھ وقت کا سامنا

تھا اس لیے اس نے محض سر اثبات میں ہلا دیا۔ لیزا جو اس کے بالکل بائیں کھڑی تھی اس نے اسے فوراً ہی بیٹھنے میں مدد دی تھی۔

”چائے“ کافی کچھ لاؤں تم لوگوں کے لیے؟“ بیٹی نے لیزا کو اور اسے سوائے نگاہوں سے دیکھا۔

”بیٹی! کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔ آپ ایسا کریں، ڈنبری کا انتظام کر لیں۔“ لیزا اس کی میساجی بیڈ کی سائڈ ٹیبل کے ساتھ ٹکا کر رکھ رہی تھی۔

”کھانا تو میں پہلے ہی تیار کر چکی ہوں۔“

وہ بیڈ کے اوپر اپنا دایاں پاؤں خود ہی اٹھا کر رکھ رہا تھا مگر لیزا نے جلدی سے بیڈوں میں جھکے اس کے پاؤں کو بڑی آہستگی سے ایسے کہ اسے ذرا بھی تکلیف نہ ہو اٹھا کر بیڈ پر رکھا۔ ساتھ وہ بیٹی کو جواب بھی دے رہی تھی۔

”یہ آپ نے بہت اچھا کیا بیٹی! بس پھر اب تھوڑی دیر میں آپ میرا اور سکندر کا کھانا میز لے آئیے گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا!“ بیٹی وہاں سے چلی گئی تھیں۔ وہ بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ لیزا نے اس کی کمر کے پیچھے ٹکیے لگا دیے تھے۔

”تکلیف تو نہیں ہو رہی پاؤں میں؟ اتنا چلے ہو۔“ وہ بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

”لیزا! میں تمہارے اصرار پر آگیا ہوں مگر مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ اس طرح تمہیں اور تمہاری بیٹی کو اپنی وجہ سے پریشان کرنا۔“

وہ سنجیدگی سے بولا تھا پاؤں میں درد والے سوال کا نفی میں جواب دینے کے بعد۔

”مجھے اور بیٹی کو کوئی تکلیف نہیں ہو رہی سکندر! دوست آخر ہوتے کس لیے ہیں؟ کیا صرف ہنسی مذاق کرنے اور اچھے وقت پر ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لیے؟ تمہارا ایکسپینڈنٹ ہو گیا ہے، تم تکلیف میں ہو اور اٹلی تمہارا ملک بھی نہیں ہے۔ تم نہ یہاں کی زبان جانتے ہو نہ راستوں سے واقف ہو۔ اس پریشانی میں بحیثیت دوست میں اپنی ذمہ داری سمجھتی

ہوں کہ تمہارے ساتھ رہوں۔“ وہ بھی جواباً سنجیدگی سے بولی تھی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ لیزا کچھ بھی کہتی بہر حال اسے اس طرح یہاں آکر خاصی شرمندگی ہو رہی تھی چاہے وہ اسے بعد ہو کر، اصرار کر کے اس کی مرضی کے خلاف دھونس اور حق جتا کر لائی تھی تب بھی۔

”یہ تمہارا کمرہ ہے؟“ اس نے خود ہی موضوع تبدیل کر دیا تھا۔ آج رات کی بات ہے۔ وہ کل یہاں سے چلا جائے گا۔

”ہاں!“ وہ جواباً مسکرائی تھی۔ اس نے ایک پیار بھری نگاہ اپنے کمرے میں ڈالی تھی۔ اس کی نگاہ سامنے دیوار پر لگی ایک تصویر پر گئی تھی۔ لیزا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔

”یہ میری اور میری بہن، سیم کی تصویر ہے۔“ تصویر میں لیزا اور اس کی بہن پانچ چھ سال کی بچیاں تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے گلے میں بائیں ڈال رکھی تھیں۔ دونوں بے تحاشا ہنس رہی تھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش لگ رہی تھیں۔

”رائٹ سائڈ والی تم ہو، ہے ناں؟“ اس نے اسکرٹ بلاؤز میں لبوس، بالوں کی دو بوٹیاں بنائے خوب صورت اور خوب صحت مند سی بچی کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں! میں ہوں۔ بہت موٹی تھی میں بچپن میں۔“ وہ تصویر کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ہنسی تھی۔

”یہ سیم کی برتھ ڈے پارٹی والے دن کی تصویر ہے۔“

”سیم تمہاری بہن کا ایک نیم ہے؟“ اسے ایسا لگا تھا جیسے لیزا کو اپنی بہن کی باتیں کرنا اچھا لگ رہا ہے اس لیے اس نے اخلاقاً ”اس حوالے سے گفتگو بدھالی۔“

”ہاں! اس کا پورا نام مانتا ہے۔ ہم لوگ پیارے اسے سیم بلاتے ہیں۔“ لیزا کے چہرے پر اس کی بہن کی محبت کے رنگ بھرے تھے۔

”تمہاری بہن بھی اٹلی میں رہتی ہے؟“

”نہیں“ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ پاکستان میں رہتی ہے۔“ وہ اس بار کچھ دکھ بھرے انداز میں مسکرائی تھی۔ شاید وہ اپنی بہن کو بہت مس کرتی تھی۔ وہ لیزا کو بغور دیکھ رہا تھا۔

”مجھ میں اور سیم میں بہت پیار ہے سکندر! ہم دونوں صرف ہمیں نہیں بلکہ ایک دوسرے کی میسٹ فرینڈز۔ بھی ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب میں اور سیم ایک دوسرے سے بات نہ کریں۔“ لیزا کی بات اس کے دل کو بڑی تیز جا کر چبھی تھی۔ وہ پچھلی زندگی کو کبھی بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا مگر پھر بھی لیزا کا اس کی بہن کے لیے پیار دیکھ کر اسے بھی کوئی یاد آیا تھا۔

”جو بات۔ بہن بھائیوں کی ہوتی ہے وہ کسی اور کی نہیں ہوتی ناں! سکندر مجھے لگتا ہے آپ کے بھائی یا بہن آپ کے جتنے اچھے دوست بن سکتے ہیں، اتنا اچھا دوست اور کوئی نہیں بن سکتا۔ ان کے سامنے آپ خود کو عیاں کرنے سے بچھکے بھی نہیں ہیں۔ بھائی! بہن کا پیار قدرت نے بڑا انمول بنایا ہے۔“ وہ اپنی دھن میں بڑے جذب سے بول رہی تھی۔

”بھائی! اس پر ایک وحشت سی طاری ہوئی تھی۔“ لیزا! میں کچھ دیر آرام کروں؟“ اپنے اندر کی وحشت سے گھبرا کر اس نے لیزا سے کہا۔ وہ اس کی بدلتی کیفیتوں سے انجان مسکرا کر بولی۔

”ہاں تم کچھ دیر رست کرو۔ پھر ہم ساتھ ڈنر کریں گے۔“

لیزا اس سے مسکرا کر بولتی کمرے سے چلی گئی تھی۔ وہ وحشتوں میں گھرا کمرے میں ٹوٹا بیٹھا تھا۔

اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی تھی جب اموجان نے اسے فون پر یہ خبر سنائی تھی کہ اس کے کیا کو اس کا خود اپنے لیے کوئی لڑکی پسند کر لیتا برا نہیں لگا ہے۔

”تمہارے پیلا سے میں نے بات کی ہے زین اہو

ام مریم کی فیملی سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر ام مریم اور اس کی فیملی انہیں پسند آگئی تو انہیں اس کے ساتھ تمہارا رشتہ طے کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”تھنک یو اموجان تھنک یو سوچ۔“ آپ نے مجھے بہت بڑی خوش خبری دی ہے۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں پیلا کو یہ نہ لگے کہ میں اپنی تنگنی وغیرہ کی بات جلدی کر رہا ہوں۔ آئی میں ابھی تو میری انڈر رگریجوٹ اسٹڈیز بھی مکمل نہیں ہوئیں۔“ خوشی کا بے پایاں احساس تھا جس نے اسے اپنی پلیٹ میں لے لیا تھا۔

”میں بھی اسی حوالے سے تھوڑی فکر مند تھی زین! مگر تمہارے پیلا نے اس بات کو اتنے مثبت انداز میں لیا۔ بولے ”ہمارے بچے امریکہ میں پیدا ہوئے اور ہمیں بے بڑے ہیں۔ یہاں تین سو چودہ سال کی عمر کے لڑکے لڑکیاں بوائے فرینڈز گھل فرینڈز کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارا بیٹا تو پچھریں سال کا ہونے والا ہے اور ایک لڑکی پسند کرنے اور اس سے شادی کا سوچنے کے لیے درست راست اپنا رہا ہے تو ہم اس کے لیے رکاؤٹ کیوں ہیں؟“

زندگی میں پہلی بار اس کے باپ نے اس کے لیے وہ سوچا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ اس کی آرزوئیں اور خوابوں کو روند ڈالنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اسے اس بل بے اختیار اپنے باپ پر پیار آیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اس کے دل کو اس کے جذبات کو نہیں پہنچائی تھی، پہلی مرتبہ اس کے دل کی خوشی کا انہوں نے خیال کر لیا تھا۔ وہ بے پناہ خوش تھا۔ اس کا سب سے بڑا خوف کہ پیلا اس بات پر کیا رد عمل ظاہر کریں گے، دور ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی ام مریم سے بھی اس خوشی کو شیئر کیا تھا۔

”ج زین۔ تم نے اپنے پیرشس سے بات بھی کر لی؟“ ام مریم نے خوشی کا بے ساختہ اظہار کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

”کتنی اہم تھی یہ لڑکی اس کے لیے۔ کتنا اہم تھا اس کا ساتھ اس کے لیے۔ اموجان سے ام مریم کے متعلق بات کرنے کے بعد اس نے ام مریم کو اس بابت

کچھ نہ بتایا تھا۔ اندر ہی اندر ایک خوف تھا، نجانے پیلا کیا کہیں، کس طرح کا رد عمل ظاہر کریں۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا؟ وہ ام مریم کو کسی بھی طرح کا کوئی دکھ دینے کا کبھی تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ اگر شہیار خان کا رد عمل مخالفت میں ہوتا تب وہ کیا کرتا، یہ اس نے نہیں سوچا تھا اور اب جب سب کچھ بالکل ٹھیک ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا تب اسے ایسا کچھ سوچنے کی ضرورت بھی کہاں رہی تھی۔ زندگی پہلی بار اس کے ساتھ سب کچھ دیر کر رہی تھی جیسا وہ چاہتا تھا۔ اسے پہلی بار زندگی پر پیار آ رہا تھا۔

”میرے پیلا اور اموجان تمہارے گھر والوں سے ملنا چاہتے ہیں مریم!“ وہ اس کے حسین چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیتا ہوا بولا تھا۔

”ٹھیک ہے زین! میں نے ابھی تک اپنے گھر میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ میں اپنے پیلا سے بات کر کے نہیں بتاتی ہوں۔“

”وہ مان جائیں گے ناں مریم؟“ اسے ایک نیا خوف لاحق ہوا تھا۔

”میں نے اپنے لیے اتنا پیئڈم ڈیون اور چار منگ لڑکا ڈھونڈا ہے۔ وہ کیوں نہیں مانیں گے زین؟“

مریم اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ وہ جواباً ”ہنس پڑا تھا۔“

”میں ایسا کچھ خاص پیئڈم ہوں نہ ڈیون۔ تمہیں لگتا ہوں۔“

”تم جو ہو مجھے دیے ہی لگتے ہو زین! میں سب سے پہلی تمہاری طرف انریکٹ ہی اس سے ہوتی تھی کیونکہ تم مجھے بہت پیئڈم اور چار منگ لگے تھے۔“

وہ مسکراتا ہوا خاموشی سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ تعریف کرتی تھی تو بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی تعریفیں سن کر اب کبھی کبھی اسے خود ہی شک سا ہونے لگتا کہ شاید اب تک کی زندگی میں سکندر کے ساتھ مقابلہ اور موازنہ کرنے کی دھن میں وہ خود کو انڈر اسٹیمیت (under estimate) کر رہا تھا ورنہ اتنا عام سا بھی نہیں تھا وہ۔

ام مریم کے پیلا اپنے آفیشل کام سے امریکہ آنے والے تھے۔ کام چاہے انہیں نیویارک میں تھا مگر ظاہر ہے انہوں نے اپنی بیٹی سے ملنے تو لاس اینجلس آنا ہی تھا۔ کچھ دنوں بعد ام مریم نے اسے یہ اطلاع دی تھی۔ وہ فون پر اپنے پیلا کو اس کے متعلق پہلے ہی بتا چکی ہے۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا تھا اور یہ بھی کہ اس کے پیلا ایک روشن خیال آدمی ہیں۔ وہ بیٹی کی شادی اس کی پسند کی جگہ پر ہی کرنا چاہیں گے۔ ابھی اس کے پیلا کے آنے میں کافی دن باقی تھے اور وہ ابھی سے ہی پر جوش سا تھا، کچھ خوف، کچھ اندیشے بھی تھے دل میں اور بہت سی امیدیں، آرزوئیں اور خواب بھی دل میں ابے تھے۔ وہ دن رن رن کر انتظار کر رہا تھا۔

جیسے ہی ام مریم نے اپنے پیلا کے امریکہ آنے کی تاریخ کنفرم کی، اس نے جھٹ کھر فون کر کے اموجان کو یہ بات بتائی۔

”ٹھیک ہے بیٹا! وہ یہاں پہنچ جائیں پھر میں اور تمہارے پیلا ان سے اور ام مریم سے ملنے لاس اینجلس آجائیں گے۔“

اس کی اموجان محبت سے گندھے لمبے میں بولی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ام مریم ان کے بیٹے کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے، اس کی زندگی کا پہلا خواب ہے۔

ام مریم اپنے چچا کے گھر رہتی تھی۔ اس کے پیلا کو بھی آکر وہیں ٹھہرنا تھا اور وہیں ان دونوں فیملیز کی ملاقات ہوتی تھی۔ شہیار خان اور اس کی اموجان لاس اینجلس آگئے تھے۔ وہ ان دونوں کو ام مریم کے گھر لے آیا تھا۔

وہ بے حد نروس تھا۔ اگرچہ دل میں یہ یقین راسخ تھا کہ ام مریم اس کے مغرور اور خود پسند پیلا کو بہت پسند آئے گی کہ وہ ان کے اعلیٰ ترین معیار کے عین مطابق تھی۔ مگر اس کی فیملی، اس کے پیلا؟ وہ دعا کر رہا تھا کہ ام مریم کے پیلا اور اس کی فیملی شہیار خان کے معیار پر

پوری اتر جائے

وہ پیچھے کو اہمیت دیتے تھے مگر ساتھ ہی وہ اعلا حسب نسب کو بھی بہت اہمیت دیا کرتے تھے یہ تمام چیزیں اس کے لیے بے معنی تھیں، سوا اسے ان سب کے بارے میں جاننے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ ام مریم کے آپاؤ اجداد انڈیا میں کھلے تھے اور اس کے دادا پر دادا کیا کرتے تھے اس میں اسے دلچسپی نہ ہو، مگر اس کے پاپا کو ہوتی تھی۔

اور زندگی اس پر واقعی مہمان ہو چلی تھی۔ ام مریم کے پاپا اس کا اعلا حسب نسب سب کچھ شہریار خان کے اعلیٰ معیار کے مطابق تھا۔ وہ بھوں کے بیج میں خاموش بیٹھا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ باتوں باتوں میں شہریار خان نے ام مریم کے والد کا پورا چہرہ نسب معلوم کر ڈالا تھا اور اب وہ بڑے مطمئن اور خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے بیٹے نے اپنے ہم پلہ خاندان کی لڑکی کو چننا ہے۔ اس نے باپ کی نگاہوں میں پسندیدگی بھانپ لی تھی۔ اس کی اموجان مسکرا زیادہ دہی تھیں بول کم رہی تھیں۔ جمال شہریار خان بول رہے ہوتے تھے وہاں وہ خاموش ہی رہا کرتی تھیں۔ انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں شہریار خان سے اجازت لی تھی پھر اس کے بعد ام مریم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ام مریم ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔ اس کے والدین سے ملنے کے لیے اس نے شلوار قمیص اور دوپٹے پر مشتمل خوب صورت لباس زیب تن کیا تھا۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کا اس پر سے نگاہیں ہٹانے کوئی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنی اموجان اور شہریار خان کے چہروں پر پسندیدگی محسوس کی۔

یہاں آجاؤ بیٹا! اموجان نے پر شفقت انداز میں اسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا تھا۔ وہ اس کی اموجان کے برابر میں اور اس کے پاپا کے عین مقابل بیٹھی تھی۔ ”کیا پڑھ رہی ہیں بیٹا آپ؟“ شہریار خان نے قدرے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔ ام مریم کے بولنے کا وہی انداز تھا جس سے وہ دلوں

کو مسحور کر لیا کرتی تھی۔ اس کے بیٹھنے کے انداز میں اس کے گفتگو کے انداز میں شہزادوں جیسی آن بان اور نزاکت تھی۔ وہ مقابل کو اپنی شخصیت کے سحر میں لحوں میں گرفتار کر لینے والی اہلیت کی مالک تھی۔ اسے ام مریم پر فخر کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے شہریار خان اس سے گفتگو کرتے جا رہے تھے ویسے ویسے ان کے چہرے پر ام مریم کے لیے پسندیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے شوق، مشاغل، مستقبل کے ارادے، شہریار خان ان سب کے متعلق اس سے گفتگو کر رہے تھے اور وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ لیوں پر دھیمی سی مسکان لیے انہیں حیران کر رہی تھی۔

اتنی سی عمر میں وہ جو کچھ پڑھ چکی تھی اور جو جو اس نے حاصل کر لیا تھا، اس سے شہریار خان واضح طور پر متاثر نظر آ رہے تھے۔ جیسے وہ ام مریم کے سحر میں گرفتار ہوا تھا ایسے ہی وہ اپنے باپ کو بھی اس کے سحر میں مبتلا رہا تھا۔ اس کے خوابوں کی اس شہزادی نے اس کے باپ کا بھی دل موہ لیا تھا۔ شہریار خان کو ام مریم بطور اپنی ہونے والی بہو کے دل و جان سے پسند آ گئی تھی۔ وہ آج صرف ام مریم کے والد سے ملاقات کرنے آئے تھے، باقاعدہ رشتہ مانگنے کا کوئی ارادہ آج کے لیے نہیں تھا، مگر ام مریم انہیں اتنی پسند آ گئی تھی کہ وہ اس روز ہی باقاعدہ رشتہ مانگنے بغیر نہ نہیں سکتے تھے۔

ان کے رشتہ مانگنے پر وہ بھی حیران تھا، ام مریم بھی حیران تھی اور اس کی اموجان بھی۔ گو وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی اموجان کو بھی ام مریم بہت اچھی لگی ہے۔ ”آتا“ فانا ”سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ کیا کسی کو اس کی محبت اتنی آسانی سے بھی مل سکتی ہے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ دونوں طرف کی فیملیوں نے اس کے اور ام مریم کے رشتے کو قبول کر لیا تھا۔

شہریار خان کی خواہش تھی کہ ان دونوں کی باقاعدہ منگنی کر دی جائے۔ زندگی سے اس کے سارے گلے شکوے لمحہ بھر میں دور ہو گئے تھے۔ مارے خوشی کے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ایک روز

بہو ایک اینڈ تھا اور وہی دن منگنی کے لیے طے کر لیا گیا تھا۔ سادگی سے تقریب منعقد کی جانی تھی۔ ام مریم کے چچائی کے گھر پر۔

اگلے روز اس کی اموجان منگنی کی انگوٹھی خرید لائی تھیں اور ساتھ ہی کسی پاکستانی یا انڈین بوتھک سے ام مریم کے لیے منگنی کا جوڑا بھی۔ وہ اور شہریار خان اس کے پاپا منٹ ہی پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ منگنی کے بعد اسی رات ان دونوں کی واضح شگون روائی تھی اور اس سے اگلی صبح ام مریم کے پاپا کی امریکہ سے واپسی تھی۔

اس نے سکندر کو اپنی منگنی کی اطلاع دینی ضروری نہ سمجھی تھی مگر شہریار خان اور اس کی اموجان نے اسے فون کر دیا تھا۔ ان دونوں نے اس سے منگنی پر آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھا خوشی خوشی اموجان کا ام مریم کے لیے لایا منگنی کا جوڑا اور انگوٹھی دیکھ رہا تھا۔ شہریار خان کو سکندر کو فون ملا تو دیکھ کر اس کے منہ کا مڑا خراب ہو گیا تھا۔ اسے اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی خوشی کے موقع پر سکندر کی بالکل بھی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ اپنی خوشی میں اس کی موجودگی اور اس کی شمولیت ہی نہیں چاہتا تھا۔

”اوہ! تمہارا پیپر ہے۔ ہاں میں بالکل بھول گیا تھا کل تو تمہارا پیپر ہو گا۔“

اس نے شہریار خان کو فون پر بولتے سنا۔ سکندر کے ایزامز چل رہے تھے، اس کا آٹنا مشکل تھا۔ اس نے طمانیت محسوس کی تھی۔

”ڈیٹ آگے بڑھائیں؟ مشکل لگ رہا ہے سکندر! اچھا میں پوچھتا ہوں۔“

شہریار خان نے فون پر گفتگو ختم کی تو اموجان نے ان سے پوچھا تھا۔

”کیا تمہارے سکندر؟“

”کہہ رہا ہے منگنی دو تین دن آگے بڑھائیں۔ کل تو اس کا پیپر ہے اور پرسوں بھی کوئی Presentation وغیرہ ہے۔“

”سکندر کے بغیر تو بالکل مزا نہیں آئے گا۔“ اموجان سنجیدگی سے بولی تھیں۔

وہ جلدی سے سرنفی میں ہلا کر بولا تھا۔ ”لیکن مریم کے پاپا کی پرسوں صبح کی فلائٹ ہے۔ مریم مجھے بتا رہی تھی اس کی داوی کلنی بیمار ہیں اور اس کے پاپا کو فوراً ان کے پاس جانا ہے۔“

مریم نے اس سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کی داوی بے شک بیمار تھیں مگر ایسا کچھ نہیں ہو گیا تھا کہ پرسوں صبح اگر اس کے پاپا روانہ نہ ہوتے تو کوئی قیامت آجاتی۔ اگر وہ مریم سے کہتا تو اس کے پاپا کے لیے ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا وہ تین چار دن بعد کی اپنی سیٹ بک کر لیتے مگر جب وہ ایسا چاہتا ہی نہیں تھا تو کہتا کیوں؟ اموجان چاہتی تھیں کہ ان کے گھر کی پہلی خوشی میں ان کے سارے گھر والے موجود ہوں۔ وہ وہی تو بھائی ہیں۔ ایک بھائی کی خوشی ہو اور دو سرابھائی موجود نہ ہو، ایسا کس طرح ہو سکتا تھا؟

شہریار خان تو ظاہر ہے اپنے ولی عہد کی موجودگی صرف اسی تقریب میں نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر محفل میں چاہتے تھے۔ اس کے ماں، باپ، سکندر کی کمی محسوس کر رہے تھے، مگر اسے اپنے بھائی کی کمی قطعاً محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس کے نہ آنے پر زیادہ خوش تھا۔ اگر سکندر آجائے تو اس کی خوشی بد مزاجی ہو جاتی۔

سکندر نے اسے کچھ ہی دیر بعد فون کیا تھا۔ وہ خوش بھی ہو رہا تھا، اسے مبارک باد بھی دے رہا تھا اور اس سے یہ اصرار بھی کر رہا تھا کہ وہ منگنی کی تقریب دو تین روز آگے بڑھالے تاکہ وہ بھی اس میں شریک ہو سکے۔ وہ صاف لفظوں میں اس سے یہ نہ کہہ سکا تھا کہ اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی خوشی میں اسے اس کی موجودگی قطعاً ”درد کار“ نہیں ہے۔ اس نے غیر جذباتی اور سپاٹ سے لہجے میں ام مریم کے والد کے امریکہ میں مزید نہ رک سکنے ہی کا جوڑا پیش کر دیا تھا۔

”پھر بھی یار کو کوشش تو کرو۔ کیا پاپا وہ اپنی سیٹ آگے کروالیں۔ آخر کو ان کے ہونے والے داماد کے اکلوتے بھائی کی منگنی میں شرکت کا سوال ہے۔ کیا پاپا زین شہریار کے بھائی کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اپنی سیٹ

آگے کروائی لیں۔“

وہ شوخ و شریر لہجے میں بولا تھا۔

”بہت مشکل ہے سکندر! انہیں فوری واپس جانا ہے۔“ منگنی کا دن آگے نہیں کیا جاسکتا۔“ وہ

بے صبروت اور خشک سے لہجے میں بولا۔

”اچھا۔“ اس کے سپاٹ اور دو ٹوک انکار نے سکندر کو مایوس کیا تھا۔ اسے اس کے آہستہ آواز میں بولے ”اچھا“ سے اندازہ ہو گیا تھا۔

”چلو ٹھیک ہے زین! میں موجود نہیں بھی ہوا تب بھی میری دعا میں تو تمہارے ساتھ ہی ہیں۔ میری ہونے والی بھانجی کو میرا سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ مجھے ان سے ملنے کا بہت شوق ہے اور بہت جلد میں ان سے ملوں گا بھی۔“

سکندر پر خوش ساہو کریوں بول رہا تھا جیسے اس کی منگنی پر بہت خوش ہو۔ اسے سکندر کی خوشی مصنوعی اور بناوٹی لگ رہی تھی۔ زندگی میں ہمیشہ ہر چیز اس نے پہلے حاصل کی تھی اور زین نے بعد میں۔ یہاں وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ اس سے پیچھے رہ جانے پر خوش کیونکر ہو سکتا تھا؟ ابھی تک اس کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی تھی اور اس کے بھائی کی منگنی ہونے پر جاری تھی وہ بھی اتنی حسین اور بے مثال لڑکی کے ساتھ۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ سکندر دل سے اس کے لیے خوش ہوتا۔

اس کی منگنی کا دن اس کے اور ام مریم دونوں کے لیے بے حد یادگار دن تھا۔ ام مریم اس کی اموجان کا لایا جو ڈاپنے، مشرقی انداز کی دلہن کا روپ اپنانے بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ وہ خود کو زمین پر نہیں، آسمانوں پر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ام مریم کو اپنے ہاتھوں سے منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ اس کے بابا اور اموجان نے اسے ڈائمنڈ کا پیش قیمت سیٹ تحفے میں دیا تھا۔ اس کے اپنے باپ سے سارے شکوے ختم ہو گئے تھے۔ آج کے بعد اسے زندگی سے بھی کوئی شکایت باقی نہ رہی تھی۔

اس کے بابا اور اموجان پر وگرام کے مطابق منگنی کے بعد اسی رات واشنگٹن واپس روانہ ہو گئے تھے اور اگلی صبح ام مریم کے پاپا بھی واپس چلے گئے تھے۔ وہی زندگی تھی۔ وہی کمپس کی بھاگ دوڑ، وہی بڑھائی کی مصروفیت مگر پھر بھی اب سب کچھ بدل دیا لگتا تھا۔ وہ اور ام مریم اب پہلے سے بھی زیادہ وقت ساتھ گزارا کرتے تھے۔ اب ان کے رشتے کو ایک نام مل چکا تھا، بزرگوار کی رضا مندی مل چکی تھی۔ اب کہیں کوئی خوف کوئی اندیشہ نہ تھا۔

کرسمس کی چھٹیاں آنے والی تھیں۔ چھٹیوں کے لیے کچھ خاص پلان نہیں کیا تھا اس نے۔ اس روز اموجان کا اس کے پاس فون آیا تھا۔

”تمہارے بابا کا پیغام ہے تمہارے اور مریم کے لیے۔“ سلام دعا کے بعد انہوں نے تھکتے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

”کیا اموجان؟“ اس نے محسوس کیا تھا ام مریم جیسی بے مثال اور شاندار لڑکی کا انتخاب کرنے کے بعد سے وہ باپ کی نگاہوں میں ٹھوڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ساری زندگی اسے نظر انداز کرتے رہنے کے بعد انہیں اب کیس جا کر یہ یقین آیا ہے کہ وہ انہیں کا بیٹا ہے انہی کی طرح اعلیٰ معیار رکھنے والا انہی کی طرح بہتر نہیں بلکہ بہترین کا انتخاب کرنے والا۔

”انہوں نے مجھ سے کہا ہے میں کرسمس کی چھٹیوں میں ام مریم کو گھر اور ٹاؤنٹ کروں تاکہ وہ یہاں آ کر ہمارے رہن سہن اور طور طریقوں کے بارے میں تھوڑا بہت جان سکے۔ تم چھٹیوں میں اسے لے کر گھر آ جاؤ بیٹا!“

”واقعی بابا نے ایسا کہا ہے اموجان؟“ اسے حیرت سی حیرت تھی۔ اس کے مغرور بابا اور کسی کو اس طرح انواٹھ کریں؟

”ہاں زین! ان کی خواہش ہے یہ چھٹیاں تم اور مریم ہمارے ساتھ گزارو۔“

”ٹھیک ہے اموجان! ہم دونوں ضرور آئیں گے۔“

بعد ازاں کافی کامیابیوں میں خود بناواں گی۔“ لیذا ان سے مسکرا کر بولی تھی۔ نیلی کمرے سے چلی گئی تھیں۔ لیذا اس کے لیے پلیٹ میں کھانا ڈال رہی تھی۔

اس نے ام مریم سے پوچھے بنائی باہی بھری تھی۔ اس کی محبت پر ایسا بھروسہ اور ایسا یقین تھا پتا تھا وہ اس کی کسی بھی خواہش کو کبھی رو نہیں کرے گی اور یہاں تو جانا بھی اسے اپنی ہونے والی سرال میں تھا۔ اپنی سرال تو وہ بعد شوق جانا چاہے گی۔

اور اس کا یہ یقین سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ ام مریم نے اس کی بات سنتے ہی بڑی خوشی اور گرم جوشی کا اظہار کیا تھا۔

”ہاں! میں چلوں گی۔“ انکل نے اتنے پیار سے بلایا ہے میں کیوں نہیں جاؤں گی؟“ وہ مسکرا کر بولی تھی۔ وہ اس کے گھر جانے کے لیے بڑی پر جوش تھی۔

جیسے ہی چھٹیاں شروع ہوئیں اس نے اسی روز ام مریم کو ساتھ لے کر واشنگٹن کے لیے رخت سنبھاندا ہوا وہ ام مریم کو اپنے گھر لے کر جا رہا ہے۔ وہ بے حد خوش تھا۔ ام مریم بھی اپنی سرال جانے پر بہت خوش تھی۔ اس کے پاس سرے سے اسے دل و جان سے انواٹھ کیا تھا وہ خوش کیوں نہ ہوتی؟

مگر بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے وہ نہیں جانتا تھا اس بار اپنے گھر جانے پر اس کی زندگی میں کیا قیامت آجائے والی تھی۔ اس کی زندگی میں خوشیوں کی عمر بے حد مختصر تھی۔ وہ واشنگٹن اپنے گھر خوشیاں منانے نہیں جا رہا تھا۔ وہ اپنی خوشیوں کو ختم ہوتا، ٹھکرتا اور فنا ہو جاتا دیکھنے کے لیے جا رہا تھا۔

لیذا کی نیلی نے ان دونوں کا کھانا انہیں کمرے ہی میں دے دیا تھا۔

”اور کچھ تو نہیں چاہیے بیٹا؟“ انہوں نے لیذا سے پوچھا تھا جو اس کے بیڈ کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھی تھی۔ کھانے کی ٹرے بیڈ پر رکھی تھی۔

”نہیں نیلی! بس اب آپ آرام کیجئے کھانے کے

بعد ازاں کافی کامیابیوں میں خود بناواں گی۔“

لیذا ان سے مسکرا کر بولی تھی۔ نیلی کمرے سے چلی گئی تھیں۔ لیذا اس کے لیے پلیٹ میں کھانا ڈال رہی تھی۔

اس نے ام مریم سے پوچھے بنائی باہی بھری تھی۔ اس کی محبت پر ایسا بھروسہ اور ایسا یقین تھا پتا تھا وہ اس کی کسی بھی خواہش کو کبھی رو نہیں کرے گی اور یہاں تو جانا بھی اسے اپنی ہونے والی سرال میں تھا۔ اپنی سرال تو وہ بعد شوق جانا چاہے گی۔

اور اس کا یہ یقین سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ ام مریم نے اس کی بات سنتے ہی بڑی خوشی اور گرم جوشی کا اظہار کیا تھا۔

جیسے ہی چھٹیاں شروع ہوئیں اس نے اسی روز ام مریم کو ساتھ لے کر واشنگٹن کے لیے رخت سنبھاندا ہوا وہ ام مریم کو اپنے گھر لے کر جا رہا ہے۔ وہ بے حد خوش تھا۔ ام مریم بھی اپنی سرال جانے پر بہت خوش تھی۔ اس کے پاس سرے سے اسے دل و جان سے انواٹھ کیا تھا وہ خوش کیوں نہ ہوتی؟

مگر بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے وہ نہیں جانتا تھا اس بار اپنے گھر جانے پر اس کی زندگی میں کیا قیامت آجائے والی تھی۔ اس کی زندگی میں خوشیوں کی عمر بے حد مختصر تھی۔ وہ واشنگٹن اپنے گھر خوشیاں منانے نہیں جا رہا تھا۔ وہ اپنی خوشیوں کو ختم ہوتا، ٹھکرتا اور فنا ہو جاتا دیکھنے کے لیے جا رہا تھا۔

لیذا کی نیلی نے ان دونوں کا کھانا انہیں کمرے ہی میں دے دیا تھا۔

”اور کچھ تو نہیں چاہیے بیٹا؟“ انہوں نے لیذا سے پوچھا تھا جو اس کے بیڈ کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھی تھی۔ کھانے کی ٹرے بیڈ پر رکھی تھی۔

”نہیں نیلی! بس اب آپ آرام کیجئے کھانے کے

”تم کیا کہنا چاہتے ہو سکندر؟“

”مردور ٹوکی بیوی کا اس کی غیر موجودگی میں دھیان رکھتی ہو اپنی بچپن کی آبا کو عزت اور احترام سے اپنے گھر کی بزرگ کا درجہ دے کر رکھتی ہو۔ بہت اچھی بات ہے لیذا اگر تم ہر ایک کے لیے محبت اور خلوص دل میں رکھتی ہو۔ تمہارے دل میں سب کے لیے ہمدردی ہے، ترس ہے، مگر مجھے تمہاری ہمدردی اور تمہارے ترس کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے ساتھ کی جانے والی تمہاری نیکیاں مجھے احسان لگ رہی ہیں۔ مجھے تمہاری نیکیوں اور اچھائیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیذا!“

اس بار وہ چڑکرتو نہیں بولا تھا مگر سرد اور سیاٹ ہے موت سے انداز میں ضرور بولا تھا۔ لیذا چند لمحے بغور اسے دیکھتی رہی تھی۔

”تم اور کچھ بھی نہیں لینا چاہتے؟ سوٹ ڈش بھی نہیں؟“

ایک پل کے بعد اس نے سنجیدگی سے پوچھی تھی تو یہ بات پوچھی تھی۔ وہ اپنی دل دکھانے والی بات کے جواب میں اس کا کوئی سخت رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اتنے سکون سے بات بدلتے دیکھ کر اس کا موڈ شدید خراب ہوا تھا۔

”میں اب سونا چاہتا ہوں۔“

لیذا نے کھانے کے چند ہی لقمے لیے تھے۔ اس نے اپنا کھانا اسی طرح ادھر ادھر اچھوڑ کر کھانے کی ٹرے ہاتھوں میں اٹھالی تھی۔

”ٹھیک ہے تم سو جاؤ۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کل یا مہینے کے بلالینا۔ میں جاگی ہوئی ہوں۔“

وہ سنجیدگی سے بولتی، کمرے کی لائٹ آف کرتی ہوئی باہر چلی گئی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا تھا۔

لیذا کے ساتھ اس انداز میں اتنی بد تمیزی سے بات کرنے کے بعد وہ مزید سکون ہوا تھا۔ اس کی زندگی میں جہاں کہیں پر بھی جو کچھ تھا، جو کچھ ہو چکا تھا اس

میں لیذا کا کیا قصور تھا جو وہ اس کے ساتھ اس لمحے میں بات کر گیا تھا۔ وہ اس کا احساس نہیں لینا چاہتا تو ٹھیک ہے نہ لے مگر اس کے لیے بد تمیزی اور بے رحمی کی تو کوئی ضرورت نہیں۔ وہ چپ چاپ کم صدم سائیڈ پر اسی طرح بیٹھا تھا اس نے لیذا کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے خود بہت غصہ آ رہا تھا۔

لیذا جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر گئی تھی۔ وہ اس کمرے کے دروازے پر کھڑا رہا تھا۔ ڈیرنگ ٹیبل پر لیذا کا میک اپ کا سامان، ہیر برش، پرنٹو مزو وغیرہ رکھے تھے۔ خوب صورت وارڈ روم میں بیٹھا ”اس کے کپڑے“ کپڑے ہوئے ہوں گے۔ وہ اسی گھر میں اسی کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اسے اپنی بد تمیزی پر کچھ اور بھی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ وہ کل صبح ہی یہاں سے چلا جائے گا۔ کمرے کا دروازہ بجاتا تھا۔

قدروے حیران سے ہوتے اس نے ”جی آجائیں“ بولا تھا۔ اس کا خیال تھا یہ لیذا کی بیٹی ہوں گی اس کی بد تمیزی کے بعد اتنی جلدی لیذا کے دوبارہ آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔

وہ لیذا تھی۔ اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ اس پر وہ مخصوص مسکراہٹ نہیں تھی جو ہمہ وقت اس کے لبوں کا احاطہ کیے رکھتی تھی۔ سنجیدگی کے ساتھ، ناراضی سے، بغیر مسکراہٹ کے ساتھ، یہی سبھی پر وہ آئی تو بھی اس کے پاس۔ ابھی جبکہ دو تین گھنٹے قبل ہی وہ اس کے ساتھ خاصی بد تمیزی اور بد اخلاقی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

”تم نے دوائے لی؟“ اس کے قریب آ کر اس نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

دوائے کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اس نے گم گم سے انداز میں سرنفی میں ہلا دیا تھا۔ وہ اس سے ناراض ہے اس کے چہرے سے ظاہر تھا مگر ناراضی میں بھی وہ اس کی فکر کرنا نہیں بھولی تھی۔ لیذا نے سوچ بورڈ کی طرف جا کر کمرے کی لائٹ جلائی تھی۔

”جب دوسروں کے احسان لینے کا شوق نہیں ہے تو

لو اپنا خیال رکھنا چاہیے ناں؟“

ناراضی سے بولتے ہوئے اس نے گلاس میں پانی اٹھا۔ اب وہ ٹیبلٹ اور کیپول نکال رہی تھی۔ لیذا نے وہ اس کے ہاتھ پر دھری۔ اس نے بغیر کچھ کے پانی سے نگل لی۔

”تم نے مرہم لگایا؟“ وہ بغور اس کے بازوؤں کے زخم دیکھ رہی تھی۔ آج ہسپتال سے ڈسچارج ہونے سے قبل ڈاکٹر نے اس کے بازوؤں پر بے بیڈنگ آٹا رکھی تھی۔ اسے زخم پر لگانے کے لیے مرہم لگایا تھا۔

اس کے ایک بازو پر کہنی سے لے کر کلائی تک ذرا زیادہ گہرا زخم تھا جبکہ دوسرے پر معمولی نوعیت کی جوت تھی۔ اس نے پھر نفی میں سر ہلایا تھا۔ لیذا سائیڈ کے ساتھ رکھی اس کرسی پر فوراً بیٹھ گئی تھی جس پر بیٹھ کر کچھ دیر قبل وہ اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔

اس نے بغیر کچھ کے مرہم کی ٹیوب ہاتھ میں اٹھائی تھی۔ وہ اس کا بازو ہاتھ میں لے کر اس کے زخم پر بہت آہستگی اور نرمی سے مرہم لگا رہی تھی۔ وہ خاموش تھی، اس کے چہرے پر سنجیدگی اور ناراضی تھی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم ابھی تک جاگی ہوئی تھیں؟“

لیذا نے صرف سر ہاں میں ہلایا تھا۔

”کچھ پیٹ کر رہی تھیں؟“ اس نے پھر سر ہاں میں ہلایا تھا۔

”کیا؟“

”ایک لینڈ اسکپ۔“ وہ اس کے سوالوں کے مختصر ترین اور ٹوڈی پوائنٹ جواب دے رہی تھی۔ وہ ایک بازو پر مرہم لگا چکی تو اس نے خودی اپنا دوسرا بازو بھی اس کے آگے کر دیا۔

”تمہارا یہاں کوئی باقاعدہ اسٹوڈیو ہے؟ میں نے سنا ہے آرٹسٹ لوگ اپنے گھروں میں اپنا ایک پراپرٹم کا اسٹوڈیو ضرور رکھتے ہیں۔“

اس کے طویل سوال کے جواب میں لیذا نے محض سر ہاں میں ہلایا تھا۔ وہ مسکرا کر دوستانہ انداز میں سوالات کر رہا تھا، وہ سنجیدگی سے سر ہاں یا نہ میں ہلا کر

یا پھر ایک لفظی جملہ بول کر اسے جواب دے رہی تھی۔

”کہاں ہے تمہارا اسٹوڈیو؟“

”لوہر۔“

”مجھے دکھاؤ گی؟“

”دیکھ لینا۔“

”کب؟“

”جب تمہارا دل چاہے۔“ وہ ایک کے بعد ایک سوال کر رہا تھا اور وہ بغیر اس کے طرف دیکھے، سپاٹ سے انداز میں جواب دے رہی تھی۔ گویا وہ اس سے بہت سنجیدگی سے ناراض تھی۔

”اور تم مجھے پیٹ کب کرؤ گی؟“ اس لڑکی کے چہرے پر اس کی زندگی سے پھر وہ مسکراہٹ دیکھنے کی ایسی شدید خواہش ابھری تھی اس کے دل میں کہ بے اختیار وہ بوجھ بیٹھا تھا۔ اس کا اندازہ سو فیصد درست تھا لائق بے نیازی اور ناراضی کا تاثر کچھ بھر میں لیذا کے چہرے سے غائب ہوا تھا۔ ایک پل کے لیے تو اس نے اسے حیران ہو کر دیکھا تھا، وہ مسکراتا ہوا اس کی طرف نرمی سے دیکھ رہا تھا۔

”سکندر۔ کیا واقعی؟ کیا تم سچ میں۔۔۔“

اس کی وہ مخصوص مسکراہٹ اس کے لبوں پر واپس آ چکی تھی۔ وہ خوشی اور حیرانی سے تصدیق چاہنے والے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر سر ہاں میں ہلایا تھا۔

”کیا میرے احسانوں کا بدلہ چکانے کے لیے تم ایسا کر رہے ہو؟“

وہ ایک دم ہی دل گرفتہ سی ہوئی تھی۔ اس نے یہ الفاظ یوں ادا کیے تھے گویا اسے سکندر کے ان لفظوں سے شدید تکلیف پہنچی تھی۔

”تمہارے خلوص اور تمہاری اپنائیت کا بدلہ میں کبھی نہیں چکا سکتا لیذا اور چکانا چاہتا بھی نہیں ہوں۔“

وہ بہت سچائی سے بول رہا تھا۔ وہ اپنے دلی جذبات اور سوچیں کچھ بھی چھپانے کی کوشش کیے بغیر اس وقت اس سے بات کر رہا تھا۔

”پھر؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
”میری آرٹسٹ دوست لیزا محمود کی اگر یہ خواہش ہے کہ وہ میرا چروپینٹ کرے تو میں چاہتا ہوں روم سے واپس جانے سے قبل اس کی یہ خواہش ضرور پوری کر کے جاؤں۔“

وہ مسکرا کر خوش دلی سے بولا تھا۔ وہ اس کے دوسرے ہاتھ پر بھی مرہم لگا چکی تھی۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ! مجھے بالکل بھی یقین نہیں آ رہا سکندر! تم جیسا سڈل مجھے اپنا چروپینٹ کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔ میرے خدایا! انہیں یہ خواب تو نہیں۔“

”لیزا محمود! میرے بارے میں اپنے یہ غیر پارلیمانی الفاظ آپ واپس سمجھتے۔“ وہ اس کی سی ٹون میں گفتگو سے بولا۔

”سڈل کو سڈل ہی کہوں گی ناں۔۔۔ سڈل بد تمیز، بد اخلاق، بے مروت سکندر شہیار صاحب نے مجھے اپنی پینٹنگ بنانے کی اجازت دے دی ہے۔ خدایا اگر یہ خواب ہے تو میں اس سے جاگوں نہ۔“

وہ اپنے لیے اتنے شاندار القاب سن کر قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا۔ لیزا بھی ہنسی تھی۔ اس کی ہنسی دیکھ کر اسے سکون کا احساس ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے جب وہ ناراض تھی، ہنس نہیں رہی تھی سب بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

رات کافی ہو رہی تھی۔ وہ اسے سونے کا کہتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر جانے لگی تھی۔ اس نے لائٹ دوبارہ آف کر دی تھی۔

”میں جاگ ہی ہوئی ہوں سکندر! اسٹوڈیو میں کام کر رہی ہوں، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو مجھے بلا لیتا۔“ وہ وہاں سے جانے کے لیے پلٹی تھی۔ مگر پلٹتے پلٹتے جیسے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

”تم مجھے اپنی دوست سمجھتے ہو سکندر! میں اپنے دوست سکندر شہیار کا خیال رکھ رہی ہوں، اس کی پروا کر رہی ہوں خلوص اور اپنائیت کے ساتھ۔ پھر سے احسان اور نیکی کے لفظ میرے لیے مت بولنا سکندر!

دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔“

وہ بہت سنجیدگی اور آہستگی سے پوچھتی تھی۔ وہ جواباً چپ رہا تھا۔ لیزا کمرے سے چلی گئی تھی۔

صبح ہو گئی تھی۔ اسے دوا لے کر بھی رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ وہ ساری رات جاگتا رہا تھا۔ اسے رات بھر پیر میں کافی تکلیف بھی رہی تھی۔ وہ درد کو نظر انداز کرتا رہا تھا۔ ساری رات جاگ کر صبح ہونے کا انتظار کیا تھا۔ اسے ہسپتال میں اسی سکون اور دوا کے ساتھ رات میں اور پھر دوسری بھی اتنی کھری نیند کس طرح آگئی تھی کل نیند آئی تھی تو آج بھی اتنی چاہیے تھی۔

وہ بیساکھی کے سہارے اٹھ کر ہاتھ روم گیا تھا۔ بیساکھی کے سہارے کھڑے ہونے اور منہ ہاتھ دھونے میں قدرے دقت کا سامنا تھا مگر اپنی چونچوں، تکلیفوں اور زخموں کی اس نے پہلے پروا کب کی تھی جو اب کرتا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو لیزا کمرے میں کھڑی تھی۔

”گڈ مارننگ!“ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ ”ہم سو رہی! میں بغیر اجازت اندر آئی۔ دراصل میں کافی دیر سے دروازہ ناک کر رہی تھی ہم نے کوئی جواب نہیں دیا تو مجھے فکر ہوئی۔“

”تم سوئی نہیں؟“ وہ بیساکھی کے سہارے واپس بیڈ کی طرف جانے لگا۔ لیزا جلدی سے اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی تھی۔ وہ کل کے مقابلے میں تیز تیز قدم اٹھا کر بیڈ تک اس کی مدد کے بغیر ہی پہنچ گیا تھا۔ لیزا نے اسے بیڈ پر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ اسے مدد کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ منع کر کے اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ وہ بیڈ پر ٹانگیں سیدھی پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔

”تھوڑی دیر سو گئی تھی۔ میرا سونا جاگنا تو بس ایسا ہی ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ناشتہ کر کے پھر سے سو جاتی ہوں، کبھی کبھی دل میں لیٹ جاتی ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولی

”نہنی سے میں بول کر آئی ہوں۔ وہ ناشتہ بنا رہی ہے۔“

وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے لوزی سی ٹی شرٹ ہینز کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ بالوں کو کچھ سر میں لپیٹا ہوا تھا۔ وہ دھلے ہوئے منہ کے ساتھ بھی اتنی ہی پیاری لگ رہی تھی جتنی میک اپ کے ساتھ لگا کرتی تھی۔

”رات بھر میں تمہارا ارادہ بدلا تو نہیں ناں؟“ وہ کس حوالے سے یہ سوال پوچھ رہی تھی وہ جانتا تھا۔ ”نہیں۔“ وہ جواباً ”مسکرایا تھا۔“ ”تم نے پینٹنگ بنوائے بغیر میں روم سے واپس نہیں جاؤں گا۔ بس یہ جو ایکسپلنٹ کی وجہ سے تھوڑا میرا آفس کے کاموں کا حرج ہوا ہے، مجھے وہ کام نمٹا لینے دو، پھر ایک دن پورا تمہارے نام ہو گا۔ تم تسلی سے اپنی پینٹنگ بنانا۔“

وہ زندگی کے چند مختصر سے دن یہاں گزار کر واپس چلا جائے گا۔ ایک بار یہاں سے گیا تو زندگی میں اس لڑکی سے دوبارہ بھی ملے گا بھی نہیں۔ وہ ملنا چاہے گا ہی نہیں۔ پھر کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ زندگی کے یہ چند دن اس لڑکی کے خلوص اور دوستی کا جواب خلوص اور دوستی سے دے۔

کچھ دنوں کے لیے اسی اس پیاری لڑکی کا ساتھ پر دس میں اسے زندہ ہونے کا احساس دلا رہا ہے۔ وہ ان دنوں ہنس بھی رہا ہے، باتیں بھی کر رہا ہے، کسی کسی پل خود کو زندہ بھی محسوس کرنے لگتا ہے، وہ بھی بغیر کسی احساس جرم کے۔ اس نے لیزا کے حسین چہرے کی طرف بغور دیکھا تھا۔ یہ لڑکی اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی لیکن نہ تو یہ اسے ملاقاتی نگاہوں سے دیکھتی ہے، نہ دل میں یہ سوچتی ہے کہ سکندر شہیار بڑا ڈھیٹ اور بے غیرت آدمی ہے۔ اسے کوئی حق نہیں ہے زندگی کے ایک بھی لمحے کو انجوائے کرنے کا، مسکرا کر خوش ہونے کا۔

یہ زندگی سے بھرپور لڑکی اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی اور اسے اس کا اپنے بارے میں کچھ

بھی نہ جانتا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ پردیسیوں سے ملنے کا یہی توفانہ ہوتا ہے، آپ ان سے جو آپ نہیں ہیں وہ بن کر مل سکتے ہیں۔ جو کچھ آپ اپنے بارے میں چھپا لیتا چاہتے ہیں یا اسانی چھپا لیتے ہیں۔

اس نے سوچ لیا تھا وہ لیزا ہی کے مشورے پر عمل کرتا رہا میں اپنے باقی دنوں کو رومن ہائی ڈیزیز کی طرح یہ یاد رکھے بغیر گزارے گا کہ وہ سکندر شہزادہ زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح جینے کا کوئی حق نہیں رکھتا کہ وہ تو کب کام چکا ہے، سکندر کیا جا چکا ہے، تختہ دار پر چڑھایا جا چکا ہے۔



ناشتے کے بعد وہ بیڈ پر ہی اپنا بیٹ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ درد اور تکلیف کو خاطر میں لائے بغیر آفس کا کام کر رہا تھا۔ لیزا نے کہا تھا انہیں شام چار بجے ہسپتال جانا تھا وہاں ڈاکٹر کے تفصیلی معائنہ اور پیری بیڈنٹ کو وغیرہ کی تبدیلی میں بجائے کتنا وقت لگنا تھا اسی لیے وہ چاہتا تھا آج آفس ٹائم ختم ہونے سے قبل جو زیادہ اہم اور فوری کیے جانے والے کام ہیں وہ نمٹا کر ڈاکو منٹن آفس ای میل کر دے۔ لیزا ناشتے کے بعد اسے دوا اور اس کا بیٹ ٹاپ دے کر کمرے سے چلی گئی تھی۔ اسے وقتاً فوقتاً باہر سے لیزا اور اس کی نینی کے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

”لیزا! نچ میں کیا باتوں؟“ اس نے نینی کی آواز سنی۔ جواب میں لیزا کی آواز آئی تھی۔

”میں سکندر سے پوچھ رہی ہوں نینی! فوراً ہی کمرے کا دروازہ ہلکے سے چھتکتا کر لیزا اندر آئی تھی۔ ”جو ڈش تمہیں پسند ہے وہی، بنو الو۔ میں بھی وہی کھاؤں گا۔“

وہ اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بولا تھا۔ وہ جواباً مسکرائی تھی۔

”کان بڑے تیز ہیں تمہارے۔“ وہ اندر آکر اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”کچھ خاص ڈش کھانے کا دل چاہ رہا ہے تو بتا دو۔“ نینی کھانے بہت مزے کے بناتی ہیں چاہے وہ پاکستانی ہوں، چاہے اٹالین یا جاپانیز۔“

ابھی وہ جواباً ”کچھ بولا بھی نہیں تھا کہ اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ موبائل اٹھانے کے لیے اسے اپنی جگہ سے تھوڑا ہلنا پڑنا پڑا فوراً ہی اسے موبائل اٹھا کر دے دیا تھا۔ موبائل پر چمکتے نام کو دیکھ کر اس نے لیزا کی طرف دیکھا تھا۔ وہ یہ کال لیزا کے سامنے ریسیو نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یہ ڈاکٹر آمنہ شہزاد خان کی کال تھی اس کی امو جان۔ ماں سے بات کرتے ہوئے جس طرح کے جذبات اس کے چہرے پر آجائے تھے وہ انہیں لیزا کے سامنے عیاں کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا، مگر لیزا جیسے اس کے بغیر کبھی یہ بات سمجھ گئی تھی کہ وہ اس کال کو ریسیو کرنے کے لیے تھمائی چاہتا ہے سو فوراً ہی کرسی پر اٹھ گئی۔

”تم کال ریسیو کرو۔ میں نینی کو کھانے کا کہہ آؤں۔“

لیزا کمرے سے چلی گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کی تھی۔

”السلام علیکم امو جان!“ اس کا لہجہ سنجیدہ تھا، مگر اس سنجیدگی میں بھی اس میں بہت سے جذبات شامل تھے۔

”وعلیکم السلام۔ کسے ہو سکندر؟“ بیشہ کی طرح ان کا لہجہ نرم اور مہربان تھا۔ وہ بیٹے کی جدائی سے ہلکان ہیں یہ تاثر لیا غم میں ڈوبا انداز تھا ان کا۔ اس کے چہرے پر دکھ اور کرب ابھر آیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں امو جان!“ اپنے ایک سیٹلٹ کے متعلق انہیں کچھ بھی بتائے بغیر اس نے آہستگی سے اپنی خیریت سے متعلق اطمینان دلایا تھا۔

”ابھی روم ہی میں ہو؟“

”جی امو جان!“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ ”آفس کے کاموں کے ساتھ ساتھ کچھ گھوم پھر بھی رہے ہو کہ نہیں؟ ہر طرف تمہاری فیورٹ

ہسٹری بکھری ہوگی روم میں۔“ وہ شگفتگی سے بولی تھیں۔ وہ جواباً ”اویسی سے مسکرایا تھا۔

وہ انہیں یہ نہیں کہہ سکا تھا کہ ہسٹری آرٹ لیزا پر اب اسے کوئی چیز مسخود نہیں کرتی۔ جس سکندر کو وہ جانتی تھیں وہ اب وہ سکندر نہیں ہے۔

”جی اکانی گھوم پھر رہا ہوں۔“ وہ لہجے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرنا ہوا بولا تھا۔

”پتا ہے سکندر! شادی کے دو ماہ بعد میں اور تمہارے پاپا اٹلی، اسپین اور فرانس گھومنے گئے تھے۔ ہم روم ہی میں تھے جب مجھے یہ خوش خبری ملی تھی کہ میں ماں بننے والی ہوں، تم میری زندگی میں آنے والے ہو۔“

کیا اس کا اپنے ماں، باپ کی زندگی میں آنا خوش خبری تھا؟ اس کے دل میں ایک ہو کہ سی اٹھی تھی۔ ”شاید اسی لیے روم مجھے اتنا فہمینٹ کرتا ہے امو جان!“

اپنے دل میں بکھرتے درد کو نظر انداز کر کے وہ مسکرا کر بولا تھا۔ آمنہ دھیمے سُر میں ہنسی تھیں۔ اسے بہت سی چیزیں اور بہت سی باتوں کے لیے قصور وار ماننے کے باوجود ان کی بات سنانے اس سے محبت کرنا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے دل کے زخم جیسے پھر سے تازہ ہو رہے تھے۔ وہ اپنے وجود کو شعلوں کی لیپٹ میں پارہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کانٹوں پر گھسیٹا جا رہا ہے۔

”چھٹیاں ملیں تو گھر آؤ ناں بیٹا!“ ایک دکھ بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری، جیسے خود پر بھی نہیں بلکہ اپنی ماں کی بے بسی پر اسے ترس آیا ہو۔

”جی امو جان! موقع ملا تو آؤں گا۔“ وہ سچ بول کر ماں کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ وہ بھی جانتی ہیں کہ وہ وہاں بھی نہیں آئے گا اور وہ وعدہ کرنے والا بھی جانتا ہے کہ اس نے وہاں کبھی نہیں جانا، پھر لفظوں سے یہ بات کہی جانی، دل دکھانا جانا ضروری تو نہیں؟

جواب میں آمنہ بالکل چپ ہو گئی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہیں بولی تھیں۔ وہ ان کا بیٹا تھا، ان کے وجود کا حصہ، کیسے نہ جان پانا یہ بات کہ وہ اس وقت روم ہی تھیں۔

ماں کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گر رہے تھے۔ وہ خود کو درد اور تکلیف کی انتہاؤں پر محسوس کرتا بالکل خاموش تھا۔ اس کی اپنی ماں سے بیشہ ایسی ہی بات ہوتی تھی۔ چند منٹوں کی مختصر سی بات، جس میں وہ دونوں ایک دوسرے سے وہ کبھی بھی نہیں کہہ پاتے تھے جو کہنا چاہتے تھے۔

”آپ اپنا خیال تو رکھ رہی ہیں ناں امو جان! میڈیسن کتنی پھوڑی تو نہیں ناں؟“

”ماں بیٹا میں اپنا خیال رکھ رہی ہوں۔ تم بھی اپنا خیال رکھ رہے ہو کہ نہیں؟“ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکی تھیں۔ وہ اب اسی نرم اور محبت بھرے لہجے میں اس سے مخاطب تھیں۔

”آپ میری بالکل فکر نہ کریں امو جان! میں اٹلی آ کر تو کچھ زیادہ ہی کھاتی رہا ہوں۔ کل آفس کے بعد کا سارا ٹائم میں نے روم گھومتے ہوئے گزارا تھا، آج بھی آفس کے بعد کا ٹائم روم کی ہسٹری میں گم ہو کر گھومتے پھرتے ہوئے گزاروں گا۔“

وہ ہنستے مسکراتے انداز میں جھوٹ پر جھوٹ بولتا ماں کو اپنی زندگی کے بہت نارمل اور بہت خوشگوار ہونے کا یقین دلانا تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ۔“ ”آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا امو جان! اللہ حافظ۔“ اس نے مسکرا کر بولتے ہوئے فون بند کیا تھا۔

فون بند کرتے ہی اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں کی سطح سلی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو چھوا تو آنکھ سے گرنا آنسو اس کے ہاتھ پر ٹکڑ ٹکڑ گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عافی لڑکی

”آج کل کے لڑکوں کا پتا نہیں کیا مسئلہ ہے، ادھر متنی ہوئی نہیں، ادھر رابطہ کے لیے بے چین۔“ عافیہ کی جھلائی ہوئی آواز پہ بچیہ نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیوں بھئی کیا ہو گیا؟“

”اب ہمارے منگیتر کو ہی لے لیں، جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں منگتی کو“ اور ہونے شروع دو چار دن سے گھر کے پیلی سی ایل پر فون کر رہے ہیں، کیا گری ہو؟ ٹھیک تو ہو؟ پڑھائی پسی جاری ہے؟ تمہارے پاس سیل فون ہے؟ نہیں ہے تو میں دلا دوں؟ میں چاہتا ہوں ہم دونوں ہر وقت رابطہ میں رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”پھر تم نے دیا انہیں اپنا سیل فون نمبر؟“ بچیہ کو تجسس ہوا۔

”لو بھلا میں پاگل ہوں جو انہیں اپنا سیل فون نمبر دے دوں گی۔“ مجھے کیا ضرورت ہے شادی سے پہلے رابطہ بدھانے کی۔ میں نے ٹو فٹ سے منع کر دیا کہ میرے پاس سیل فون ہے ہی نہیں اور نہ ہی میں یہ مصیبت پٹانے کا شوق رکھتی ہوں۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”بہت غلط کیا بار! تمہیں یوں بے رحمی نہیں اختیار کرنی چاہیے، وہ کوئی ایریا غیر انہیں تمہارا منگیتر ہے۔ پھر یہ رابطہ تو ایک بہانہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو جاننے کا، سمجھنے کا۔“ بچیہ نے اس کے منگیتر کی حمایت کی۔

”بار! میں اس جاننے اور سمجھنے کی لالچ (فلسفہ) کو نہیں سمجھ پاتی۔ جب پوری زندگی بڑی ہے تو پھر وقت سے پہلے نزدیکیاں بدھانے کی کیا تنگ ہے؟

رات کو سونے کے لیے جوں ہی عافیہ اپنے کمرے میں آئی۔ حسب معمول سب سے پہلے اسے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ اس نے بستر پہ لیٹ کے تکیے کے نیچے سے اپنا سیل فون نکالا۔

روزانہ کی طرح آج بھی بے شمار ایس ایم ایس آئے ہوئے تھے۔ اس نے ان پکس کھولا۔ یوں تو بہت سے نمبرز سے ایس ایم ایس آئے ہوئے تھے لیکن اس نے بطور خاص مدر اور آفاق کے ایس ایم ایس چیک کیے۔“

مدر سلت، ہمنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ بہت باتوں اور ہوشیار اس کی بے شمار لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن

”عافیہ! تم سے بات کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“

بچیہ عافیہ کو اس پر ترس آتا اور کبھی ہنسی۔ آخر دنیا کے سب مردوں کو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے عورت کی ہی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ وہ اپنے دکھڑے اپنے دوست حضرات سے بھی تو بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن نہیں ان کا نشانہ عورت ہی ہوتی ہے۔ شاید وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ عورت دنیا کی سب سے بے وقوف شے ہے۔ سواس کا فائدہ ہم کیوں نہ اٹھائیں۔

”ہو نہ! بے وقوف تو خود میرے ہاتھوں بنے جا رہے ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں ہے کہ جس کے ساتھ وہ اپنا حال دل بیان کر رہے ہیں، وہ تنہائی میں ان پر کتنا ہنسی ہے۔“ وہ بھی کھی کرنے لگی۔

پھر اچانک ہی اسے دانیال کا خیال آیا۔ وہ بھی تو مرد ہے، خوب صورت ہے، پینڈ سم ہے اس کی زندگی میں بھی کئی طرح کے دکھڑے ہوں گے۔ جنہیں شیئر کرنے کے لیے اسے ”فرینڈز“ کی ضرورت پڑی ہوگی۔



دنیا کے ہر مرد کی طرح اس نے بھی عورت کو بے وقوف سمجھنے کی غلطی کی ہوگی۔ کیوں نہ ان محترم کا بھی امتحان لیا جائے؟ یہ کیسے تو جناب کس مزاج کے ہیں۔ عافیہ کو یاد تھا، دانیال نے کئی مرتبہ اپنے سیل فون سے اسے فون کیا تھا۔ آئی پہ اس کا نمبر دیکھ کر ڈائری میں محفوظ کر لیا تھا۔

اس نے ڈائری نکالی اور اس میں نمبر نوٹ کر کے اس پر ایس ایم ایس کیا۔
”ہائے۔“

”فون ہاتھ میں لیے وہ جواب کا انتظار کرنے لگی“ لیکن کافی دیر تک جواب نہیں آیا تو اس نے پھر ایس ایم ایس کیا۔
”ہیلو۔“ کچھ توقف کے بعد جواب آیا۔

”جی کون؟“

”انسان۔“

”وہ تو میں جانتا ہوں“ سیل فون کا استعمال انسان ہی کر سکتا۔ جانور یا جن بھوت نہیں۔“ اعتماد قابل دید تھا۔

وہ بھی پھر پوچھا۔

”کیا نام ہے آپ کا؟“

”نام جان کر کیا کریں گے؟“ عجیب سے انداز میں پوچھا گیا۔

”دوستی۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”جان پہچان۔“

”جان پہچان بنانے کا فائدہ؟“

”ضروری تو نہیں ہر کام میں فائدہ دیکھا جائے؟“ عافیہ نے اعتراض کیا۔

”بنا فائدے کے تو اس دنیا میں کوئی کام نہیں ہوتا۔“

”اچھا چھوڑیں رہنے دیں، مت بتائیں اپنا نام۔“
”خیر، ایسی بھی بات نہیں سمجھے دانیال کہتے ہیں۔“
”کہا کرتے ہیں؟“

”بڑکس۔“

”اوہ! اینڈ لارڈ قسم کے بندے ہیں آپ تو؟“
”عام بندہ ہوں، محنت کرنے والا۔“ سادہ جواب دیا۔

”آپ کا اشار؟“

”Libra (میرا)“

”اور باپ؟“

”فارغ وقت مل جائے تو اسنو کرکلب چلا جاتا ہوں کھیلنے کے لیے۔“

”پس بندہ کھانا؟“

”برائی۔“

”پس بندہ مووی؟“

”کوئی خاص نہیں۔“

”میرے بارے میں آپ کی رائے؟“

”آپ کے بارے میں تو میں جانتا ہی نہیں، حتیٰ کہ آپ کا نام بھی نہیں، پھر آپ کے بارے میں رائے کیسے دے سکتا ہوں۔“

”میرا نام علینہ ہے۔“ اس نے غلط بیانی کی۔

”اوہ تو آپ لڑکی ہیں؟“

”تو آپ انجی تک کیا سمجھ رہے تھے؟“

”کچھ جی اندازہ نہیں تھا۔“ اس نے صفائی سے کہا۔

”اب تو دنیا کے تمام مردوں کی طرح آپ کو بھی یہ ہی لگ رہا ہوگا کہ تمام لڑکیاں تقی فضول اور بے وقوف ہوتی ہیں۔“

”پتا نہیں، میں نے ایسا نہیں سوچا۔ ہاں مگر ایک بات میں جانتا ہوں، ان کے پاس فضول کاموں کے لیے بہت وقت ہوتا ہے۔“

”یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ؟“ عافیہ کو جھکا لگا۔ وہ ہی عام مرد عام سوچ رکھنے والا۔

”اپنے آپ کو ہی دیکھ لیجئے، آپ مجھے نہیں جانتیں، نہ یہ جانتی ہیں کہ میں کیسا آدمی ہوں، اچھا ہوں یا بُرا ہوں، پھر بھی اپنے پرسل فون سے مجھے ایس

ایم ایس کر رہی ہیں۔ یہ سوچنے بغیر کہ میں آپ کے نمبر کو غلط طریقے سے بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ میرے کچھ غلط قسم کے دوست بھی ہو سکتے ہیں۔ میں انہیں آپ کا نمبر دے کر آپ کو پریشان بھی کر سکتا ہوں۔ مگر آپ نے کچھ نہیں سوچا۔ جسے آپ جانتی نہیں اسے دوست کی آفر دے کر آپ اپنا وقت ہی تو برباد کر رہی ہیں، ایک فضول سے کام لے لے۔“ اس نے ایک لمبی تقریر کر دی۔

”منا کہ یہ فضول کام ہے، لیکن لڑکے بھی تو یہ ہی کرتے ہیں۔“ اس نے منبطل کے جواب دیا۔

”سب نہیں کرتے ہوں گے۔“ فوراً جواب آیا۔

”آپ کو نہیں پتا۔“

”آپ کو بہت پتا ہے۔“ شاید مذاق اڑایا گیا تھا۔

”ہاں، آپ سے زیادہ ہی پتا ہے۔“ اس نے جل کر جواب لکھا۔

”کیوں آپ کے پاس اور کوئی کام نہیں ہے؟“ اس نے عافیہ کو لا جواب کر دیا۔

”میرے کام سے آپ کو کوئی مطلب نہیں ہوتا چاہیے۔“

”اُپر پووش۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ دوبارہ کوئی ایس ایم ایس نہیں آیا۔

”اچھا ایک بات پوچھوں آپ سے مشر دانیال!“ کچھ سوچ کر عافیہ نے دوبارہ ایس ایم ایس کیا۔

”جی ضرور۔“

”کیا آپ میوز (شاری شدہ) ہیں؟“

”No۔“ صحیح جواب آیا۔

”انجی جلد ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”ہم م۔ اب سمجھ میں آیا۔“ عافیہ نے مسکراتے ہوئے لکھا۔

”کیا؟“

”یہ ہی کہ آپ کو اپنی منگیت سے ہی بات کرنے سے فرصت نہیں ہوئی تو بھلا کسی اور سے دوستی کیوں کریں گے؟“ عافیہ دلچسپی سے اس کے جواب کا انتظار کرنے

لگی۔

”غلط فہمی ہے آپ کی۔“

”غلط فہمی؟“ عافیہ چونکی۔

”کیونکہ میری منگیت تو آپ جیسی لڑکیوں کی طرح ان فضول کاموں سے دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بہت سمجھ دار اور نیک لڑکی ہے۔ اس کے خیالات کا مقابلہ تو دنیا کی کوئی لڑکی نہیں کر سکتی۔ آپ کو یہ جان کر حیرت تو ہوگی مگر یہ بالکل سچ ہے کہ اس کے پاس سیل فون بھی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ موبائل افرورڈ نہیں کر سکتی۔ یا پھر گھر والوں کی طرف سے اس پر کوئی پابندی ہے۔ بلکہ اس نے خود اپنی مرضی سے چھینٹ نہیں پالا۔ یہاں تک کہ منگنی کے بعد بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ حالانکہ میں نے اصرار بھی کیا کہ میں رابطے میں رہنا چاہتا ہوں لیکن اس نے صاف منع کر دیا۔ اگرچہ مجھے برا لگا تھا، لیکن پھر یہ سوچ کر بہت فخر محسوس ہوا کہ جو لڑکی میری شریک سفر بننے جا رہی ہے وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔“

دانیال کا میسج مکمل ہوتے ہی عافیہ کو یوں لگا جیسے وہ پتال میں گر گئی ہو۔
”چھلے دو سال سے اس کے پاس سیل فون تھا۔ ان دو سالوں کے اندر اس کے نمبر پر کتنے ہی انجی نمبرز سے کال اور ایس ایم ایس آتے رہے تھے۔ وہ کال ریسپو نہیں کرتی تھی البتہ ایس ایم ایس کے جواب دے دیتی تھی۔“

اس کے ذہن میں کئی نام ابھرے۔ اسد، بلال، مدثر، آفاق۔ جن سے اس نے موبائل پر لمبی لمبی چیٹ کی تھی۔ اس کے باوجود وہ دعا کرتی تھی کہ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں۔

آئینہ سامنے تھا اور وہ خود سے نظریں نہیں ملایا رہی تھی۔ شرم سے اس کا سر جھک گیا اور اس نے چپکے سے اعتراف کیا۔

”ہاں میں ایک عام سی لڑکی ہوں۔“

اور پھر عہد کیا۔

”مگر اپنے منگیت کے لیے مجھے خاص بننا ہے۔“



لڑکی باد صبا کے کسی مہکتے ہوئے جھونکے کی طرح
ان کے برابر سے گزر کر جا چکی تھی اور مسعودیت بنا
ابھی تک اسے دیکھے جا رہا تھا۔
”کیسی ہے؟“ جازی نے رائے چاہی۔
”زبردست!“ مسعود بے ساختہ بولا۔ ”جیسا سنا تھا“
ویسا ہی پایا۔ مگر رالفٹ ملنے کے چانسز ہیں؟“
”ہم جیسوں کے لیے تو نہیں۔“ جازی نے مایوسی
سے شانے اچکائے اس کا تجربہ خاصا تلخ رہا تھا۔ لڑکی
نے سدرے منہ بات کرنا ہی گوارا نہ کیا تھا۔ ورنہ ایسی
شرمیلی بو بوسہ دکھائی نہ دیتی تھی کہ رادہ جلتے کسی لڑکے
سے بات کرنے میں ہچکچائے۔ جدید تراش کے لباس
میں تک سب سے تیساری ایک ایسی متوالی چال کے

ساتھ چلتی تھی جو خود بخود ہوتی ہو کہ آؤ مجھے کھو جو تپ سی
تو جازی کا حوصلہ بھی برصا تھا۔
”البتہ تم ثرائی کر سکتے ہو۔“ اس نے مزید کہا۔
زہیر نے مسعود کا اتنا دانہ جائزہ لیا۔ ”مگر اپنا یہ حلیہ
ذرا ٹھیک ٹھاک کر کے۔ ورنہ وہ تمہیں بھی ہماری
کیہ شگرتی میں شامل کر کے بہ یک جنبش قلم ریجیو کٹ
کر ڈالے گی۔“
”کرتی رہے۔ اسے مجھے قبول کرنا ہو گا۔ جیسا کہ
میں ہوں۔ میرے بیک گراؤنڈ کو نہیں یا رو! تم تو اچھی
طرح جانتے ہو مجھے اس طرح کی باتوں سے کوئی دلچسپی
نہیں۔ میں خود پر کسی قسم کی پالش کو اپنی توہین سمجھوں
گا اور یوں بھی اچھا خاصا شریف دکھائی دیتا ہوں، کوئی

نگاہ لٹ



لفنگا نہیں۔“

وہ تینوں اتنے برائے اور گہرے دوست تھے کہ یک جان تین قالب لگے جاسکتے تھے اور مسعود تو ایک کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے تھا۔ ایک بے انتہا نامور اور باثروت خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ باپ دادا کی بے انتہا زمین و جائیداد کے باوجود اس میں ذرہ بھر بھی تو غور نہ تھا۔ وہ انتہائی سادگی پسند بے تکلف اور برخلوص تھا۔ ہر قسم کے تکلفات سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ حالانکہ اس کے جازبی اور زہیر کے اسٹیشن، میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مگر مسعود نے

کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا تھا کہ وہ کسی بھی طرح ان سے منفرد اور مختلف ہے۔ وہ ان ہی کی طرح اوڑھتا پہنتا۔ ان ہی کی طرح کھانا پیتا تھا۔ ان ہی کی طرح اس نے اپنے تصرف میں ایک پھینچری موٹر سائیکل رکھی تھی جو تینوں کے اکثر دنوں میں مرمت کے لیے کسی نہ کسی موٹر گرانج میں رہتی تھی اور وہ تینوں پیدل مارچ کرتے دکھائی دیتے تھے۔

مسعود اپنے خراسان محل نما آبائی مکان کی بناوٹی زندگی سے سخت بھڑاتا تھا۔ وہاں اس کا دم گھٹتا تھا۔ جتنے دنوں وہ وہاں رہتا سخت بے آرام اور اکتاہٹا ہوا رہتا تھا اور پھر جیسے رستہ ترا کر پائل بھاگ آتا تھا۔ یہاں پھر وہی یاد دوستوں کی خوش گپیاں، ہنسی قہقہے ہوتے۔ ہمارے ہمارے سرزمین نالی جاتیں۔ ایک دوسرے کو اپنی غرورت اور مفلسی کے دکھائے سنائے جاتے۔ اکثر تو جھوٹے سچے دردناک نقشے مینچ کر کسی نہ کسی سے ادھار اگلوایا جاتا اور خوب عیش اڑائے جاتے تھے۔

مسعود کو ان کے درمیان دلچہ کر کوئی کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ لمبی چوڑی جاکیر کے مالک ملک حجاج محمد کا نازول پلا اگلو تاپتا ہے۔

وہ تینوں دوست آوارہ اور بگڑے ہوئے تو ہرگز نہیں تھے۔ مگر ایسے کوئی زاہد خشک بھی نہ تھے کہ دنیا کے حسن و رعنائی سے منہ ہی موڑ لیں۔ بلکہ پچھلے

افسوس اور چند چٹکارے دار قہصے سرا سر جازب قرار دیتے جاتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ کوئی بھی معاملہ کبھی سنجیدگی کی حدود تک نہ پہنچتا تھا۔ کیونکہ فی الحال زندگی میں ایسی سنجیدگی کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ ابھی تو وہ مخلص طالب علم تھے۔ عملی زندگی کا میدان کوسوں دور بڑھتا تھا۔ ابھی تو زمین پر قدم جمائے کے لیے ایک مدت درکار تھی۔ بس جو چکر چلنا تک خوش اسلوبی سے چلنا چلنے دیا جاتا۔ کئی ایک جگہ سے تو خیالی جب ہونے کے انکشاف پر منہ کی بھی کھائی پڑتی تھی۔ زہیر اور جازبی پھر خوب آنسو بہاتے تھے کہ دنیا بڑی لالچی اور لڑکیاں بڑی مفاد پرست ہو چلی ہیں۔ ایسے میں مسعود بصد خلوص ان کے آنسو پونچھا کرتا تھا۔

پچھلے ہفتے اتفاقاً کوئی لڑکی جازبی سے ٹکرائی تھی اور وہ اس کی چال پر مرعنا تھا۔ لڑکی نے جب مڑکر صلواتیں سنائی شروع کیں تو وہ اس کی من موہنی صورت پر بھی عاشق ہو گیا اور بقول زہیر کے دیدے پٹ پٹانے ہوئے اس کی مغالطات یوں سناتا رہا۔ جیسے لڑکی کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔

مسعود کی ذاتی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس تاریخی موقع سے محروم رہ گیا۔ دراصل جازبی کو اپنی چرب زبانی اپنی دلکش مسکراہٹ اور اپنی نگاہوں کے تیروں پر برطانز تھا۔ لڑکیاں بہت کم اس سے بے رُخی برتی تھیں۔ زہیر کو لگا سا تھا اور اس نے بے ڈھنگے انداز و اطوار کی بنا پر بار بار ایسی پچویشن سے گزر چکا تھا۔

بعد میں جازبی اس کی خوب ہنسی اڑاتا تھا۔ زہیر کو پہلی بار اس کا ریکارڈ لگانے کا موقع ملا تھا۔ وہ تو خوشی سے اچھل اچھل پڑا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ تماشا ساری دنیا دیکھے۔ اسے اس تماشا کے کا کوئی تیسرا گواہ تک نہ مل سکا۔ حتیٰ کہ مسعود تک موقع پر موجود نہ تھا۔ بہر حال ہفتے بھر سے لڑکی کے حسن اس کی چال و حال اور اس کی تیزی طراری کے قہصے سن سن کر مسعود کے کان پک چکے تھے۔ اتفاق یہ ہوا تھا کہ اتنے

دنوں تک سامنا ہونے کی نوبت ہی نہ آسکی۔ دراصل اپنے باپ کی بیماری کی وجہ سے وہ ان دنوں زمین کے کسی مقدمے کے سلسلے میں پیشیاں بگھٹانے میں مصروف رہا۔ آج بالآخر سامنا ہوا تو بے اختیار جازبی کی تعریفوں کی تائید کرنی پڑی۔

وقت ضائع کرنے کا تو وہ قائل ہی نہیں تھا۔ ”اجازت ہے؟“ اس نے جازبی سے پوچھا۔ ”سویار اجازت۔“ جازبی کو دوبارہ گالیاں سننے کا کوئی شوق نہ تھا۔ یوں بھی وہ زبردستی کا قائل نہ تھا جب لڑکی نے پہلی بار اسے درخور اعتناء نہ سمجھا تو وہ کیوں خواجواہ گلے کا ہار بننا۔ آخر اس کی بھی تو کوئی عزت نفس تھی۔ وہ تو صرف مسعود سے اپنے ذوق انتخاب کی داد چاہ رہا تھا۔ اب اگر مسعود کو خود سے تنہا مل جائے گا تو کاشوق چڑھا تو وہ کیا کرتا۔

مسعود ایک ہاتھ سے بال سنوارتا کالر اٹھائے۔ ایک اوائے بے نیازی سے آگے بڑھا۔ ”خیال کرنا۔ زبان چلاتا تو خوب جانتی ہے۔ کہیں ہاتھ نہ چلا بیٹھیں۔“ زہیر نے پیچھے سے داد دلایا۔ مسعود نے لا روایتی سے اونہ کہہ کر گردن جھٹک ڈالی۔ لباس اس کا لاکھ معمولی سی یہ بات لا شعوری طور پر اس کی خود اعتمادی بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی تھی کہ وہ ایک ریسمانہ پس منظر رکھتا ہے۔ وہ اپنی امارت کا کبھی شو آف کرتا تو نہیں تھا مگر پھر بھی غیر ارادی طور پر زہیر اور جازبی اندر ہی اندر ایک قسم کے احساس کمتری کا شکار رہتے تھے۔

اگر مسعود جاکیر کا بیٹا نہ ہوتا تو اس کی چال میں اتنا اعتماد اور اس کی گردن میں اتنا تناؤ کبھی نہ ہوتا۔ اس کی فائدا بینی ثروت اور وجاہت تو اس کی اوچٹی پیشانی سے چمکتی تھی۔ اس وقت بھی ان ہی کی طرح تھسی ہوئی جینیز اور معمولی سی شرٹ میں ملبوس ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ کی طرح ان کے درمیان نمایاں تھا۔

مسعود لڑکی تک پہنچ چکا تھا۔ بلکہ اسے مخاطب بھی کر چکا تھا۔ لڑکی ارک گا۔ مڑکر مسعود کو دیکھنے لگی اور

ادھر ان دنوں کے دل دھڑکتا بھول گئے۔ مسعود نے جھک کر زمین پر سے کوئی ٹپٹھا کر لڑکی کی طرف بڑھائی پھر لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر جازبی اور زہیر کی ہونٹی سانسیں بحال ہو گئیں۔ ورنہ وہ تو کرج چمک کے منتظر تھے مگر لڑکی نے صرف مسکرائی بلکہ اچھی خاصی ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے غالباً ”شکریہ“ کا لفظ ادا کرتے ہوئے مسعود کے ہاتھوں سے وہ شے لے لی۔ چند جملوں کا تبادلہ ہوا اور لڑکی اتراتی بل کھاتی اپنی راہ پر گامزن ہو گئی۔ مسعود نے پلٹ کر انہیں کامیابی کا علامتی انگوٹھا دکھایا اور ان سے اٹھا۔

”ایسا کیا جادو پھونک ڈالا؟“ جازبی اس کی دلفریب مسکراہٹ پر جل کر خاک ہوا جا رہا تھا۔ ”اور وہ کیا رشوت دی گئی تھی۔ کیا اس کا لوگ گواچا تھا؟“ زہیر بھی کچھ کم حیران پریشان نہ تھا۔ جہاں جازبی کی پرستائی اور ڈانٹ لگ بازی کلام نہ دکھا سکی وہاں مسعود نے منٹوں میں کام کر دکھایا تھا۔

مسعود خوب اترا ہوا تھا۔ ”کچھ بھی نہیں تھا۔ بس اپنے بار کی قربانی دینی پڑی۔ لفٹ حاصل کرنے کا پرانا نسخہ۔“ ”وہ تمہارا قیمتی قلم؟“ زہیر نے آنکھیں پھیلانیں۔ ”اس کی مسکراہٹ سے زیادہ قیمتی تو نہ تھا۔“ مسعود پر اس مسکراہٹ کا نشہ طاری تھا۔

”یاد رہے، محترمہ خیر سے بڑی جھوٹی اور حریص بھی ہیں۔ یعنی کہ اتنی ڈھٹائی سے پرانی شے پر اپنا دعوا کر لیا۔ مزے سے مسکرا کر رکھ لیا۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے، کس طبیعت کی لڑکی ہوگی۔“ جازبی حسد کا شکار تھا۔ ”کسی بھی طبیعت کی ہو۔ مجھے اس کی بچی ادا تو پسند آئی۔ حسن اپنا خراج تولیٹا ہی ہے۔ ویسے ایک لمحے کے لیے تو میں بھی حیران رہ گیا جب اس نے شکریہ کے ساتھ قلم پرس میں رکھ لیا۔“ مسعود ہنس پڑا۔ ”شکریہ کے علاوہ اور بھی تو باتیں ہوتی تھیں۔“

جازی کے دل میں کھد کھدی ہوئی تھی۔

”ہاں۔ یونہی ذرا سا تعارف ہوا تھا۔ روشنا نام ہے یہاں قریب ہی کلج میں پڑھتی ہے۔ اب تو روزی ملاقات ہوئی۔“

”لگتا ہے پار کر کے ساتھ تمہارا دل بھی پار کر گئی ہے۔“ زہیر نے مسعود کی بے تابی و بے خودی دیکھ کر بھروسہ کیا۔

”شاید۔“ مسعود کہیں کھو گیا۔

شاید نہیں یقیناً ہی ایسا ہوا تھا۔ مسعود پھر روزانہ ہی روشنا کی راہ میں کھڑا ہونے لگا۔ جازی اور زہیر کو لازماً اس کا ساتھ دینا پڑا تھا۔ تعارف کے مراحل طے ہونے کے بعد بے تکلفی بڑھتی چلی گئی۔ روشنا سیدے پہل تو مسکراہٹیں اچھاتی رہی۔ رسمی دعا سلام بھی ہوتی رہی، پھر بے تکلفی بڑھی تو ملاقاتوں کی نوبت آگئی۔ وہ ہنس ہنس کر ان سے کہتی تھی کہ وہ پہلی نظر میں ہی سمجھ گئی تھی کہ موصوف لفت لینے کے چکر میں ہیں اور پرانا گھسا پٹا نسخہ آزمائے ہیں۔ پھر یہ کہ کچھ تو لڑکا خود اس کے دل کو بھی بھائی تھا۔ اور کچھ اس نے اسے سبق دینے کا سوچا اس لیے بلا تامل قلم رکھ لیا۔“

مسعود جھینپ جاتا تھا۔

روشنا نے جازی سے یہ بھی کہا تھا کہ اس کی صورت اسے کچھ دیکھی بھالی لگتی ہے۔ وہ تینوں فوراً ہی آئیں بائیں شائیں کر کے بات گھبرا گئے یہ تو شکر تھا کہ روشنا کی یادداشت اتنی اچھی نہ تھی۔

ویسے اس کا اصل نام تو روشنا تھا۔ کلج میں بھی یہی نام درج تھا مگر اسے اپنے اس فرسودہ نام سے چڑھی۔ اس لیے اس نے خود ہی اپنا نام روشنا رکھ ڈالا تھا۔ اسے اپنے گھر کا فرسودہ ماحول بھی پسند نہ تھا۔ اس کا تعلق ایک متوسط اور روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مگر اسے اپنے گھر کی گھٹی گھٹی فضا سخت ناپسند تھی۔ وہ پرانی روایات سے بغاوت کرنا چاہتی تھی اور مسعود بھی

اپنے گھر کے ماحول سے فرار چاہتا تھا۔ شاید یہی قدر مشترک تھی جو ان دونوں کو اتنی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب لانے کا باعث بنی۔ ویسے روشنا ابھی تک مسعود کی حقیقت سے ناواقف تھی۔ وہ ابھی تک مسعود کو ایک عام سے گھرانے کا لڑکا سمجھتی تھی اور اسی بنا پر اس سے بلا جھجک ملتی جلتی تھی۔

رفتہ رفتہ جازی اور زہیر نے خود کو ان دونوں کے درمیان کباب میں بڑی سمجھنا شروع کر دیا حتیٰ خیز جملوں کا تبادلہ والمانہ نگاہوں کا تصادم۔ مسعود کی پرشوق گفتگو، روشنا کی شرارتیں ان سب کے درمیان وہ اپنے آپ کو سخت گلو سمجھتے انہوں نے غیر محسوس طور پر ان دونوں کی کمپنی میں گھسنے سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ مسعود نے جب یہ اندازہ لگایا تو وہ ان دونوں خوب جھگڑا۔

”تم دونوں مجھ سے کوئی الگ تھوڑی ہی ہو۔ یا رو! میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں۔“

”تم روشنا کے بغیر بھی ادھورے ہو اور جب ہم سب ملیں گے تم مکمل ہونے کے بجائے بڑھ ہو جاؤ گے اور زیادتی کسی بھی شے کی خراب ہوتی ہے۔“

بونگے سے زہیر نے فلسفیانہ انداز میں سمجھایا۔

”ہر شے کا اپنا اپنا مقام ہے۔ دوست محبوبہ کی اور محبوبہ دوست کی جگہ نہیں لے سکتی۔ ہم لوگ جہاں مرس فٹ ہو جائیں وہاں ہمیں زبردستی نہیں گھسنا چاہیے۔“ جازی نے کہا۔

”تمہارا خیال ہے کہ تم دونوں تمنا زیادہ جیتے ہو۔ دوستی الگ اور محبت الگ بھائی جاتی ہے۔“ یوں مسعود کا وقت ان سب کے درمیان ہٹ گیا۔ بہر حال وہ اب بھی اس کی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی محبت سے اسی طرح واقف تھے۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ مسعود اس عے عشق میں سر تپا غرق ہو چلا ہے۔ اس کی توجہ پڑھائی کی طرف سے بھی ہتی جارہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ان کے درمیان ہوتا ہوا بھی

اس کے حواسوں پر روشناسوار رہتی تھی۔ اس کی گفتگو زیادہ تر روشنا کے گرد ہی گھومتی تھی۔ ”روشنا یہ کہتی ہے۔ روشنا نے اس رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ روشنا کو یہ پسند ہے۔ یہ ناپسند ہے۔“

روشنا کے خاندان اس کے مال باپ، بہن، بھائیوں اور ہر شے سے غائبانہ واقف تھا۔ جازی کو اب اس کی دن بدن بڑھتی ہوئی دیوانگی سے خوف آنے لگا تھا۔ مسعود پیار کو ترسا ہوا لڑکا تھا۔ وہ اپنے مال باپ کی انکوائی اولاد تھا۔ مال بھی اس کے بچپن میں گزر چکی۔ باپ یا عیب اور اولاد سے فاصلے پر رہنے کا قائل تھا۔ پیار کی تشنگی مسعود کے ساتھ مل کر جوان ہوئی تھی جب ہی تو وہ ذرا سی محبت یا کر جان تک قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ جب ہی تو وہ دوستوں کو والمانہ عزیمت رکھتا تھا۔ اب اس کے پیار کا محور روشنا تھی۔ وہ اب بہت مطمئن، بہت مسرور بہت سیراب تھا۔

مگر محبت کی یہ سچائی جازی کو روشنا میں نہیں دکھائی دیتی تھی۔ اس کے پیار میں وہ حدت و شدت نہ تھی۔ اس کی محبت جانے کیوں جازی کو سطحی اور بنا دلی دکھائی دیتی تھی۔ روشنا ابھی الگ کے اس دریا میں نہ اتری تھی جس میں مسعود۔ دیوانہ وار ڈوبا ہوا تھا۔ وہ صرف مسعود کے جذباتی مکالموں اس کی بے قرار یوں پر شرماتی تھی۔ خوش ہوئی تھی اور بس۔

کبھی کبھی تو جازی کو یوں لگتا جیسے کہ وہ مسعود کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ جان بوجھ کر اسے تڑپا کر اپنی اہمیت کا اندازہ لگاتی ہو۔ وہ اکثر مسعود کو وقت دے کر بھول جاتی اور مسعود انتظار میں تڑپا رہ جاتا اور پھر جب روشنا بعد میں بڑی معصومیت سے کہتی کہ وہ بھول گئی تھی تو جازی کو سب سراسر جھوٹ لگتا۔

روشنا کی آنکھیں اس جھوٹ کا ساتھ نہ دیتی تھیں۔ وہ خود کو جتنا بھولا اور جتنا معصوم ظاہر کرتی تھی۔ جازی کو اتنی لگتی تو نہ تھی۔ مگر یہ باتیں مسعود کو کون سمجھاتا۔

جازی نے تو اس، ایئر کو بھی نوخی وقت گزارا کی

ذرا بچہ سمجھا تھا۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ مسعود اس خطرناک حد تک سنجیدہ ہو جائے گا کہ اسے دل کا روگ ہی بنا ڈالے گا۔ روشنا بھی جھوٹ موٹ بھی خفا ہو جاتی تو مسعود کی جان پر بن جاتی تھی۔ وہ ایک ہی دن میں برسوں کا پیار دکھائی دینے لگتا۔ شیو بڑھا کر مجنوں بنا پھر آتا تھا اور شاید یہ دیکھ کر روشنا کا مان بڑھ جاتا تھا۔ اس کی ادا میں اور قاتلانہ ہو جاتی تھیں۔

جازی اب دل ہی دل میں اسے سخت ناپسند کرنے لگا تھا۔ یہ لڑکی آسیب کی طرح مسعود سے چمٹ گئی تھی۔ مسعود کی آنکھوں پر تو محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مگر جازی کو وہ کسی بھی طرح اپنے اتنے اچھے، بے رخصل، اتنی دھیر ساری خوبیوں کے مالک دوست کی شریک حیات بننے کے لیے موزوں دکھائی نہ دیتی تھی۔ اسے تو وہ ایک سطحی اور مادہ پرست لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ مسعود نے کتنے ہی تحائف اس کی نذر کیے تھے اور جنہیں وہ بلا تامل قبول کرتی رہی تھی حالانکہ بظاہر اس کے سامنے مسعود کی یہ حالت تھی کہ وہ

جازی اور زہیر سے ادھار لیتا رہتا تھا اور بھی کتنے ہی دوستوں کا ادھار اس پر چڑھا ہوا تھا۔ اکثر ادھار بیسے چکانے کے معاملے پر اس کا جازی اور زہیر سے جھگڑا بھی چلتا رہتا تھا۔ اس کی جبین اکثر خالی ہی دکھائی دیتی تھیں۔ کیونکہ سارا حجب خرچ مینے کے شروع میں ہی وہ اپنی شاہ چوپوں پر اڑا دیا کرتا تھا اور اس کے والد حساب کتاب کے معاملے میں خاصے سخت تھے۔ مسعود معمولی کپڑوں میں پلوس رہتا تھا۔ اس کے پاس پرانی سی موٹر سائیکل تھی اور وہ اکثر پیڑوں کی مڑنگائی کا رونا روتا رہتا تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے روشنا اسے ایک مفلوک الحال طالب علم ہی سمجھتی تھی۔ ایسے میں جب وہ مسعود کے قیمتی نئے اپنا حق سمجھ کر لیتی اور بھی پلٹ کر نہ پوچھتی کہ یہ نئے دیے کے لیے اسے کسی سے ادھار تو نہیں لیتا ہوا تو جازی کو وہ ایک نہایت خود غرض اور لاپرواہ قسم کی لڑکی لگتی تھی جبکہ مسعود کا کہنا تھا کہ روشنا وہ لڑکی ہے جو بظاہر اس کے غریب ہونے کے باوجود اس سے سچی محبت کرتی ہے۔

روشنا کی اس سچی محبت کی اصلیت بہت جلد کھل کر سامنے آگئی لگتا تھا۔ ان دنوں مسعود کے ستارے گردش میں آئے ہوئے تھے۔ پہلے تو اسے اپنے باپ کی نامالی موت کے صدمے سے گزرنایا ہوا۔ مسعود لاکھ اپنے والد سے دور رہا تھا۔ مگر ملک فتح محمد نے اسے بے حد محبت و شفقت سے پالا تھا۔ مسعود تو بچوں بھی بے حد جذباتی تھا۔ اس سے یہ صدمہ برداشت نہ کیا گیا۔ وہ تڑھال ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسے میں جازی اور زہیر اس کا سہارا بنے ہوئے تھے۔

دوسری طرف اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زمین و جائیداد پر اس کے چچا اور تایا قابض ہو گئے۔ اس سلسلے میں ان کی پہلے ہی اپنے مرحوم بھائی سے غصی ہوئی تھی۔ مقدمات چل رہے تھے۔ ایک نیا مقدمہ داخل دفتر۔ ہو گیا مگر اس کے چچا اور تایا مکمل

ہوشیاری سے بھاری رشوتیں دے کر اپنے حق میں تار تیش ڈلاتے گئے۔ انہوں نے اجرتی قاتلوں کے ذریعے مسعود کی جان لینے کی بھی کوشش کی۔ جازی اور زہیر کے اصرار پر بالآخر مسعود کو ایک طرح سے اپنی ہی جاکیر سے بے دخل ہو کر شہر آنا پڑا۔ جازی اور زہیر حالات کا سکون سے جائزہ لے کر قانون کے سہارے اس کے رشتے داروں کے خلاف کوئی قدم اٹھانا چاہ رہے تھے۔ کتنے ہی دن تو ان ہی الجھنوں میں گزر گئے۔ مسعود نے گہرا کر روشنا کی محبت کی جھاڑوں میں پناہ چاہی تو ایک اور ہی انکشاف سے زمین پیروں تلے سے ٹھسک گئی۔ روشنا بڑے مزے سے اپنے ایک لندن پلیٹ کرن کی مفتی کی انگوٹھی انگلی میں پہنے ٹھوم رہی تھی۔ اس کے چہرے پر طلال تنک نہ تھا۔ ”اب میں کیا کرتی۔ تم لوگ تو عتاب ہی ہو گئے۔ اتنا اچھا رشتہ تھا۔ کوئی اور لے چکا۔ میرے ماں باپ کی پی مرضی تھی۔ میں کیسے انکار کرتی۔“ وہ اس قیمتی انگوٹھی کی نمائش کرتے ہوئے مصیبت سے گویا ہوئی۔

غم و غصے سے جازی کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے بمشکل خود پر ضبط کرتے ہوئے مسعود کے سارے بھران کے بارے میں بتایا۔

روشنا مسعود کے والد کی موت پر افسوس کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکی۔ اس کے ذہن پر لندن سوار تھا۔ ہر بات کا میرا اپنے کزن اور لندن کی طرف جا مڑنا تھا اور آخر میں وہی مشرقی لڑکی کی ان دیکھی مجبوریوں کا رونا۔

مسعود کا چرامردوں سے بدتر ہو رہا تھا۔ رنگت متغیر ہو گئی تھی۔ جازی کو یوں لگا، جیسے وہ ابھی چکر کر گر پڑے۔ لگا۔ روشنا سے اس بے وفائی کا تو اس نے خواب میں بھی تصور نہ کیا تھا۔ اسے اپنے چچا اور تایا کی وعایا بویوں، مکاریوں اور اپنی جائیداد چھین جانے کا اتنا صدمہ نہیں ہوا تھا جتنا صدمہ اسے روشنا کے منہ سے یہ سب سن کر ہوا تھا۔

روشنا اجنبی بنی اٹھ گئی۔ جازی بمشکل تمام مسعود کو ہاسل تک لایا تھا۔ مسعود پھر جو بیمار ہو کر بستری پر ڈاٹو دنوں نہ اٹھ سکا۔ کوئی بھی علاج کارگر نہ ہو رہا تھا۔ زہیر اور جازی دونوں سخت پریشان تھے۔ ہاسل کے جس کمرے میں ان تینوں روم میٹس کے قہقہے گونجا کرتے تھے۔ وہاں اب خاموشیوں کے ڈیرے تھے۔ مسعود ادا اس پر ڈارتا یا پھر کتاب کی اوٹ لیے نظا ہر دھستا دکھائی دیتا مگر جازی جانتا تھا اس کا ذہن اس وقت کہاں ہو گا۔ اپنے عزیز از جان دوست کی یہ حالت اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔

آخر اس نے ایک بار قسمت آزمائی چاہی کہ شاید مسعود کی اس دگرگوں حالت کے بارے میں سن کر روشنا کا دل بھل جائے۔ اس کی سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھے اور وہ خاندانی روایتوں سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ مگر روشنا کی آنکھوں پر تو لندن کی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ اول تو وہ جازی سے کسی ریٹورنٹ میں ملنے پر ہی آمادہ نہ ہوئی۔

”یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ ایک غیر لڑکے سے گھر سے باہر لوں میں سے لے سکتی ہوں۔“

حالانکہ غیر لڑکوں سے رہنمائی وغیرہ میں ملاقات کرنے سے ”بڑی“ باتیں وہ پہلے بھی ہنسی خوشی کر چکی تھی وہ اس بات پر بھی براغور خستہ ہوئی تھی کہ جازی نے یوں اس کے گھر فون کیوں کیا۔ فون اس کا منگتیر بھی تو رہیو کر سکتا تھا۔ جازی بہت کچھ کہہ سکتا تھا مگر پی گیا۔ گزرا تے ہوئے بولا۔

”میں تم سے اپنے دوست کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔“

”وہ مسعود! کیا ہو گیا ہے اسے۔“ وہ تجلیل عارفانہ سے بولی۔

جازی نے جلدی جلدی تفصیل بتائی شروع کی مگر

روشنا نے درمیان میں ہی ٹوک ڈالا۔

”کیا مصیبت ہے۔ میرے پاس اس وقت اتنی لمبی بحث سننے کا وقت نہیں ہے۔ کوئی بھی آسکتا ہے۔“ اس پر اپنے منگتیر کا ہوا سوار تھا۔

”مسعود تو سدا کا جذباتی ہے۔ اسے سمجھاؤ۔ ایسے رومانیک ہیرو بننے کا دور اب گزر چکا ہے۔ حقیقت پسند بنے۔ آخر میں نے بھی تو حقیقت قبول کر لی ہے۔ اپنے خاندان کی عزت کی خاطر سی۔ بس اس سے کہہ دو۔ مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔“ وہ جلد از جلد جان چھڑانے کی فکر میں تھی۔

”تمہیں ایسا ہی کرنا تھا تو تم نے اسے محبت کے جھوٹے جال میں کیوں پھنسا؟ اس کے دل سے کھیلنے کا حق تمہیں کس نے دیا؟ اس سے جھوٹے وعدے کیوں کیے؟ جھوٹی قسمیں کیوں کھائیں؟“ جازی اب مزید برواشت نہ کر سکا۔

”ماٹریو مسٹر جازی! جو کچھ بھی کرتی ہوں وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ سچ میں دخل دینے والے کون ہوتے ہیں۔“ روشنا بے رخی سے بولی۔ ”یہ میری حماقت تھی جو میں اس جیسے کنکلمے سے محبت کر بیٹھی۔ آخر کیا ہے اس میں، نہ تعلیم نہ گھربار نہ نوکری۔ اب تو سنا ہے، رشتے داروں نے گھر سے بھی نکال دیا ہے۔ کیا وہ مجھے اپنے ساتھ سڑکوں پر رکھے گا؟“

”یہ سب وقتی پریشانی ہیں۔ تم نے اس کے بارے میں اور کچھ بھی سنا ہو مگر شاید یہ نہ سنا ہو گا کہ وہ کتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ کتنی بڑی جائیداد کا مالک ہے۔ تم تو شاید اس کی دولت کا حساب بھی نہ کر سکو۔ بس یہ چند دن پریشانیوں کے گزر جانے دو پھر وہ تمہیں ایسی زندگی دے گا جس کا تم نے تصور بھی نہ کیا ہو گا۔ وہ تمہارے تصور سے زیادہ دولت مند ہے۔“

روشنا طنز نہ ہنس پڑی۔ ”یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ یہ سبز باغ کسی اور کو دکھائے۔ میں بیسویں صدی کی بائیسویں لڑکی ہوں۔ وہ کتنے پانی میں ہے، سب جانتی ہوں۔“

”محبت کو کھیل بنانا شعور کی بلندی نہیں، ذہن کی

پستی ہے۔ گھٹیا نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا تھا۔ لڑکیاں محبت کو دولت کے پیمانے سے ناپتی ہیں۔ وہ اداس ہے۔ تمنا ہے۔ دلچسپی ہے۔ اسے تمہارے پیار، تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔

”میں نے دلچسپی انسانیت کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ یوں بھی اب میری مفتی ہو چکی ہے۔ مجھے اس قصے سے علیحدہ ہی رکھو۔“ روشنا شاید فون رکھنا چاہتی تھی۔ جازبی پھٹ پڑا۔ ”مجھے یہ سننے دو روشن صاحبہ کہ میں نے آج تک تم جیسی پتھروں سے جس خود غرض اور حریف لڑکی نہیں دیکھی۔“

”آنکھیں کھلی رکھ کر دیکھو ہزاروں مل جائیں گی۔“ روشنا ترش کر بولی۔ جازبی غم و غصے سے سگ اٹھا تھا۔ ”ہاں، تم جیسی لڑکیوں کا مشغلہ ہی یہ ہوتا ہے کہ مسعود جیسے سادہ اور معصوم لڑکوں کو لوہنا کر ان سے رویہ پشیم اور تنھے ہو رہتی رہیں۔ مسعود بے وقوف تھا جو تمہارے گھر و فریب کو نہ پہچان سکا ورنہ میں نے تو اول روز سے ہی تمہاری اصلیت بھانپ لی تھی۔“

”اتنے ہی چراشاش تھے تو کچھ عقل اس احمق کو بھی سکھادی ہوئی۔“ روشنا استغناء سے بولی۔ ”تمہارے عشق نے اس کی عقل پر پتھر ڈال دیے تھے لیکن یاد رکھو روشن! تمہیں اپنے گیسے کی سزا ضرور ملے گی۔ اگر میرے دوست کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”میں مرنا تمہارا دوست۔ بہت دیکھے ہیں ایسے مجھوں۔“ روشنا نے ایک ہلکے سے قہقہے کے ساتھ ریسیور ڈالا۔

جازبی لوٹا تو مسعود سے نظرس چرا رہا تھا۔ مسعود ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ زہیر کا منہ بھی لٹک گیا۔ جازبی آج خوب آس دلا کر گیا تھا کہ مسعود کی محبت اسے ضرور حاصل ہوگی۔ وہ آج کسی بھی طرح روشنا میں مفتی توڑنے کی ہمت پیدا کرے گا۔

جازبی واقعی ایسا کر گزرا کہ روشنا مسعود کے ساتھ سنجیدہ ہوئی اور سچ بچ خانہ لانی دباؤ کی وجہ سے منکلی پر

مجبور ہوئی ہوئی۔ لیکن روشنا تو جیسے خود ہی مسعود کے دامن چھڑانے کی فکر میں تھی اور قسمت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

جازبی اور زہیر، مسعود کو تسلیاں دیتے تھے کہ دنیا روشنا پر ختم نہیں ہوئی۔ وہ اس کے قابل ہی نہ تھی۔ ایک بے وفاء جو کہ باؤلر کی کے لیے یوں اپنا آپ برباد کر لیتا حوا کی کی توہین ہے۔ اسے تو روشنا کو ایک ناخوشگوار باب کی طرح اپنی زندگی سے نکال پھینکنا چاہیے۔ دنیا میں وفا شعار، نیک سیرت، پر خلوص لڑکیوں کی کوئی کی تھوڑی تھی۔ خدا نے یقیناً جن ساتھی کے طور پر اس کے لیے ایک ایسی لڑکی جن رہی ہوگی جو ایسی ہی خوبیوں کی مالک ہوگی اور اپنے پیار و خلوص کے مزے سے ساری محرومیوں کی تلخی گروے گی۔

مسعود سب کچھ سنتا مگر یوں لگتا ساری نصیحتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتا ہے۔



ان مایوس کن حالات میں مسعود کے رشتے کے ایک ماموں اس کے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوئے۔ وہ زبردستی ہی مسعود کو سمجھا بھجا کر اپنے ساتھ لے گئے کہ انہوں کے ہوتے ہوئے اس کا یوں بے یار و مددگار ہاشل میں بزار مانا مناسب نہیں لگتا۔ مسعود نے لاکھ لاکھ کہہ دیے تھے کہ وہ ہلے بھی تو ہاشل میں ہی رہتا تھا اور اب کسی پر بوجھ بننا ہرگز نہیں چاہتا۔ اس نے جازبی اور زہیر کی محبتوں کا حوالہ بھی دیا مگر ماموں کا کہنا تھا کہ ہلے کی بات اور بھی گناہ حالات میں اسے گھریلو فضا کے سکون کی ضرورت تھی اور اپنے عزیزوں اور چاہنے والوں کی زیادہ سے زیادہ دل جوئی کی ضرورت تھی۔

زہیر اور جازبی نے بھی ان کی حمایت کی تو مجبوراً مسعود کو سامان باندھنا پڑا۔ مسعود کے ماموں نہایت خدا ترس اور قانع قسم کے شخص تھے، ایک اچھی سرکاری پوسٹ پر تھے۔ چاہتے تو اس عہدے کا فائدہ اٹھا کر لاکھوں کا ہیر پھیر کر سکتے

تھے۔ مگر وہ رزق حلال کے سختی سے قائل تھے۔ ان کی کوئی کنواری جوان بیٹی بھی نہ تھی۔ اس لیے مسعود سے ان کا کوئی مفاد وابستہ ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا تھا۔ ان کے خلوص اور نیک نیتی پر شبہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ حالانکہ مسعود کا ایمان اب خون کے رشتوں پر سے بھی اٹھنے لگا تھا۔ مگر اس کے ماموں ایک نئی مثال بن کر سامنے آئے۔

ماموں کے ہر قسم کی قیمتی آرائش و آسائش سے محروم چھوٹے گھر میں اسے بلا کا سکون اور بے حد محبت ملی۔ اس کی سادہ دل مامی نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا۔ ان کا بیٹا اس کا رشتہ پر بیرون ملک تعلیم حاصل کرتے گیا ہوا تھا۔ مسعود کے لیے نہ صرف اس کا کمر اکھول دیا گیا بلکہ اسے صحیح معنوں میں بیٹے کی جگہ بھی تسلیم کر لیا گیا۔

ماموں نے ہی پھر اس کے ساتھ کورٹ پکچروں کے چکر لگائے۔ مقدمے کی پیشیاں بھگتا میں۔ حالانکہ مسعود بیزار تھا۔ کسی تنہا کوٹے میں جوگ لینے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ ماموں نے اس کی ہمت بندھائی۔ حوصلہ دلایا، اپنے حق کے لیے لڑنے کا گڑ سمجھایا اور پھر بالآخر مسعود یہ قانونی جنگ جیت گیا۔ ایک صبر آزما انتظار کے بعد مقدمے کا فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا۔

اسے اپنا حق وراثت، اپنی زمین، جائیداد سب کچھ واپس مل گیا۔ اس کے بچاؤ اور تیا کو منہ کی کھانا پڑی۔ اس مقدمے بازی کے نتیجے میں ان کی عزت اور نیک نامی یوں بھی خاک میں مل چکی تھی۔

وہ دن مسعود کی زندگی کا ایک اہم ترین دن تھا۔ اس کی آزمائشوں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ اس کے ماموں، مامی، جازبی اور زہیر اس کی اس خوشی میں مکمل طور پر شریک تھے۔ ڈھیروں مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ خیرات نذر نیا کی گئی۔



مسعود سجدہ شکر بجالایا تھا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ

اپنے باپ دادا کی جاہ و حشمت اس کے لیے ایک مضبوط بنیاد تھی۔ وہ اپنی پشت پر سے یہ پناہ گاہ چمن جانے کے بعد بہت بے بس ہو گیا تھا۔ اسے اب دولت کی اہمیت سے انکار نہیں تھا۔ مگر وہ اب بھی دولت کا پجاری نہیں بننا تھا۔ اس نے اپنی جاگیر میں بیج کر اپنے باپ کی دستار سنبھالی اور سارے انتظامات اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ مگر اب بھی اس میں غرور نہ آیا تھا۔ بلکہ وہ پہلے سے زیادہ فراخ دل ہو گیا تھا۔

اپنی تعلیم مزید جاری رکھنے کی اس نے کوئی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ اب اسے جاگیر اور زمینوں کی دیکھ بھال کرنا بھی، تاہم زہیر اور جازبی سے اس کا میل ملاپ اسی طرح قائم رہا۔ وہ دونوں ہر تعطیل مسعود کی حویلی میں گزارتے تھے۔ جہاں وہ شنواروں کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ اس تجربے سے گزر کر اس میں ایک تبدیلی البتہ آگئی تھی کہ وہ نمود و نمائش کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ دولت سے کچھ عرصے کی محرومی نے اس کے دل میں اس کی قدر و قیمت پیدا کر دی تھی۔ اس نے اپنی حویلی شاندار طریقے سے سجائی تھی۔ وہ چمکتی دمکتی قیمتی کاروں میں سفر کرتا اور اعلا ہولوں میں کھانا کھانا پکڑا تھا۔

جازبی اور زہیر کے لیے وہ اب بھی ان کا وہی پرانا بے تکلف دوست تھا۔ مسعود نے انہیں آفر کر رکھی تھی کہ تعلیم مکمل ہوتے ہی وہ اس کی جاگیر میں اس کا ہاتھ بٹائے آجائیں۔

مسعود کی بعیت میں جازبی اور زہیر بھی خوب جی بھر کر زندگی کی آسائشوں اور نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے۔

مسعود فارغ ہوتا تو اکثر وہ لوگ شہر میں بسی ڈرائیو پر نکل جاتے۔ مسعود ”ملک مسعود“ کا بھاری بھر کم چولا اتار پھینکتا۔ چھوٹی بے تکلف قہقہے، دھول دھبائی چمچ چھاڑ ہوتی۔ یوں لگتا جیسے کچھ عرصے کے لیے وہی پرانے بے فکری کے دن لوٹ آئے ہوں۔



ایک ایک روز ایسی ہی ایک ڈرائیو میں روشناسے
کراؤ ہو گیا اور شاید مسعود کے ذمہ ہرے ہو گئے۔
جس محبت کو اس نے بڑی مشکل سے زبردستی سلیا
تھا وہ دوبارہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔

روشنا کسی سواری کے انتظار میں سڑک کے
کنارے کھڑی تھی۔ سیاہ شیشوں کے پار اس پر نظر
پڑتے ہی مسعود کا دل بے اختیار بریک پر دب گیا۔

اس کی اکاڑا ایک جھٹکے سے رکی روشنا اپنے قریب
گاڑی رکھنے پر چوکی اور زہیر اور جازی اسے سامنے دیکھ
کر چوٹے۔

”لفٹ میں؟“ مسعود نے کھڑی کاناریک شیشہ ذرا
سایچے کھٹکاتے ہوئے ہماری آواز میں پوچھا۔

”شیور“ صہیک پو۔ ”روشنا اسی غلطی ہوئی آواز
میں کہتے ہوئے آگے بڑھ آئی۔ اس کی آب و تاب اور
اس کی متوالی چال ابھی تک کسی تھی۔

مسعود نے آنکھوں پر گہرے شیشوں کے گلاسز
چڑھالیے تھے پر کلف سوٹ اور چمکتی ہوئی گاڑی نے
یقیناً ”اس کی شخصیت بدل ڈالی تھی۔ روشنا پہلی نظر
میں اسے ہرگز نہیں پہچان پائی اور جب پہچانی تو قریب
قریب اچھل پڑی۔

”یہ یہ تم؟“ اسے جیسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آ رہا
تھا۔ وہ ٹنگ ہو گئی تھی۔

مسعود گلاسز اتارتے ہوئے ایک اواسے سر کو خم
کرتے ہوئے مکرایا۔

”مسعود۔ ایٹ پور سروس میڈم!“ روشنا سے اپنا
جوش و خروش چھپانا مشکل ہو گیا۔

”مگر تم یوں؟“ یہ سب؟ میرا مطلب ہے، کسی کی
اڑلائے ہو۔“ اس نے کار کی چمکتی ہوئی سطح کو چھو کر
دیکھا۔ ”اور تمہارا توجلیہ ہی بدلا ہوا ہے۔ لگتا ہی نہیں،
تم وہ مسعود ہو۔“

”حالات بہت کچھ بدل ڈالتے ہیں محترمہ!“ پچھلی
سیٹ سے جازی نے سرد آواز میں کہا۔ روشنا کی نگاہ
اب ان پر پڑی تھی۔

”اوہ تو آپ سب ہیں۔ وہی پرانا گروپ۔“ زہیر

نے تو اسے دیکھتے ہی پر اسامندہ بنا کر دوسری طرف دیکھنا
شروع کر دیا تھا۔ جازی نے البتہ بڑے محل کا ثبوت دیا
تھا۔ مگر پھر بھی وہ مٹھ کرنے سے باز نہ رہا۔

”وفا داری بشرط استواری۔ دوستی اور محبت میں
خلوص اور وفا شامل ہو تو تب ہی وہ ہمیشہ قائم رہتی
ہے۔“

روشنا نے زہیر کا طرز عمل دیکھا، جازی کے لیے کی
چھین محسوس کی تو اس کے چہرے کا رنگ بھکا پڑ گیا۔
”یہ تو ہے۔ مگر میں یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ یہ کیا
پلٹ کیسی ہے، تم لوگوں نے کہیں ڈاکشا کا تو نہیں
ڈالا۔“

”ہم لوگ تو خود لوٹ لیے گئے ہیں۔ ڈاکے کیا
ڈالیں گے۔“ مسعود نے کہا۔ ”نہیں بتایا تو ہو گا کبھی
جازی نے کہ میرے دوھیال والوں نے میری جائیداد پر
قبضہ کر لیا تھا۔ اب سب کچھ واپس مل گیا ہے اور
تمہارے سامنے ہے۔“ اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا یا
شاید روشنا کو یاد دیکھ کر ہو گیا تھا۔

جازی پہلو پہ پہلو بدلے جا رہا تھا۔ زہیر کی ناگواری
بھی عیاں تھی۔

روشنا کا چہرہ اب ہو گیا، جیسے اپنی کسی فاش غلطی
کے اور اک نے اسے قی دامن کر ڈالا ہو۔

”ہاں بتایا تو تھا۔“ وہ ہارے ہوئے جوازی کی طرح
بڑبڑائی۔ پھر زبردستی کی ہنسی ہنس کر بولی۔ ”مگر کچھ تو یہ
ہے کہ مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا۔ ایک گپ لگی تھی۔“

”اب تو کیا یقین؟“ مسعود نے قدرے جھک کر
اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اپنی آنکھوں سے دیکھ کر

روشنا نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”ہیشو، کہاں جاؤ گی؟“ مسعود کے کہنے پر شاید اسے

بھی یاد آیا کہ وہ لفٹ لینے کی تھی۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔
”نہیں۔ نہیں۔ میرے خیال میں مجھے یلو کیب
آسانی سے مل جائے گی۔“

”یو کیب تو پہلے بھی آسانی سے مل سکتی تھی۔“

مسعود ڈھکے چھپے انداز میں چوٹ کرتے ہوئے لطف
اندوز ہو رہا تھا۔ ”مگر سوچ لو مجھ جیسا خوب کار والا پھر
آسانی سے نہیں ملے گا۔“

روشنا کچھ کھٹے سوچتی رہی پھر بیٹھ گئی۔ ”تمہاری
باتیں اب بھی ویسی ہیں۔“

”کیکن میں ویسا نہیں رہا؟“ مسعود نے کار اشارت
کر ڈالی۔ روشنا نے اس کی طرف دیکھا۔

”تم تو پہلے سے زیادہ اسماٹ ہو گئے ہو۔“
”شکریہ۔“ مسعود کو واقعی خوشی ہوئی تھی۔ بہت

عرصے بعد جازی نے اس کے چہرے پر سرت کی ایسی
بے پناہ چمک دیکھی تھی۔ وہ اور زہیر ایک دوسرے کو
دیکھ رہے تھے۔ پچھلے دنک کا زہر ابھی اترا نہیں تھا اور

مسعود ایک ہی سوراخ سے اپنے آپ کو دوبارہ ڈسوانا چاہ
رہا تھا۔ ورنہ روشنا کو دیکھ کر گاڑی روکنا اس پر یہ
عنایتیں، یہ مسکرائیں بے سبب تو نہیں تھیں۔ اگر وہ

اس کی جگہ ہوتا تو روشنا پر دوسری نگاہ ڈالنا گوار نہ کرتا۔
بلکہ اس پر پھٹ پڑتا۔ خوب دل کا غبار نکالتا۔ مگر یہ
مسعود یوں پیش آیا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اتنے

بلند طرف کا بھی کوئی نہ ہو۔

”تم نے بتایا نہیں، کہاں اترو گی؟“ مسعود بڑی
ملامعت سے پوچھ رہا تھا۔

روشنا نے اپنے گھر کا بتا دیا۔
”تو میکے آئی ہوئی ہو؟“ مسعود نے کہا۔ جازی کو بھی

حیرت ہوئی تھی۔ اس کے خیال میں تو روشنا کو اب
اپنے کزن کے پہلو میں لندن میں ہونا چاہیے تھا یا پھر
کم از کم یہاں اپنی سرال میں۔

روشنا نے کوئی جواب نہ دیا۔
چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ گاڑی سبک رفتاری

سے سڑک پر پھسلتی رہی۔ اندر کی فضا میں ایر کنڈیشن
کی خنکی اور ایر فربش کی خوشبو بچی تھی۔ جازی نے
دیکھا۔ روشنا گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ وہ

جیسے کسی خواب کی سی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ بار بار وہ
چور نظروں سے مسعود کی طرف دیکھ رہی تھی بالآخر
بھٹکتے ہوئے بولی۔

”مسعود! میرا تو خیال تھا کہ تم لوگ مجھ سے سخت
ناراض ہو گئے، خاص کر تم۔“

”باراضی کیسی؟“ مسعود لا پرواہی سے بولا۔ ”میں
اتنے چھوٹے دل کا نہیں ہوں اور پھر خاندان کی عزت
پر قربان ہونے کا حوصلہ کسی کی میں ہوتا ہے۔ میرے
دل میں تو تمہاری قدر بڑھ گئی تھی۔“

زہیر نے جازی کو کہنی کاٹھو کار سید کیا۔ جازی وائٹ
پینے لگا۔ ”اس مسعود کے بچے میں سیرت نام کی کوئی چیز
نہیں رہی تھی۔ اس کی جگہ وہ ہوتا تو اس لڑکی، کبھی
اپنی گاڑی میں نہ بیٹھ دیتا۔ خود بیٹھ جاتی تو دروازہ کھول
کر یا ہر دھکیل دیتا۔ کس قدر بھول پن دکھا رہی تھی اور
مسعود اس سے کہیں زیادہ بھولا بن رہا تھا۔

روشنا رو ہنسی ہو گئی۔ ”اور اس قربانی کا صلہ مجھے کیا
ملا۔ وہ منگنی تو ٹوٹ بھی گئی۔ وہ کہیں وہاں لندن میں
برتن صاف کرتا تھا اور سب کہتے تھے، بہت بڑا برٹس

میں ہے۔ روزانہ لاکھوں کی ڈیٹنگ کرتا ہے۔ اب میں
بیٹھی ہوں اپنے ماں باپ کے گھر۔ کوستی ہوں، انہیں
اور اپنی قسمت کو۔“

”ذیری سیڈ۔“ مسعود افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔ مگر
جازی کو حقیقتاً ”خوشی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ

خوشی کا انھوں لگا کر بھنگوا ڈالنا شروع کر دے۔ دوسروں کا
دل اجاڑنے والے یو نہی اڑتے ہیں۔ زہیر کی بھی یہی

کیفیت تھی۔
”مگر ایک غلط بات کہی ہے تم نے۔ اپنے ماں باپ

کو کیوں کوستی ہو، ماں باپ تو اولاد کا بھلائی چاہتے ہیں
اور قسمت کو کونسا بھی کم از کم میں پسند نہیں کرتا۔ ہر

آواز اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔“
مسعود نے کہا تو روشنا آنسو پونچھنے لگی۔ ”اب تم

جیسا حوصلہ میں کہاں سے لاؤں۔“
”اوحار مل سکتا ہے۔“ مسعود ماحول کا بو جھل پن

دور کرنے کے لیے شرارتی انداز میں بولا۔
روشنا مسکراتے لگی۔ ”تم اتنے اچھے ہو مسعود! میں
اتنی پریشان رہی تھی، تمہارے بارے میں۔ مگر تم
جائے کہاں چلے گئے تھے۔“

جازی اس سفید جھوٹ پر ہکا بکارہ گیا۔ مسعود کے اس کے ماموں کے ساتھ چلے جانے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنی انا خودداری کو بلائے طاق رکھ کر روشنا کو فون پر اس کے بارے میں بتایا بھی تھا اور روشنا نے پوری بات سننا بھی گوارا نہ کیا تھا۔ ”خس کم جہاں پاک“ کہہ کر سلسلہ ہی منقطع کر دیا تھا۔

عورت کے فریب کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ روشنا عملی طور پر سب دکھا رہی تھی۔ روشنا دوبارہ ملنے رہنے کے وعدے کے ساتھ رخصت ہوئی۔ گاڑی سے اترتے وقت وہ بہت چمک رہی تھی۔ مسعود نے پھر ان دونوں کو ہاشل ڈراپ کیا۔ مگر ان دونوں کا موڈ سخت آف تھا۔

”یہ تمہارے منہ کیوں سوچے ہوئے ہیں؟“ مسعود جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

”تم نے اس خبیث لڑکی کو لفٹ کیوں دی۔ بلکہ اس سے بات بھی کیوں کی۔“ جازی ناراض تھا۔

”مانڈو لینے جوتج یار!“ مسعود کو روشنا کے لیے اس کا لب و لہجہ اچھا نہیں لگا۔

”میں اس کے لیے اس سے بھی برے الفاظ بول سکتا ہوں۔“ جازی چڑ کر بولا۔ ”اور مجھے اس سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ لڑکی اس قابل ہی نہیں کہ اسے منہ لگایا جائے کیا تم بھول گئے کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا؟“

مسعود کے چہرے پر تاریکی کے بادل چھانے لگے۔

”تم نہیں سمجھو گے۔“

”میں سمجھتا بھی نہیں چاہتا۔ یہ جان کر کہ اس کا منگیتر لاکھوں کی نہیں برتنوں کی ڈیلنگ کرتا ہے۔ اسے تمہا یاد آگئے۔“

”تم نے دیکھا نہیں۔ وہ کس طرح کسی بھی اجنبی سے لفٹ لینے پر تیار تھی۔ ایسی لڑکی کے کیڑے کڑے کے بارے میں تم کیا کہو گے؟“ زہیر نے گفتگو میں حصہ لیا۔

”میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آج کے بعد سے تم اس سے نہیں ملو گے بلکہ اس کے سائے سے بھی دور

رہو گے۔“ جازی نے حتمی انداز میں کہا۔

”اور یہ خیال میرا بھی ہے۔“ زہیر بولا۔

مسعود نے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔

”آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”بہت فرق پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے رویے نے اس کی ہمت بڑھا دی ہے۔ اب وہ دوبارہ تمہیں اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرے گی۔ تم میں غیرت ہوئی تو اسے وہیں شوٹ کر دیتے۔ تم نے اس سے بات کرنا گوارا بھی کیسے کیا۔“ جازی کو اس پر سخت غصہ آئے جا رہا تھا۔

”عشق میں غیرت انا، خودداری نہیں ہوتی۔ آدمی بے بس ہو جاتا ہے۔“ مسعود بے ساختہ بولا تھا۔

جازی بڑے زور سے چونک رہا۔

”تو اس کے عشق کا جھوٹا تمہی تک اترا نہیں اور اور تم کہتے رہے کہ اب سب کچھ ٹھیک ہے۔“

”سب کچھ ٹھیک ہے اور ٹھیک رہے گا۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ مسعود نے کہا۔

لیکن بہر حال تم دونوں کا رویہ اس کے ساتھ خاصا نامعقول تھا۔ تمہیں اس طرح کا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سارا وقت منہ بھلائے اسے اور مجھے گھورتے رہے۔ جیسے بس چلتا ہو تو جانے کیا کر ڈالو گے۔ کیا سوچتی ہوگی وہ۔“

”کچھ بھی سوچتی رہے۔ تم کیوں فکر میں گھل رہے ہو۔ تمہارا اس سے اب کیا ناتہ رہا ہے۔“

مسعود کھسیا گیا۔

”وہ کچھ بھی سوچتی ہو لیکن یہ ضرور جانتی تھی کہ ہم دونوں اس وقت کیا سوچ رہے تھے۔ ہم تم لوگوں کی طرح دو غلے نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے چہرے اپنے جذبات پر نقاب چڑھانے نہیں آتے۔ ہم سیدھے سادے دہرائی لوگ ہیں۔ ملک مسعود اجول میں ہوتا ہے وہی منہ پر بھی ہوتا ہے۔“ جازی اچھا خاصا جذباتی ہو گیا۔ مسعود کا روشنا کی حمایت میں بولنا اسے سخت برا لگا تھا۔

”تو یار! میں بھی تو دہرائی ہوں۔ مجھے کیوں خود سے

الگ سمجھتے ہو۔“ مسعود اس کی خفگی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔

”تم ملک ہو۔ ہم کمی کارندے تمہارے نہ سہی کسی اور ملک کے سہی۔ تمہارا ہمارا کیا مقابلہ۔ بھلا ہم تمہیں مشورہ دینے والے کون ہوتے ہیں اور تم ان مشوروں کو کیوں سنو گے۔“

”خبردار جو منہ سے آئندہ ایسی بات نکالی۔“ مسعود کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”تو پھر یہ جان لو کہ ہم تمہارے دوست تمہاری بھلائی چاہتے ہیں۔ مجھے بتاؤ کیوں تم نے اداکاری کرتے ہو۔ اس نے تمہارے دل پر چوٹ لگائی۔ اور تم ہنس کر اس سے باتیں کرتے رہے۔“ آئندہ ملنے کے وعدے و وعید بھی کر لیے۔ اس فرمائش پر ایک تھپڑ نہیں رسید کیا تم نے اسے۔“

”آخر ہونا خفگی! اجڈ جھگڑوں کے پینڈو۔ اس حرکت پر اس لڑکی نے میرے خلاف اقدام قتل کا مقدمہ درج کر دیا تھا۔“ مسعود نے بات کالی۔

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ جازی جھنجھلا گیا۔

”تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ وہ حسین۔۔۔ ناگن نئی کپڑی بدل کر آئی ہے۔ وہی تو تھی جس نے تمہیں موت کے قریب پہنچا دیا تھا۔ اگر تمہارے ماموں ماما کی محبت نہ ہوتی یا میرے اور زہیر جیسے دوست نہ ہوتے تو تم نے تو اس کے فراق میں خود کشی کر لیتا تھی۔“

مسعود چپ سا ہو گیا۔ مگر پھر اگلے لمحے سنبھل کر پھر اس چونچال موڈ میں آ گیا۔ اس نے جازی کی پشت پر ایک دھمو کا جڑا لایا۔

”یہ تمہاری اپنے بارے میں خوش فہمی کبھی نہ جائے گی۔“

”ناں۔ یہی تو میری دوستی کا دیا ہوا مان ہے۔“ جازی نے کہا تو مسعود نے بے اختیار اسے خود سے لپٹا لیا۔

وہ دونوں اپنی بھرپور کوشش کے باوجود مسعود کو

روشنا سے ملنے سے نہ روک سکے۔ ان کا سمجھنا بھانا سب بے کار گیا۔ ساری نصیحتیں بودی ثابت ہوئیں۔ مسعود ہوں ہاں میں سر ہلا تا مگر روشنا کی ایک ہی نیکی فون کال پر بے خودی کی حالت میں اس کے پیچھے نکل کھڑا ہوا۔ روشنا نے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں اترتی تھی۔ تین سال کے اس عرصے نے اس کی اداوں کو نکھار دیا تھا۔ اس نے دل بھانے کے نئے نئے طریقے سیکھ لیے تھے۔ وہ دلوں کو کھانسل کرنے میں پختہ کار ہو چکی تھی۔ اپنے حسن میں معصومیت اور بانکہ کی کامنترج کر کے اس نے اسے دو آتشہ بنا ڈالا تھا۔

ڈھٹائی کی حد تو یہ تھی کہ اسے زہیر اور جازی کی ناگواری اور ناپسندیدگی کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ وہ جازی سے تنہائی میں ملی اور بڑی سہولت سے جتیا کہ مسعود کو ٹھکرا کر اس نے جو غلطی کی تھی۔ وہ اب اس کی تلافی چاہتی ہے۔ جازی کو اگر اپنے دوست کی خوشیاں واقعی عزیز ہیں تو وہ ان دونوں کی راہ روکنے سے گریز کرے۔

”مسعود میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“ وہ بڑے غور سے بولی تھی۔

”وہ تو پہلے بھی تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر وہ کہہ لو کہ کیا اور خاصا ہنسی خوشی رہتا تھا۔“ جازی جلا بیٹھا تھا۔

”وہ سب دکھاوا تھا۔ وہ اندر سے میرے بغیر اداں تھا۔“

”یہ دکھاوا کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ اس کے ماموں اس کے لیے ایک اچھی سی نیک لڑکی دیکھ کر رشتے کی بات چلا چکے ہیں۔ اور مسعود ہائی بھر بھی چکا تھا۔“ جازی نے اطلاع بھیج پھینکی۔

مسعود کے ماموں واقعی اب اس کا گھر ہانے کے لیے سنجیدہ تھے اور ایک اعلا خاندانی گھر نے اس کی بات چلا رہے تھے۔ انہوں نے مسعود کی رائے چاہی تو

مسعود نے سارے اختیار ان کے ہاتھ میں دے دیے تھے مگر تب روشنا دوبارہ مسلط نہیں ہوئی تھی۔ اب جازی چاہتا تھا کہ یہ رشتہ جلد از جلد طے پا جائے۔ بیوی گھر آجائی تو مسعود بھٹکنے سے بچ جاتا۔ اپنے محل نما گھر کی تنہائی اپنے دل کی دیرانی اور پیار کی تشنگی ہی اسے دوبارہ روشنائی طرف سائل کر رہی تھی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ روشنا چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح ہو گئی۔

”مسعود کو اپنے ماموں کی طرف سے ایسا جذباتی سہارا ملا ہے کہ وہ کبھی ان کی بات ٹھکرانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور یہ تو اس کے ماموں کی عزت کا معاملہ ہے۔ وہ زبان دے چکے ہیں۔“ جازی مسعود کے مزاج و خیالات سے واقف تھا۔ وہ احسان کرنے والوں کو ہمیشہ یاد رکھتا تھا۔

”مگر مسعود میرے لیے ساری دنیا ٹھکرا سکتا ہے۔“

روشنا بڑے یقین سے بولی۔

”ناش کہ روشنی لی لی! تم نے بھی اس کے لیے اپنے کزن کی دولت کو ٹھکرا دیا ہوتا۔“

جازی نے کہا تو روشنا کا چہرہ طرح طرح کے رنگ بدلنے لگا۔

”اب مسعود کے گھر سے دوست سہی مگر مجھ پر طنز کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔“ وہ غصے سے اٹھ کر چلی گئی۔

پھر شاید اس نے مسعود کو جازی کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ زہیر تو یوں بھی دوسروں کے ذاتی معاملات میں زیادہ دخل دینے کا قائل نہیں تھا۔ مگر جازی مسعود کو غلط راستے پر جانا دیکھ کر ٹوکے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ مسعود اکھڑا اکھڑا رہنے لگا ہے۔ اس کا زیادہ تر وقت اب روشنائی سنگت میں ہی گزر رہا تھا۔ وہ مسعود کی مختلف کاروں میں اس کے ہمراہ اڑی اڑی پھرتی تھی۔ اس کے پاس قیمتی لمبوسات اور جیولری کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ مسعود اب بھی وہی شاہ خرمی دکھا رہا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے مویج پر وہ روشنا کو تحائف سے نوازنا نہ بھولتا تھا۔

جازی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مسعود کی عقل کیوں سلب ہو گئی ہے۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی وہ روشنا کے پیچھے باگل تھا۔ اس پر بے دریغ پیسہ لٹا رہا تھا۔ خدا جانے اس کی محبت کہاں جاسوئی تھی۔

جازی نے جب بھی سمجھا جانا چاہا۔ وہ بات ہی نال جاتا۔ آخر اس روز جازی کے سر ہونے پر صاف صاف بولا۔

”وہ میری پہلی محبت ہے اور پہلی محبت بھلائی نہیں جاتی۔“ یہ صاف اور کھلا اعتراف تھا کہ وہ اپنی راہیں جدا نہیں کر سکتا۔

”مگر اسے تم سے نہیں تمہاری دولت سے پیار ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔“ زہیر بھی دلی دلی زبان سے کہے بغیر نہ رہ سکا۔ آخر وہ بھی مسعود کا خیر خواہ تھا۔ اس سارے قصے سے لاقابل نہیں رہ سکتا تھا۔

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دنیا میں کیا ایک دولت مندی ہی رہ گیا ہوں۔“

”دوسرے شاید اس کی دسڑی میں نہ ہوں یا یوں تمہاری طرح جانتے بوجھتے بے وقوف بننے پر تیار نہ ہوں۔“ جازی نے کہا تو مسعود ایک دم بھڑک اٹھا۔

”عجاز! ایک تو تمہاری ہر وقت کی روک ٹوک مجھے زہر لگتی ہے۔ ہر وقت مجھے سبق پڑھاتے رہتے ہو۔ اپنے کسی فعل کا اختیار مجھے بھی ہونا چاہیے یا بس چاہی کے گڈے کی طرح تمہارے اشاروں پر چلتا ہوں۔“

اس کے منہ میں یقیناً ”روشنائی زبان بول رہی تھی۔ جازی برا مان سکتا تھا۔ مگر اس نے برا نہیں مانا۔ اس کے دل کو ٹھیس پہنچی تو تھی، لیکن وہ ضبط کر لیا۔ اسے اس کیفیت کا اندازا تھا جس سے مسعود گزر رہا تھا۔ متضاد کیفیتوں نے مسعود کو زور و زور اور تنگی بنا دیا تھا۔

”تم تو اسے بھول چکے تھے۔“

”کچھ نہیں بھولا تھا میں۔“ مسعود نے کہا۔

”محبت تو یہی ہے کہ میری یادداشت بہت اچھی ہے“ سب کچھ یاد تھا مجھے۔“

”تو پھر غالباً مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت بھی نہیں کہ تمہارے ماموں تمہاری منگنی کی تیاریوں میں لگے ہیں۔“ جازی نے کہا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر میری منگنی میری پسند سے ہوگی۔“

”روشنا سے؟“ جازی کے منہ سے پھلا۔

مسعود کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ آ گئی۔

”یہ میں نے کب کہا؟“

”تمہارے سارے انداز یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ تم پھر اس کی محبت میں مبتلا ہو۔“

”تو پھر ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن یہ پھر سے کیوں؟ میں تو اسی سے محبت کرتا تھا۔“ مسعود نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ تو زہیر اور جازی مترجم نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

اب کوئی جانتے بوجھتے آگ میں ہاتھ ڈالنا چاہے تو دوسرا کیا کر سکتا تھا۔

روشنا کا کردار ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح مسعود کے سامنے تھا۔ اس کی غربت کا حوالہ دے کر روشنا کا اپنے لندن پلٹ کزن کے لیے اسے ٹھکانا اور اب پھر یوں اس کی اہارت دیکھ کر پیٹریڈیل ڈالنا۔ مسعود کوئی بچہ تو نہیں تھا کہ اس بارے میں غور کرنے کی زحمت ہی نہ کرے۔ اب جب اس کے باوجود وہ روشنا سے ہی شادی کرنا چاہتا تھا تو وہ روکنے والے کون ہوتے تھے۔

اس کے انداز صاف ظاہر کرتے تھے کہ وہ اب ان کا اپنے اعصاب پر مسلط ہونا پسند نہیں کرتا۔ زہیر اور جازی نے بھی تھکلیت اسی میں سمجھی کہ مسعود سے میل ملاپ میں کمی کر دی۔ مسعود اپنی دنیا میں مست تھا۔ اس نے غالباً ”ان دونوں کا گریز محسوس بھی نہیں کیا۔ وہ دونوں مسعود کے بارے میں سوچ سوچ کر کڑھتے رہے۔“

ادھر مسعود روشنا کو لیے شادی کی شاپنگ کرتا پھر رہا تھا۔ وہ ہزاروں بے دریغ لٹا رہا تھا۔ روشنا نے ایک سے ایک قیمتی شے پسند کی تھی۔ ایک بار وہ دونوں اپنی

خریداری انہیں دکھانے بھی آئے۔ روشنا کھلی جارہی تھی۔ اتنی قیمتی خوب صورت چیزوں کا تو اس نے زندگی میں تصور بھی نہ کیا تھا۔ مسعود اس کی خوشی دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا رہا۔ روشنا اپنے پروگرام بتا رہی تھی کہ انہوں نے شادی کس طرح آرنج کرنے اور رہتی مومن ٹرپ پر کہاں جانے کا پلان بنایا ہوا ہے۔

”مجھے تو لگتا ہے یہ سب خواب ہے۔“ وہ دفور مسرت سے بار بار کہہ رہی تھی۔

زہیر اور جازی کو اب ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر مسعود کی شادی کہیں اور ہو رہی ہو تو ان کے جوش و خروش کا عالم ہی نرالا ہوتا۔ مگر اس وقت تو انہیں یہی لگ رہا تھا کہ مسعود جانتے بوجھتے کھائی میں چھلانگ لگا رہا ہے۔ مسعود کے بازو سے چپکی کھڑی روشنا کا چھچھور بن انہیں ایک آنکھ نہیں بھارہا تھا۔ ان کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر وہ مسعود کے گلے کا ہار بن جاتی تھی۔ مزے لے لے کر اپنے عروسی جوڑے اور اپنے ہونے والے ہنی مومن کا ذکر پھیلتی تھی۔

ان دونوں نے مجھے ہوئے دل سے انہیں شادی کی پیشگی مبارکباد دی۔

مسعود شادی کے کارڈز کے رنگ اور ڈیزائن کے سلسلے میں ان سے مشورے لے رہا تھا۔ جازی کا دل خاک ہوا جاتا تھا۔ جوانی و لہسن کے سلسلے میں ان کے سارے مشورے رد کرنا کیا ہو گا؟ کارڈ کے سلسلے میں کیا مشورہ دینا۔ اس نے مسعود کے پسند کیے ہوئے کارڈ کی ہی تائید کر دی۔

اسے لگتا تھا مسعود کی شادی ان کی دوستی کا دی اینڈ بھی ہوگی۔ اول تو روشنا انہیں طعنی پسند نہیں کرتی اور مسعود سے اس ساری بے تکلفی اور شادی کی شاپنگ دکھانے کا مقصد ہی جتنا تھا کہ وہ مسعود کو ہمیشہ کے لیے جیت چکی ہے۔ اور پھر مسعود بھی تو انہیں دودھ سے مکھی کی طرح باہر نکال چکا تھا۔ آنے والے وقت کا اندازا ابھی کے روپوں ہی سے لگایا جاسکتا تھا۔

روشنا اور مسعود کے چلے جانے کے بعد وہ دونوں

کتنی ہی دیر خاموش اپنے اپنے پتنگ پر رہے۔ مسعود سے بھری دلوں تک ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ اپنی شادی کی تیاریوں میں الجھا ہوا تھا۔



پھر اس روز سویرے ہاسٹل سے نکلنے سے پہلے روشنا کے فون نے جازی کو حیران کر دیا۔ روشنا اسی وقت اس سے ملنا چاہ رہی تھی۔ اس کے مضطرب لب و لہجے نے جازی کو الجھا ڈالا۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ انکار کرے یا اقرار۔ جھلا روشنا کو اس سے ایسا کیا کام ہو سکتا تھا۔ سرحال اس نے پوچھا۔

”مجھے کہاں آنا ہو گا؟“

”میں اسی فلیٹ سے بول رہی ہوں جو مسعود نے مجھے لے کر دیا ہے۔“ روشنا پھر اپنی ہوئی آوازیں بولی۔

”پلیز تم فوراً یہاں آ جاؤ مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا۔“

جازی کا دل دھڑک اٹھا۔

”خیریت تو ہے مسعود کہاں ہے؟“

مگر روشنا فون پر رکھ چکی تھی۔ جازی کے پاس سوچ بچار کی مصلحت نہ تھی۔ روشنا کے انداز نے اس کے دل میں کھٹک پیدا کر دی تھی۔ وہ مسعود کی طرف سے پریشان ہو گیا تھا۔

فلیٹ کا پتا اس کے علم میں تھا۔ یہ مسعود کی بے شمار عنایتوں میں سے ایک تھا۔

کچھ ہی دیر میں جازی وہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنی موٹر سائیکل ہوا کے دوش پر اڑاتا آیا تھا۔ دروازہ چابی ہی کا تیل پر کھل گیا۔ اس کے سامنے روشنا اجاڑ حال کھڑی تھی۔ اس کے بال بکھرے تھے۔ آنکھیں متورم تھیں۔ کپڑے بھی گلے ہو رہے تھے۔ ورنہ وہ ہمیشہ سے بنی سنوری رہنے کی عادی تھی۔

جازی دھک سے رہ گیا۔

”مسعود؟“

روشنا دروازے سے ہٹ چکی تھی۔ اندر مسعود کی مانوس خوشبو رچی تھی مگر مسعود نہ تھا۔ وہ بے اختیار

روشنا کے پیچھے بیڑ روم تک گیا۔

بند کی رہی چادر پر گلاب کے پھولوں کی مسلی ہوئی پتیاں بکھری تھیں۔ مسعود وہاں بھی نہیں تھا۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر سرخ و سنہری رنگ کا دیکتا ہوا۔ شادی کا رڈ پڑا تھا۔ روشنا نے بغیر کچھ کے وہ کارڈ اسے تھمایا اور بیڈ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا کر سسکنے لگی۔

جازی نے کارڈ کھول کر جلدی جلدی نظریں دوڑائیں۔ سنہرے حروف نے اطلاع پہنچائی کہ ملک مسعود احمد ولد ملک فتح محمد کی شادی خانہ آبادی طے پائی تھی۔ یہ تقریب سعید اگلے ہی ہفتے منعقد ہو رہی تھی۔ مگر دلن کا نام جازی کے لیے سراسر اجنبی تھا۔ وہ ابھی ابھی نظروں سے روشنا کو دیکھنے لگا۔ یہ معما اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

”مسعود اس لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ جو اس کے ماموں نے اس کے لیے منتخب کی تھی۔“ روشنا نے روہانے انداز میں بتایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”سب بہت پہلے سے طے تھا اور وہ مجھے دھوکے میں رکھ کر میرا راق اڑا رہا۔ مجھے جھوٹے خواب دکھا کر لطف اندوز ہوتا رہا۔“

بے اختیار جازی کا دل چاہا کہ وہ ”یا ہو“ کا زور وار نغولگا کر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ اس کے ہر ایک انگ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ایک دم ہلکا ہو گیا۔ مسعود تو واقعی بڑا استاد نکلا۔ روشنا ہی کیا وہ خود بھی تو دھوکے میں رہ گئے تھے۔ مسعود غالباً انہیں بھی سر پر اندر دیتا چاہتا تھا اور وہ اتنے بدگمان ہو گئے کہ اتنے دلوں پلٹ کر اس کی خیریت تک دریافت نہ کی۔ حالانکہ شادی کی تاریخ سر پر کھڑی تھی۔ تاریخ تو نہ بدلی تھی۔ دلن البتہ بدل گئی تھی۔

اس کی کیفیت روشنا سے چھپی نہ تھی۔ وہ دکھ سے بولی۔

”تمہیں خوشی ہوئی ہے۔ ضرور ہوئی چاہیے۔ تم تو خود کی جانچتے تھے مگر میں۔ میرا کیا ہو گا۔ میں مسعود سے محبت کرتی ہوں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

جازی کے ہونٹ مسکراہٹ سے پھیل گئے۔

”یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔“

یہ جملہ ایک پرانی بازگشت بن کر ذہن میں ابھرا تھا اور ہونٹوں پر آگیا تھا۔ روشنا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”یہ سچ ہے۔ خدا کی قسم۔“

”وہی پرانا مکر پرانا ہتھیار۔ مگر مسعود اب یہاں کہاں۔“

”جازی کا جی چاہ رہا تھا۔ جا کر مسعود کی پیٹھ ٹھونک ڈالے۔ روشنا آخر وقت تک خوش فہمی میں جھل رہی تھی کہ مسعود کی ہونے والی دلن وہی ہے مگر مسعود انتابے و قوف نہیں نکلا تھا۔ جتنا کہ دکھائی دیتا تھا۔

”مسعود نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ اس نے میرے سارے خواب نوج ڈالے۔ وہ میرے ساتھ اپنی دلن کے لیے خریداری کرتا رہا اور مجھے پتا بھی نہ چلا۔“ روشنا رو رہی تھی۔

”اس نے مجھے برباد کر دیا۔ میں اپنے گھر والوں کو اپنے خاندان والوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔ جو وہ کہتا تھا۔ میں مانتی گئی۔ اس کے ساتھ اس فلیٹ میں رہنے پر بھی تیار ہو گئی۔ اور اب اس نے بتایا کہ یہ فلیٹ بھی کرائے کا ہے۔ مجھے جلد ہی خالی کرنا ہے۔ اب میں کہاں جاؤں۔“

جازی کو عجیب سا احساس ہوا۔ اس کی مسکراہٹ دم توڑنے لگی۔ روشنا اگر روئے کی اداکاری بھی کر رہی تھی تو یہ نہایت اعلا پائے کی اداکاری تھی۔

”کل رات بھی وہ میرے ساتھ تھا۔ تب بھی اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ بس بات بات پر ہنسا رہا۔ ہنسا ہی رہا۔ مجھے اس کی ہنسی سے خوف آ رہا تھا۔“

جازی کو مسعود کی وہی مخصوص عجیب پراسراری مسکراہٹ یاد آ گئی۔ جوان دلوں اس کے ہونٹوں پر کھیل کر رہی تھی اور پھر اس کی آنکھوں کی وہ چمک جو اسے اجنبی سا روپ دے جاتی تھی۔ وہ بیکسیدلا ہوا دکھائی دینے لگتا تھا۔

”اور آج“ آج صبح اس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے انتقام لے رہا تھا۔ وہ تین سالوں تک انتقام کی آگ میں

جلتا رہا تھا۔ وہ مجھ پر خوب ہنسا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے لیے ان مسئلے ہوئے پھولوں سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوں۔ میں نے اس کا راستہ روکا۔ روٹی، منت کی۔ اس کے قدموں تک میں گر پڑی۔ مگر وہ نہیں رکا۔ اعجاز! وہ تمہارا دوست ہے، تمہاری بات ضرور مان لے گا۔ خدا کے لیے اسے واپس لے آؤ۔ مجھے اس کی دولت نہیں چاہیے۔ میں صرف مسعود کو چاہتی ہوں۔ کبھی میں نے اس سے جھولی محبت کی تھی۔۔۔ مگر اب نہیں۔“ روشنا کی تڑپ اس کے آنسوؤں کی صداقت کی گواہی دینے لگی تھی۔

جازی گونگو ہو گیا۔

”اسے سمجھاؤ۔ اس سے کہو کہ میں بری ضرور تھی مگر ایسی نہیں تھی۔ جو اس نے مجھے بنا دیا ہے۔ لوگ مجھے کیا نام دیں گے۔ میں نے تو اپنا سب کچھ اس پر لٹا دیا۔ اس کے انتقام کی یہ آگ مجھے خاک کر گئی ہے۔ میری مدد کرو! اعجاز! وعدہ کرو، تم اسے واپس لے آؤ گے۔ وہ آئے گا ناں؟ تمہاری بات مان لے گا ناں؟“ وہ بڑی آس سے پوچھ رہی تھی۔

جازی کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ روشنا کی حالت زار پر خوشی کا اظہار کرے یا کہ افسوس کا۔

اس کی تو یہ ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ روشنا اس سلوک کی منتحق تھی یا نہیں؟

مسعود اپنا انتقام پورا کر کے شاید انے بجائے میں حق بجانب تھا یا نہیں؟

اس نے روشنا کے ساتھ اچھا کیا یا برا؟

اس کے بنائے ہوئے میزان نے روشنا کے لیے صحیح فیصلہ دیا یا نہیں؟

یہ مسعودی مردانگی تھی یا اس کی کم ظرفی؟

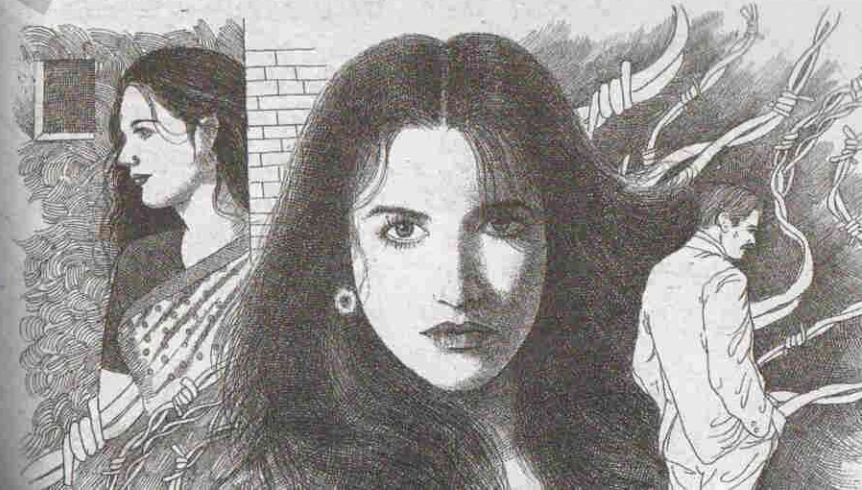
وہ بس خاموش کھڑا کارڈ میں منہ دیے بلکتی ہوئی روشنا کو دیکھتا رہا۔

پادشاه کے کچھ

صدیوں کی مسافت طے کر کے آئی ہوں۔ میرا انگ
انگ سٹکن زدہ تھا۔ آنکھیں گویا رو کر تھک چکی
تھیں۔
میں بھلا کس کا گریبان پڑتی، کسے مجرم ٹھہراتی۔
میری بات پر بھلا کس نے ایمان لانا تھا۔ میں ممّا کو کچھ
بتاتی تو نہیں پائی تھی۔ بھلا بتاتی بھی کیا؟ یہ میرا اپنا ہی تو
فیصلہ تھا۔ ممّا نے مجھے کس قدر سمجھایا تھا مگر میں اپنی
سادگی میں کچھ سمجھ ہی نہیں پائی۔
مجھے چرے بڑھنے کا دعوا تو بھی نہیں رہا تھا مگر میں
حیران تھی کہ بعض لوگ کس طرح صورت بدل بدل
کر سامنے آتے ہیں۔ ہر دفعہ ان کا نیا چہرہ نظر آتا تھا۔

پاہر چمکتی دھوپ کا راج تھا۔ گرم لوکے تھپیڑوں
نے گویا ہر شے کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے کھڑکی
کے پردے ہٹا کر باہر دیکھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا میرا دل
سینہ توڑ کر گرم اور جھلسا دیئے والی زمین سے پٹ پٹ
کر تین کر رہا ہے۔
ابھی کچھ دیر پہلے ممّا مجھے بہت سمجھاتی بھجاتی رہی
تھیں۔ زندگی کے نشیب و فراز، اتار چڑھاؤ۔ مگر میں
انہیں بھلا کیا بتاتی۔ یہ راول تو آتش کدہ بنا ہوا تھا۔ میں
مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بنادی گئی تھی۔ میرے
لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا خود کشی کے برابر تھا۔
آج اٹھواں دن تھا اور مجھے لگتا تھا گویا میں

مکھنٹاؤں۔



ایسا چہ جو کسی بھی سادہ دل رکھنے والے کو دھوکے میں مبتلا کر سکتا تھا۔

میری سادگی میرے لیے ہمیشہ نقصان کا باعث بنی تھی مگر اس دفعہ تو میرے دل کا نقصان ہو گیا تھا، یوں لگتا تھا گویا کسی نے میرا دل نوچ کر کسی پتھر کے نیچے رکھ کر چل دیا ہے۔

مجھے اس سے بے تحاشا محبت جو ہو گئی تھی اور میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کبھی اس طرح کسی اور کی جھوٹی داستان سن کر بہ گمان ہو جائے گا۔ اس کی بدگمانی کے گھاؤ نے میرے دل میں نیزے اتار دیے تھے۔

مگر میرے ساتھ بھلا ہوا کیا تھا؟



ان دنوں میرے ستارے گردش میں تھے۔ نجانے کس منحوس گھڑی میں وہ ماہ سے ڈیڑھ دن خود بخود ٹھیک ہو گیا تھا اور مہاتک یہ منحوس خبر بغیر کسی دشواری کے پہنچ چکی تھی۔ سدا کی دشمنی، لسان اور ہلا کی کم ظرف غانیہ کے ہلکے پیٹ میں میرے یعنی ساجیہ مراد کے متعلق ”دختر بھلا“ کے ٹھہر سکتی تھی مہما کو فون کھڑکا کر میری شان دار کامیابی کی اطلاع پہنچادی تھی۔

”خالہ! ساجی میٹرک میں ہیٹ ٹرک مار چکی ہے۔ اس مرتبہ بھی سابقہ ریکارڈ قائم رکھا ہے محترمہ خیرے صرف تین مضمون کلیئر کر سکی ہیں۔ باقی سب میں گول انڈا لگا ہے پرچوں میں نیاری، جیلیبی اور گلاب جامن کی ترکیب لکھ کر آئی تھی۔“

فون تو بند ہو چکا تھا اور مہما جوتے سے میری دھناتی کرنے کے بعد صوفے پر بیٹھی ہانپ رہی تھیں۔ غم وغصے سے ان کا سرخ و سفید چہرہ ہمتا رہا تھا۔ سبز آنکھوں نے شعلے لپک رہے تھے۔ یونیورسٹی کی پوزیشن ہولڈر میری پیاری مہما کا صدے کے مارے برا حال تھا۔

”بے شرم! چلو بھائی میں ڈوب مرو۔ انیس سال کی ہو چکی ہو۔ ابھی تک میٹرک میں انکی ہو۔

تمہارے ساتھ کی گریجویشن اور اسٹریڈ کر کے دو۔ بچے بھی کھلا رہی ہیں۔“

”آپ کی سستی کی وجہ سے لیٹ ہو رہی ہوں۔ ورنہ اس وقت آپ بھی ناؤ بن چکی ہوتیں۔“ میں نے افسوس کے عالم میں مہما کو گزرتے وقت کا احساس دلانا چاہا تھا۔ مہما جلا کر دو سراجو اتارنے لگیں۔

”سوری مہما! میں فوراً صوفے کی اوٹ میں کشن اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مہما میری بے حیالی کے اس عظیم مظاہرے کو ملاحظہ کرنے کے بعد نجانے کس سوچ میں گم ہو چکی تھیں۔

میری نظریں مہما کے خالی پیروں پر تھیں۔ سو میں اطمینان سے صوفے پر بٹھے کئی عام حالات میں وہ

چوتے کے ساتھ پھینٹی لگانا سیرز کے خلاف سمجھتی تھیں۔ عام حالات میں تو محض مجھے گھوریوں سے ہی نواز دیا جاتا تھا۔ اور مہما کی گھوریوں کا اثر ہی اس قدر ہوتا تھا کہ میں فوراً ہی خواص باندھ جاتی۔ اگرچہ مہما کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ میری جوتے کے ساتھ دھناتی کریں مگر خیرے ”مہما! یہی کچھ ایسا تھا کہ وہ بھی کہاں تک ضبط کرتیں۔

میٹرک میں مجھے تیسرا سال لگ چکا تھا۔ میری کلاس فیلوز اور کزنز وغیرہ مجھ سے کہیں آگے نکل چکی تھیں، مگر میں اپنے کند ذہن کو بھلا کہاں سے پالش کرانی اور پھر سائنس دانوں کی ”بکواس“ میرے دماغ میں سمائی ہی نہیں تھی۔ نجانے کتنے ہی ڈیوٹر میری نالائقی سے گھبرا کر دوسرے ہی دن بھاگ گئے تھے۔ مجھ جیسی کند ذہن، نالائق، کوڑھ مغز کے ساتھ بھلا دماغ کھپانے کی ضرورت ہی کیا تھی جسے طبیعات کے تعارف کی الف ب بھی نہیں آتی تھی۔

باقی مضامین میں بھی میری دچکی ایویں سی تھی۔ ریاضی کو دیکھ کر تو مجھ پر زلزلہ طاری ہو جاتا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں یہی کوئی چار پانچ ماہ پہلے فزکس کی تیاری کرواتے ہوئے، میری جان سے پیاری غانیہ نے اچانک میری ذہانت کو جاپنچے اور جو کچھ پڑھایا تھا اس کا شیٹ لینے کی غرض سے یو جھا۔

”ساجی! دس منٹ کے اندر اندر جواب دیتی جانا“ آج تمہیں پڑھا کر میں نے اسو کی طرف جانا ہے۔ وہ میرے لیے کاٹکا اور چیخوف کی کتابیں لے کر آیا ہے۔ اور میں وہ کتابیں پڑھنے کے لیے سخت بے چین ہو رہی ہوں۔“

غانی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ ان فضول کتابوں کے نام لے کر گویا پوری پوری اور خطائی کا ذائقہ اس کے منہ میں گھل گیا تھا۔ میرے منہ کے ڈاؤن اسو کا نام سن کر ہی سننے، بگڑنے لگے تھے۔ منہ میں گویا کڑوے یادام آگئے۔ حالانکہ یہ چاکلیشی ہیرو جیسا کزن فرینڈز کے درمیان گردن اگڑانے اور دوستوں کے درمیان ویلیو بنانے کا سبب تھا۔

”چھوڑو بھی غانی! جس رائٹر کا نام ہی اتنا خوف زدہ کر دینے والا ہو۔ اس کی تصنیف کتنی بکواس ہوگی۔ بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا چیخوف۔ یعنی نرا خوف ہی خوف۔ اور یہ فرانس کا کڈا۔ ایسے لگتا ہے جیسے براہِ زور کاٹنے یعنی فورک کاڑ کر کیا جا رہا ہے۔ ہائے غانی! مجھے تو بھوک بھی لگ گئی ہے۔“ میں نے پیٹ پکڑ کر دہائی دی تو غانی نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میرے سر پر دے ماری۔

”بھوسا بھرا ہوا ہے یہاں۔“ کتاب کے وزن سے میرے دماغ کی چولیس ہل کر رہ گئی تھیں۔ اوپر سے غانیہ کاموڈ بگڑ گیا تھا۔

”تمہیں ٹھیک ہی یاد رہن، دھون اور وزن کا خطاب دیا گیا ہے۔ تمہارا دماغ پڑھنے کی طرف نہیں مائل ہونے والا۔ پکانے اور کھانے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا۔ کھا کھا کر ایک دن غبارے کی طرح پھٹ جاؤ گی۔ موتی!“ غانی میری اچھی صحت پر حوت کرنے سے باز نہیں آتی تھی اور کھانا پکانے کے طعنے دینا تو مہما اور ان کی پیاری بھانجی غانی کا برہنہ مشغلہ تھا۔ میں نے تو اکثر ہی ماؤں کو آپس بھرتے دیکھا ہے کہ ان کی پیٹیاں بچن کے نام سے ہی دور بھاگتی ہیں۔ سینے پر پونے کا بھی کوئی شوق نہیں ہوتا۔ گھر کے کام کاج سے

الرجک ہوتی ہیں جبکہ مجھ میں گھوڑ خواتین والے سارے جراثیم پائے جاتے تھے۔ مگر میرے ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کر مہما اشتباہی تھیں۔

”بھئی اسی شوق اور جذبے سے کتاب بھی پکڑ لیا کرو۔“ یہ طعنہ تو مہما کی لوگ زباں پر ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ نجانے مہما بھی کیسی ماں تھیں۔ یعنی میں جو ایک شرا میڈ کی خدمات سر انجام دیتی تھی۔ ان کی مہما کے نزدیک اس کی کوئی ویلیو نہیں تھی۔

”ساجیہ مراد! میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ علم موسیقی اور آواز پر سائنسی دریافتیں کرنے والے سائنس دان کا نام بتاؤ جو کہ تیسری صدی ہجری میں بعصر میں پیدا ہوا تھا۔“ مجھے سوچوں میں الجھا دیکھ کر غانی نے کافی ناراضی کے عالم میں اپنا سوال دہرایا۔

”تیسری صدی ہجری میں کون پیدا ہوا تھا؟“ میں نے یادداشت کے سارے خائے کھنگالنے شروع کر دیے تھے۔

”کون سی ایسی کھانے والی چیز کے نام سے ملتا جلتا نام تھا۔ علم موسیقی کو دریافت کرنے والے سائنس دان کا۔“ میں زیر لب برہواتے ہوئے سخت ٹینشن میں مبتلا ہو چکی تھی۔

”ساجی! غانی کے ضبط کا بیان لہرز ہو گیا تھا اور میرے منہ سے اچانک لقمہ برآمد ہوا۔ ”شکر قدی“ یعنی الکندی۔“

”بھائی! جاؤ تم۔۔۔ ایک سوال کے جواب میں پندرہ منٹ برہا کر دے ہیں۔ پیر میں نجانے تم کیا کرو گی۔“ غانی درست جواب سن کر مجھ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔

”سوری غانی!“ میں نے بھی غلطی تسلیم کر کے معافی مانگنے میں دیر نہیں کی تھی۔

”آخری جواب بتاؤ، پھر جان چھوٹ جائے گی تمہاری۔ ویسے بھی ”کمبر“ لگنے والا ہے۔“ غانی میری دلی کیفیات سے واقف تھی۔ تب ہی تو میرے فیورٹ ڈرامے کا ذکر کیا تھا۔

”پوچھو“ میں نے شان بے نیازی سے جواب دیا۔
”حالت سکون سے چلنے والی کار کی ابتدائی ولاشی
کتنی ہوتی ہے؟“

”یہ ولاشی صفر ہوتی ہے۔“ میں نے بھی نظر بچا کر
کتاب میں سے ایک کر دیکھا اور جھٹ سے جواب
بھی دے دیا تھا۔ غالی کون سامیری طرف متوجہ تھی۔
اپنا ہینڈ بیک کھولے بل کا پیکٹ نکال رہی تھی۔ سو
میرا بھی کام چل گیا اور آج ان ہی چھوٹی مٹی
”پتھریوں“ کا خسیارہ میل ہونے کی صورت میں بھگت
رہی تھی۔

ممانے کافی سوچ بچار کرنے کے بعد سراٹھا کر میری
طرف دیکھا تھا اور پھر بولیں۔
”ساحیہ! آئیں سمیٹ کر نیچے آجاؤ۔ میں تمہاری
پیکنگ کرنے لگی ہوں۔“

”مگر کیوں ممانے! میں حیران پریشان ہی تو رہ گئی تھی۔
”تم نبیلہ کے پاس جا رہی ہو۔“ انہوں نے فیصلہ
کن انداز میں کہا۔
”پھوپھو کے پاس مگر کیوں؟“ اپنی ہلترناپ پھوپھو
کے پاس جانے کے متعلق سوچ کر ہی میں لرزا تھی
تھی۔

”اس لیے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں
مانتے۔“
”مما پلیر! میں منمناتی رہ گئی تھی۔



”ڈیڈی! ممانے مجھے اسلام آباد بھجوانے لگی ہیں۔“
ڈانگ روم میں گھستے ہی میں نے ہائی دینا شروع کر دی
تھی۔ تائی ائی یعنی بڑی ماما اور ڈیڈی (تایا ابو) آدھا
گھنٹہ پہلے ہی گھر آئے تھے۔ دونوں عدا بھائی کے بیٹے
کو دیکھتے کراچی گئے ہوئے تھے۔ عدا بھائی ڈیڈی کے
اکلوتے بیٹے تھے اور میں اپنے پاپا اور ماما کی اکلوتی بیٹی۔
بس یہی ہمارا مختصر سا خاندان تھا۔

عدا بھائی مجھ سے چندہ سال بڑے تھے۔ ان کی
شادی کو نو سال ہونے والے تھے اور ان کے ہاں

تیسرے بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے دو ماہ
بعد بڑی ماما اور ان کی واپسی آج ہی ہوئی تھی۔ اور
میرے میل ہو جانے والے کارنامے کے متعلق بھی
انہیں بتا چل چکا تھا۔

”سانہ! ہماری بیٹی کو اتنی دور مت بھجواؤ۔ بھلا اس
چمکتی پینا کے بغیر ہم رہا میں گے۔“ ڈیڈی فوراً جذباتی
ہو گئے تھے۔

”بھائی جان! اس تالاق کو نبیلہ ہی سدھار سکتی
ہے۔ شاید میٹرک میں یہ پاس ہو ہی جائے۔“ ممانے بھی
جذباتی ہوئی تھیں اور مجھے بھی کر دیا تھا۔

”مجھے آئرس پڑھنے دیتیں تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔“
”زبان، بہت چلتی ہے تمہاری۔ دماغ کو بھی کبھی
زحمت دے لیا کرو۔“ ممانے میرا پیچ میں بولنا قطعاً
نہیں بھایا تھا۔

”سانہ! ساجی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بچے کا شوق اور
دلچسپی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ بیشہ کی طرح پیلا اور
ڈیڈی میری حمایت میں بولے تھے۔

”آپ کی ان ہی باتوں نے اس کا دماغ خراب کر
رکھا ہے۔“ ممانے کامو آف ہو چکا تھا۔ میں نے ہمیں
برائی اور تکہ بولی سے خوب انصاف کیا اور دعا پڑھ کر
اپنے کمرے میں چلی آئی۔

صبح ہر صورت مجھے اسلام آباد جانا تھا اور آج کی
رات میں جی بھر کر سونا چاہتی تھی۔ بد قسمتی سے میں
مما اور پاپا کی اکلوتی اولاد تھی۔ اگر ان کے اور بھی تین
چار بچے ہوتے تو شاید ممانے کی توجہ بٹ جاتی۔ مگر ہمارے
خاندان میں بچوں کا فقدان تھا بلکہ قحط کہنا مناسب
ہو گا۔

اللہ بخشے داوی مرحومہ جب زندہ تھیں تو ماما اور
بڑی ماما کی ہر وقت شامت آتی رہتی تھی۔ انہیں اس
بات کا بہت قلق تھا کہ ان کی اولاد کی بہت کم اولاد ہے
بڑی ماما کی بیٹی کی ماں تھیں۔ اسی لیے ان کی کچھ
بجٹ ہو جاتی تھی۔ البتہ میری ماما پر تو داوی کا اثر و پیشتر
عذاب نازل ہوتا رہتا تھا۔

”سانہ! اس ”شیرنی“ کو پیداکر کے گویا کے ٹوکا
ہماڑ سر کر لیا ہے۔“ داوی بھی میری اچھی صحت سے
خاصا جلتی تھیں۔ یہی حال نبیلہ پھوپھو کا تھا۔
”دماغ کو زحمت جو نہیں دیتی۔ اسی لیے گوشت
کا ہماڑ بنتی جا رہی ہے۔“

انہوں نے میرے بھرے بھرے سڈول سراپے کو
گوشت کے ہماڑ سے تشبیہ دے کر میرے نازک
جذبات کو بری طرح سے مجروح کر دیا تھا۔ اپنی تو صرف
دو ہی منجینی سی تاؤ کی طرح لمبی، سوکھی پالش جیسی دو
پٹیلیاں تھیں اور ڈگریاں میرے حصے کی بھی انھیں کر
رہی تھیں۔ اس طرح کے رویوں کی میں بچپن سے
ہی عادی تھی۔ میری صحت اور تعلیم یہ دو ایسے مسئلے
تھے جو میرے خاندان والوں کے لیے مسئلہ فلسطین بن
چکے تھے۔ نہ تو میں ممانے داوی اور پھوپھو کی خواہش کے
مطابق اپنی صحت ڈانٹینگ کے شوق میں تباہ کر سکتی
تھی اور نہ ہی میٹرک میں مجھ سے پاس ہوا جا رہا تھا۔ یہ
دونوں کام یوں لگتا تھا جیسے میرے اختیار سے باہر ہیں۔
کھانا پینا پھوڑ کر میں کیسے لی بی کی مریضہ بن سکتی
تھی؟

”سوکھی سڑی پٹریوں کی ڈھانچہ سی ساحیہ ملا بھلا
کیسی لگتی؟“ یہ سوچ ہی مجھ پر کچھ طاری کر دیتی تھی۔
سو میں ڈٹ کر تینوں وقت کا کھانا کھاتی تھی۔ ماما کی
گھوریوں کی پرواہ کیے بغیر۔ اور رہا پڑھائی کا مسئلہ۔ تو
شاید کسی نہ کسی طرح میرا میٹرک میں اے پس آ جانا
اگر ممانے آئرس پڑھنے دیتیں۔ شاید اس وقت میں
اردو ادب یا فائن آرٹ میں اپنا نام بنا چکی ہوتی۔ مگر
ہائے میری قسمت مجھے تو ابھی تک بری کرٹ اور
مقاطعتیہ سمیت کے درمیان تعلق کو معلوم کرنے والے
کانہیں پتا تھا کہ وہ فلسفہ تک ہے، نیوٹن ہے، فیراؤلے
ہے یا پھر اور سڈ ہے۔

انہی تانہ ترین بے عزتی پر میں جی بھر کے تمللا
رہی تھی۔ اس تمللا ہٹنے تو زندگی بھر میرے ساتھ
رہی رہتا تھا اور اب جو نبیلہ پھوپھو کے پاس بھیج کر مجھ

بے چاری پر ظلم کے ہماڑ توڑے جا رہے تھے مگر بھلا
ہو میرے پارے ڈیڈی کا۔ انہوں نے صبح صبح ناشتے
کی میز پر ایک جذباتی تقریر کر کے ماما کے ارادوں کو
ڈانواں ڈول کر دیا تھا۔ تب ہی تو ممانے شو کو میری
پیکنگ کھولنے کا آرڈر دے کر مجھے حد سے زیادہ مسرور
اور شاد کر دیا تھا۔

ڈیڈی کی بے پایاں محبت پر پہلے بھی مجھے شک
نہیں تھا مگر اب تو اس محبت پر گویا ہلک چلی تھی اور
ادھر ڈیڈی میرے کان میں کہہ رہے تھے۔

”ان دونوں خواتین کے ہاتھ سے نہ بد مزہ کھانے
کھا کر ہم نے بھلا مرنا تھا کیا؟ مجھے اپنی بیٹی کے ہاتھ سے
بہن کانی پی پی بغیر نیند بھلا آ سکتی تھی؟“

”مگر ڈیڈی! یہ فزکس اور کیمسٹری۔“ میں رو دینے کو
تھی۔

”ارے، چوبیسے میں جھو کو فزکس کو۔ کوئی
ضرورت نہیں، کتنی سی جان کو غم لگانے کی۔ اگلے
سال آرام سے پیسے دے لینا۔“

پاپا نے لاہروالی سے میرے شانے تھپتھپائے
ایسے ہی تو میں اپنے پاپا اور ڈیڈی کے گیت نہیں گاتی
تھی۔ انہوں نے بھی مجھے مایوس ہونے نہیں دیا تھا۔
ان کی ایسی ہی محبت کی وجہ سے میں ابھی تک میٹرک
میں اچھی ہوئی تھی۔ دراصل رزلٹ آنے کے بعد ممانے
مار کٹائی کا پریڈ لیتی تھیں۔ اور پھر میں تین چار گھنٹے
سوگ کی کیفیت میں گزار دیتی تھی پھر میری سوچی سوچی
آنکھیں دیکھ کر ڈیڈی اور پاپا جی جان سے میری بہت
بندھاتے تھے۔ ان سے میری البیوریہ رائے جیسی
مونی مونی آنکھوں میں آنسو جو نہیں دیکھے جاتے تھے۔
”ساجی! اینٹین نہیں لیتا بیٹا، مگر تے ہیں شمسوار
ہی میدان جنگ میں۔“ تم ایک دفعہ پھر کو خوش کرو
محبت کرو۔“ یہ ڈیڈی کے الفاظ ہوا کرتے تھے اور ممانے
تپا ہو جاتیں۔

”بھائی جان! آپ کو کتنی کی ضرورت نہیں، یہاں
نیشنل لی نہیں ڈی جاتی ہے۔“

”اگر یہ ٹینشن لیتی تو اس کا طول اور عرض اتنا پھیلا ہوا نہ ہوتا۔“ اسود بھائی بھی میری ”صحت“ کے دشمنوں میں سے تھے۔

”ہو نہ، خود بڑے اسماٹ ہیں۔“ میں نے ناک چڑھائی۔

”بک بک سن لو بس۔“ مماغھے سے بولیں۔ ”جاؤ“ اسود کے لیے چائے بنا لاؤ۔

”ہم کے وقت ساجیہ یاد آجاتی ہے۔“ میں کہنے سے باز نہیں آئی۔ ”فری سے کہیں چائے بنا لائے۔“ میں نے شان بے نیازی سے کہا۔

”مجھے جوشاندہ نہیں پینا۔“ اسود بھائی نے ناگواری سے کہا۔ ”ساجی کے علاوہ کوئی اچھی چائے بنانی نہیں سکتا۔“ اب وہ میری تعریف کر رہے تھے۔ جسے میں سرا سر خوشامد سمجھ رہی تھی۔

”مسک مت لگائیں۔“

”یہ مسک کیا ہوتا ہے؟“ وہ حیران ہوئے۔ ”مک بات تو ج ہے۔ میری بہن سے اچھی کوئی چائے بنانی نہیں سکتا۔“

”بہن۔“ صدے کی شدت سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ نجانے کچھ خوبصورت اور قابل لڑکے کو میں بہن ہی کیوں لگتی تھی۔

اگر شادی ہو جاتی تو کم از کم پڑھنا تو نہ پڑتا۔ اور میں واحد ایسی لڑکی تھی جو اپنے لیے بھرے بے کھانے پینے کے شوقین سرسالی کی دعا میں مانگتی تھی۔ جنہیں گھانے ٹھنسا کر میں اپنا کرویدہ بناتی اور کم از کم وہ مجھ سے میری ڈگریوں کے بارے میں نہ پوچھتے۔

مما کے نزدیک میں ساری دنیا کی لڑکیوں سے زیادہ نالائق، جاہل اور کندھ بن تھی۔ مگر دل میں وہ میرے گھبراپے کی قابل ضرور تھیں۔ میں ہر فن میں طاق تھی اور میرے سکھ دے کا سارا کریڈٹ بڑی ماما کو جاتا تھا۔ انہوں نے مجھ کو لنگ سے لے کر سلائی کڑھائی تک، ہر فن میں طاق کر دیا تھا۔ مگر ماما کے نزدیک میری ان خوبیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ

”ویلے لوگوں کے سیاپے“ کہہ کر میری ان خوبیوں کو مٹی میں رول دیتی تھیں۔

”ساجی! ایک تو تم نجانے کس مراقبے میں چلی جاتی ہو۔“ ممانے تھکی سے کہا ”اب اٹھ بھی چلو۔“

”جاری ہوں۔“ میں دھپ دھپ کرتی کچن میں چلی گئی۔



میں بڑے شوق اور جذبے کے ساتھ فٹ کر رہی بن رہی تھی۔ چھلی کو مین لگا پہلے سے رکھ دیا تھا۔ پیاز بھی گولڈن کر لی تھی۔ فٹ بھی فراہم ہو چکی تھی۔ بس آٹھے کھنے کا کام تھا۔ ساتھ ساتھ اٹالین سلاڈ کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ یہ مینو ڈیڈی کی پسند کے مطابق صبح ہی میں نے ترتیب دیا تھا۔ کوفتہ بریانی دم پر تھی۔ اسی بل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں وقت ”وقتاً“ سلیب پر رکھے نوٹس پر بھی نگاہ ڈال رہی تھی۔

”آف“ اب فون سننے لاؤنج میں جاؤں۔“ میں نے بھنا کر سوچا۔ فون بے چارہ بچ کر خاموش ہو گیا تھا۔ تب ہی ماما اور بڑی ماسٹنگ روم سے پر آمد ہوئیں۔ نجانے کون سی مینٹنگ کر کے فارغ ہوئی تھیں۔

”کس کا فون تھا ساجی!“

”ابن اہنیم کا ہو گا۔“ میں نے رٹا لگاتے ہوئے سلاڈ کے لیے خربوزہ کاٹنا شروع کر دیا۔

”ہیں۔ وہ کون ہے؟“ بڑی ماما بے حد حیران ہوئیں۔ فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی تھی۔ بڑی ماما ابن اہنیم کے متعلق تفصیل پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئیں۔ کچھ دیر بعد مجھے بڑی ماما کی افسردہ سی آواز سنائی دی۔

”کچھ دن بعد آئیں گے۔ کسی کھیلو پر اہلم کی وجہ سے ان کا پروگرام ملتوی ہو گیا ہے۔“

”اس کے نصیب ہی ٹھنڈے ہیں۔“ ماما کی منتظر اور شدید پریشانی میں ڈوبی آواز سنائی دی تو میں نے چونک کر ان دونوں خواتین کے منتظر چروں کی طرف دیکھا۔

کس کے نصیب ٹھنڈے ہیں۔ یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ ماما کا اشارہ یقیناً ”میری ذات گرامی کی طرف تھا۔ شاید کچھ مہمانوں کو آنا تھا اور اب ان کا پروگرام بدل گیا تھا۔ یقیناً“ انہیں بھی میرے مونٹاپے کی پھٹک پڑ چکی ہوگی۔ ایسا ایک دو مرتبہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔

میری ذات کے ساتھ بے شمار مسائل کا انبار بھی جڑا ہوا تھا۔ ایک تو میری نالائقی، دوسرا میرا پھیلا ہوا وجود۔ تیسری یہ گز بھر کی زبان جو نے نے مہمانوں کو دیکھ کر منہ کے اندر رکھتی ہی نہیں تھی۔ کج بخت تیز کام کی طرح چلتی جاتی تھی۔

پچھلے دنوں کچھ خواتین آئی تھیں۔ میرے گورے بچے خوب بھرے بھرے سراپے کو کھاجانے والی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ بعد میں کہلا بھیجا، انہیں آنے کی بوری نہیں چاہیے۔ بس مجھے بھی غصہ آگیا۔ بڑی ماما کی برسل ڈائری میں سے ان خواتین کا فون نمبر چرا کر وہ لٹے لیے کے یاد ہی کرتی رہیں گی تمام عمر اس شاندار بے عزتی کو۔ ساجیہ مرا کو آنے کی بوری کہنے کا نیا ذہن بھگتا تو تھا ہی۔ میں نے بھی ان کے منجے پیٹنے کی شان میں ایسے ایسے القابات کہے تھے کہ بے چاری تمام عمر جلتی جھنکتی رہیں گی۔

یہ دوسری منحوس ترین ٹیلی فون کال تھی۔ جو میری زندگی میں بھونچال لانے کا باعث بنی۔

ماما کی پریشانی نے مجھے بھی جج پریشانی کر دیا تھا، مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ماما کو ان دنوں مجھے پڑھائی کی افادیت پر لمبے لمبے لیچوروں کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ دو سراجیت کا جھکا مجھے تہہ لگا۔ جب آئرس کی کتابیں میری رائٹنگ ٹیبل پر جگ لگیں۔ ممانے اپنی ضد چھوڑ دی تھی۔ ان دنوں کے سرے مجھے دھیر سارا پڑھانے کا بھوت اتر چکا تھا۔ اب وہ مجھے سلم اینڈ اسماٹ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے سلمنگ سینٹر کی میڈم سے بات بھی کر لی تھی۔

اوپر میرے کچن میں گھسنے پر شدید باندی لگ چکی

تھی۔ میں اپنے پسندیدہ بجیکٹ دیکھ کر اس قدر خوش نہیں ہوتی تھی جس قدر کچن میں گھسنے پر باندی نے مجھے اُدھ مولا کیا تھا۔ ماما مجھے صبح پانچ کا پد مزاپانی پلا کر دیے کی ایک چھوٹی سی پیانی پکڑا دیتی تھیں۔ تین دن اس نالائقی اور ظلم کے بعد میں نے اپنے زرخیز داغ سے کچھ نئی ترکیبیں نکال لی تھیں۔ کبھی ڈیڈی اور کبھی ماما سے دو تین سو روپے لیتا میرا معمول بن گیا تھا۔ کیونکہ ماما اور بڑی ممانے مجھے دیلا کرنے کے لیے جو عہد کر رکھا تھا۔ اس عہد کو مد نظر رکھ کر میری پاکٹ منی بھی بند ہو چکی تھی۔

اب ماما مجھے پڑھائی پر نہیں بلکہ ڈائننگ پر بڑے بڑے اور لمبے لیچور دیتی تھیں۔

ان دنوں ماما کی سب سے بڑی ٹینشن میرا بڑھتا ہوا وزن تھا۔

جس دن میرا میٹرک کا شاندار رزلٹ آیا، یہ اسی دن کی بات ہے۔ یہ دن میرے لیے خوشگوار نہیں تھا۔ حالانکہ ماما اور بڑی ماما میرے پھولے پھولے گلابی چہرے پر نہ جانے کتنے ہی بو سے دے چکی تھیں۔ ماما میرے اچھے رزلٹ پر پھولے نہیں سارہی تھیں۔ اور ڈیڈی فخریہ کہہ رہے تھے۔

”میں نہ کہنا تھا سارا! ساجی کو آئرس پڑھنے دو، بچے کی دلچسپی اور شوق کو اولیت دینا چاہیے۔“ ماما آج ڈیڈی سے متفق ہو چکی تھیں۔ انہوں نے کسی بھی قسم کی جھٹ نہیں کی تھی۔

رات کو خالہ نے ماما کو فون کر کے بتایا۔

”آپا! بڑی آپا نے اسود کے لیے غائبہ کو مانگا ہے۔“

اس خبر نے ماما کے چہرے کے سارے رنگ اڑا دیے تھے۔ شاید وہ بھی اسود بھائی کو بطور داماد پسند کر چکی تھیں۔ تاہم بھانجی کی خوشی پر انہوں نے کم ظنی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ پہلے چھوٹی خالہ کو اور پھر بڑی خالہ کو مبارکباد دی۔

اوپر میرے اربابوں پر بھی اوس پڑ چکی تھی۔ غالی اور اسود بھائی سے اچھے اچھے گفتگو وصول کر کے

میں نے بھی اوپری دل سے انہیں مبارکباد دی۔ اگر اسو بھائی کے ساتھ بات بن جاتی تو میں نے ایف اے کے بجائے شادی کرنا بھی۔ مگر ہائے میرے نصیب جو بقول ماما کے بالکل برف یا آئس کریم کی طرح ٹھنڈے تھے۔

خاندان کے سارے ہی لڑکے ایک ایک کر کے کھوئے۔ سب بڑھ چکے تھے۔ جنا اور میا جیسی تالائق لڑکیاں بھی دو دو بچوں کی انامیں بن چکی تھیں۔ میرا دل جل جل کر خاک ہو رہا تھا۔ اور اصر اسو بھائی اور غالی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھی۔

ماما بھی ہنسی خوشی کبھی چیز تو کبھی بری کی شاپنگ کروانے چلی جاتی تھیں۔ بچن ان دنوں میرے صحت مند کندھوں پر تھا۔ سو میں جی بھر کر چٹ پٹے کھانوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

ڈیڈی اور پاپا بھی خوب مزے کر رہے تھے۔ ان دنوں دونوں کو پرہیز بھول چکا تھا۔ میں بھی فرائی لاسٹ کو دیکھتے ہوئے مینو ترتیب دیتی تھی۔

بڑی ماما کو عرصہ ہوا بچن کو زیادہ کدھ چکی تھیں۔ ہائی بلڈ پریشر کے مرض نے انہیں خاصا عاجز کر دیا تھا۔ اور

ماما کو بھی میں اب کم کم ہی بچن کی طرف جانے دیتی تھی۔ مگر جب سے ماما کو میرے پھیلنے و جود کو دیکھ کر شاک لگا تھا اور میرا اب تک رشتہ نہ ہونے کی یہ بہت بڑی ”وجہ“ معلوم ہوتی تھی تب سے بچن میں میرے داخلے پر پابندی لگا دی تھی مگر خیر اب تو آزادی ہی آزادی تھی اور میں اس آزادی سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔

شادی کے ہنگامے جون ہی سرد رہے ماما نے میرا دوبارہ وزن کروایا اور پھر کچھ مت پوچھیے میں اپنا پندرہ کلو وزن بڑھا چکی تھی۔ ماما نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

میں نے انٹر میں ایڈمیشن کیا لیا مصروف سے مصروف تر ہوتی چلی گئی تھی۔ پر بھائی اور کھانے کے علاوہ مجھے کچھ سوچنا ہی نہیں تھا۔ بڑی ماما کے داخلہ ہو گئے۔

”سنا آباؤ کی روجی کارشتہ بھی طے ہو گیا۔“ یہ خبر خاصی روح فرسا تھی۔

”اچھا۔“ ماما مدے کے مارے بول ہی نہ سکیں۔ ”اچھی خاصی مونی اور ساوولی سی مگر پویش ہو لڈر تھی عمر کچھ زیادہ ہو گئی تھی اسی لیے بے چاری بائو بہت بریشان تھی۔“ ماما نے میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔

”چلو! باؤ کی بریشانی تو دور ہوئی۔ اللہ سب کی بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے۔“ بڑی ماما نے صدق دل سے دعا کی۔ نظرس ہنویز مجھ پر تھیں۔ گویا خصوصاً ”میرے لیے بھی دعا کی گئی تھی۔“

”روحی باجی کی شادی میں کون جائے گا۔“ مجھے اپنے کپڑوں کی فکر ہو گئی تھی۔ سو بے باکی سے پوچھنے لگی۔

”تم تو ہرگز نہیں جاؤ گی۔“ ماما کا انداز فیصلہ کن تھا۔

”کیوں؟ اب تو میں میٹرک بھی کر چکی ہوں۔“ میں نے روٹی صورت بنا کر کہا۔

”بڑا تیرا رالیا ہے تین سال میں میٹرک کر کے۔“ ماما تو ساسوں کی طرح خطرے میں باہر تھیں۔

”نکرتو لیا ہے نا۔ اگر اس دفعہ بھی فیل ہو جاتی تو اچھا تھا۔“ میں گلے کر لیتی۔

”بے وقوف! حق ڈرا عقل نہیں۔ اگلے گھر جا کر نجانے کون کون سے ”گل“ کھلائے گی۔“

”مجھے گل کو منہ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو اچھی طرح سے خبر ہے میں ”گل“ سے کس قدر چڑتی ہوں۔“ گل ہماری بیڑوں بھی پاپا کے دوست کی بیٹی۔ ان دنوں چھٹیاں گزارنے کینڈا اگنی ہوئی تھی۔



میں اس وقت ٹیرس پر بیٹھ کر کیلیوں کے ساتھ معمولی سا انصاف کر رہی تھی۔ صرف چھ کیلے ہی کھائے تھے۔ جب میری بیڑوں کے ٹیرس کی ریٹنگ ہوتی تھی۔

جنگے ایک سیاہ چمکتی آنکھوں والے خوبو لڑکے نے مجھے ساتواں کیلا اٹھاتے دیکھ کر گویا کتنی مکمل کردی تھی۔

”اب مزید ایک بھی کیلا مت کھانا۔ ورنہ تمہارا نہ سہی، میرا اپنا معدہ تمہیں کیلے کھاتے ہوئے دیکھ کر پھٹ جائے گا۔ بائی گاڈ! بیٹ ہے کہ کتناں، ابھی دو سرخ سرخ سیب بھی پلیٹ میں ڈھک کر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کسی اور کے معدے میں ڈالو گی؟“ وہ مسلسل پوٹا ہوا بڑی بے تکلفی کے ساتھ ہمارے ٹیرس پر کود گیا۔ یہ کیلے سیب تو مجھے ہضم ہو سکتے تھے مگر ان خیرتم کی بے تکلفی ہرگز نہیں۔

”کون ہو تم؟“ میں نے اسے اڑی اڑی مڑی میں دباڑنے کی کوشش کی تھی مگر گلے میں کافی تکلیف دہ خراشیں پڑ گئیں۔

”میں داؤں کا کیف ہوں۔“ مقابل نے خاصا جھوم کر بتایا۔

”میں کہہ رہی ہوں، اپنا نام بتاؤ؟“ مجھے ایک دفعہ پھر تنبیہ بنانا پڑا۔

”جیسا تو ہے۔ کیف ہوں، سرور ہوں، نشہ ہوں، شمار ہوں۔ مستی ہوں۔“ وہ پھر سے دلار بھرے انداز میں بولا۔

”یہ سارے نام تمہارے ہیں؟ احمق! مجھے صرف ایک نام بتاؤ۔“ میں نے جھاڑ کر کہا۔ دراصل میرا ارادہ یہ تھا کہ ریٹنگ پھلانگ کر ذرا رخسانہ آئی (گل کی مچی) سے شکایت لگا کر آتی ہوں کہ گھر میں کس بدتمیز بہ

مہمان کو رکھا ہوا ہے۔ جو بغیر اجازت کے دوسروں کے گھروں میں گھس کر بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ رخسانہ آئی تمہاری رشتے میں کیا لیتی ہیں۔“

میں نے آنکھیں دکھا کر پوچھا۔

”ڈیڈی کی بمن۔“

”یعنی تمہاری پھوپھو؟“

”یہی سمجھ لیں۔“ اب وہ ریٹنگ کے اوپر جھک کر ہمارے لان کا جائزہ لے رہا تھا۔

”یہ پھول پودے کس نے لگائے؟“

”ساحیہ نے۔“ میں نے سوچا کیوں نہ تعریف ہی بنوری جائے۔

”یہ کون خاتون ہیں؟“ وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

”میں اور کون۔“

”اوہ، تو اب کا نام ساحیہ ہے۔“ اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ”آپ کا نام تو کوئی بھاری بھر کم قسم کا ہونا چاہیے تھا۔ ورنہ نہ

سطوت آرایا ہریرہ بیگم۔“

”کیا مطلب؟“ میں ججج اٹھی۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ کوئی میری صحت پر چوٹ کرے تو میں زخمی شیرنی بن جاتی تھی۔ کچھ میں فطرتاً جھگڑا لو تھی۔

دراصل اس کے پیچھے بھی بے شمار وجوہات ہیں۔ میرے گھر والوں کی بے شمار زیادتیاں اور ظلم جو عمر کے مختلف ادوار میں مجھ پر ٹوٹے رہے تھے۔ شروع سے ہی مجھے ہر بات پر ڈی کر دینا پڑا۔

میں جو عماد بھائی کے اتنے سالوں بعد اس ظالم گھرانے میں پیدا ہوئی تو ان لوگوں کو میری قدر کرنا چاہیے تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ لوگ شکرانے

پڑھتے، نیازیں بانٹتے، مگر ہوا پچھ بولیں۔ ماما جیسی جناتی بچی کو پیدا کر کے پیار بڑھائی تھیں۔ سارے گھر والے معصوم سی گول کو کتنی بچی کو بھول بھال کر ماما

کے غم میں ادھ موئے ہونے لگے۔ پاپا نے تو اس وقت جذبات میں آکر یہ تک کہہ دیا تھا۔ ”اس سے بہتر تھا، میں بے اولاد ہی رہتا۔“ یہ اس نازک گھڑی کی جذباتی سی کیفیت تھی۔ بعد میں پاپا نے مجھے اپنی آنکھوں کا

ستارہ اور پھیلی کا چھالا بنانا چاہا تو میری ہنر مدار میان میں کود پڑیں۔

”مرادو! کیا ساجی کو بگاڑ دے گے۔ ایک ہی ہماری بیٹی ہے۔ اس کی تربیت میں چوک نہیں ہونی چاہیے۔“

ماما نے دو سال کی عمر میں تربیت کرنے کے چکر میں مجھے جو خونخوار نظروں سے گھورا نا شروع کیا تو اب تک

یہی سلسلہ چلتا آ رہا ہے۔

میں بچپن سے ہی ماما کے ظلم و جبر کا نشانہ بنتی رہی ہوں۔ ظاہر ہے، اکلوتی تھی۔ سارے ستم مجھ ممکن

پر ہی ڈھائے گئے۔ عمارت ہائی ایک تو مجھ سے بہت بڑے تھے۔ اوپر سے بلا کے فرماں بردار۔ مجھے دیکھ دیکھ کر تو ماما کو ہول پڑتے تھے۔

”ہائے ٹھوکی ذات اور ایسی بد زبان۔ بولتی ہے تو گویا چھت پھاڑنے کے ارادے سے۔“ بھی عمار کو اونچی آواز میں بات کرتے دیکھا ہے۔

ماما کا خیال تھا تصور میرا بھی نہیں میں اپنی پھوپھی کا مزاج چرا لاتی ہوں۔ سو میری گرم مزاجی سے گھر

والوں نے سمجھو تا کر لیا تھا۔ بس یہی وجہ تھی کہ میں۔۔۔

”مخترمہ! آپ کس مراتب میں چلی گئی ہیں؟“ وہ بالکل میرے سامنے اکھڑا ہوا تھا اور میں جو ماضی کی بھول بھلیوں میں گم بچپن سے اب تک اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایک دم چونک کر خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو؟“ جوں ہی میری نظر اس کے ہاتھوں تک گئی۔ میرا بارہ چڑھ گیا۔ وہ مکینہ لیووں کے رس میں کئے ہوئے سیب چٹ کر گیا تھا۔

”کس کی اجازت سے تم نے میرے سیب کھائے ہیں؟“

”کھانے پینے کے معاملے میں بھلا اجازت کیسی؟“ اس نے میز سے ایک ٹشو بھی اٹھالیا۔

”جاؤ یہاں سے۔۔۔ ورنہ میں چوکیدار کو بلا دوں گی۔“ میں نے اسے دھمکانا چاہا۔

”چوکیدار نے بھلا یہاں آکر کیا کرنا ہے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”تمہیں اٹھا کر دوسرے ٹیرس پر پھینک دے گا۔“

”اس میں اتنی جان ہے؟“ وہ ہمارے چوکیدار کی صحت پر چوٹ کر رہا تھا۔ ”یہ کام تو آپ پر سونپ کرنا ہے اور آپ ماشاء اللہ سے کر بھی سکتی ہیں۔“

”کون سا کام؟“

”اب کیا تفریح کروں۔ خیر اللہ آپ کو نظرد سے بجائے۔“ وہ بیک وقت میرے صحت مند سراپے پر بھی چوٹ کر رہا تھا۔ یہاں میرا غصہ کرنا تو بنتا تھا اور غصہ چونکہ میری ناک پر دھرا رہتا تھا، سو میں فوراً ہی پھٹ پڑی۔

”جانتے ہو یہاں سے کہ میں ماما کو بلاؤں؟“

”اتنا تردد کر کے نیچے جانا ہے تو میرے لیے چائے بھی لیتی آنا۔ میں یہیں ویٹ کروں گا۔“ اس نے بڑی دوستانہ مسکراہٹ سجا کر کہا۔

”تم یہاں سے نکل ہو جاؤ۔“ میں نے چھری اور

پلیٹ اٹھا کر کہا۔

”اگر نہ جاؤں تو؟“

”تم کس کی اجازت سے ہمارے ٹیرس پر آئے ہو؟“ میں نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

”اپنے دل کی اجازت سے۔“ وہ مزے سے بولا اور

پیر جھٹلا ناگھڑا دیا۔

”مس ساجہ مراد! ہم پھر ملیں گے۔ ابھی چلتا ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔“ وہ دوسرے ہی پل رینگ سے کود کر دوسری طرف چلا گیا تھا۔ جبکہ میں بھناتے ہوئے نیچے اتر آئی۔

میرا ایف اے میں پاس ہو جانا میرے گھر والوں کے لیے ہفت اقلیم کی دولت مل جانے کے برابر تھا۔ ڈیڈی پایا اور ماما تو اس خوشی میں کسی بڑی ضیافت کا اہتمام کرنا چاہتے تھے مگر نبیلہ پھوپھو کی بیماری کی خبر نے سارا پروگرام درہم برہم کر دیا تھا۔

میرے اور ڈیڈی کے علاوہ سب ہی اسلام آباد چلے گئے تھے۔ ڈیڈی کو آفس سے چھٹی نہیں ملی تھی اور میں ڈیڈی کی وجہ سے گھر میں رہنے کے لیے تیار تھی۔ ویسے بھی میں پھوپھو کے سوالات کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی۔ انہوں نے تو میرا ناک میں دم کر لیا تھا۔

”سائنس کیوں نہیں پڑھی؟ ایڈمیشن کیوں نہیں لیا؟ کون کون سے سبجیکٹ پڑھو گی؟“

اب بھلا پھوپھو کو کون بتائے۔ میں نے مزید نہ پڑھنے کا اعلان کر دیا تھا اور میری پیاری ماما نے اس اعلان کو سن کر فی الحال جو اتھاٹے سے پرہیز ہی کیا تھا۔ دراصل میرے انٹر میں پاس ہو جانے کی خوشی میں انہوں نے اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہا تھا۔ اور

فی الحال میری بے عزتی کرنے کا ارادہ ترک کر کے اسلام آباد سدھاری تھیں۔

چونکہ پڑھائی کا بوجھ تو ہٹ چکا تھا۔ سو میری آج کل تمام تر توجہ کا مرکز بنی وی اور بچن تھا۔

اس دن بھی میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ڈیڈی کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ اس کی ترکیب میں نے ایک ہی وی چینل کی آئی سی دیکھی تھی۔

میں مختلف مسالوں کے پیسٹ کو چھٹی کی ہوئی چائے کے اور لگا لگا کر فرانی کر رہی تھی جب شمو نے مجھے چینل میں آکر اطلاع دی۔

”سہمی بی بی! مہمان آئے ہیں۔“

”لو جی! اس وقت کون ویلا (فارغ) آگیا ہے منہ اٹھا کر۔“

میں لال مرچ پاؤڈر گرم مسالا اور زیرہ کریم میں کس کر رہی تھی۔ چائے کو مسالوں میں لگانا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے ہاتھ دھوئے اور سر پر فنگی شمو کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”کون ہے؟“

”خود دیکھ لیں۔“

”کہا مطلب؟“ میں نے آنکھیں دکھائیں۔

”دیکھنے کی چیز ہے قسم سے۔“ شمو اپنی اوقات پر اتر آئی۔

”بکو نہیں۔“ میں نے اسے ڈپٹ کر کہا۔ ”مہمان کو درانگ روم میں بٹھالیا ہے؟“

”جی بالکل۔“ اس نے زور سے سہرایا۔

”تو پھر چائے لے آنا۔“ میں لاؤنج میں لگے مر

میں اپنا حلیہ دیکھ کر بولی۔

”چائے کے ساتھ کیا لاؤں گی؟“

”نگلکس، رول، مہلباں اور ہاں ایک بھی رکھ لینا“

ڈیڈی کے کوئی دوست ہی ہوں گے۔ ”میں نے اندازاً“

سوچتے ہوئے ڈورانگ روم کا رخ کیا تھا، مگر صوفے پر موجود شخصیت کو دیکھ کر میرے منہ میں گویا کڑوے بادام آگئے۔

”تم۔۔۔؟“ میں صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

”جی، میں۔۔۔ آپ کیوں شاکر رہ گئی ہیں؟ یہاں بیٹھ جائیے، کہیں گرمی جانیے گا صدمہ کی شدت سے۔“ وہ اخلاقاً اٹھتے ہوئے بولا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ میں ناراضی سے بولی۔

آج بہت دن بعد میں نے اسے دیکھا تھا۔ شاید بچ کے دنوں میں وہ کہیں چلا گیا تھا۔

”مبارک بادوئے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”ہائے، اسے بھی خبر ہو چکی۔“ میرا دل ڈوب کر ابھرا۔

”پھر تو نمبر بھی جان چکا ہو گا۔“

”انتا حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ دراصل مجھے رخسانہ آئی نے بتایا تھا۔ سوچا، مبارک دے آؤں۔ ایمان سے بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ نے انٹر پاس کر لیا ہے۔“ وہ بچ بڑی خوشی کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر منہ صاف طنزیں لگا۔

”ٹھیک ہے، خیر مبارک۔“ میں نے اوپری دل سے کہہ ہی دیا۔ ”ویسے تم اتنے دن سے کہاں تھے؟“

نظر نہیں آئے۔ ”میں نے ایسے ہی بات بڑھانے کی غرض سے پوچھ لیا تھا۔“

”آپ نے مجھے مہم کیا؟“ وہ تو ایسے کھل اٹھا تھا

”لو، جی! اگر لوکل۔۔۔ یہاں تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ میں نے منہ بنا کر سوچا، مگر اس کا دل توڑنا بھی مناسب نہیں تھا، سو لفظوں کا ہیر پھیر کر کے بولی۔

”ٹیرس پر نہیں دیکھا سو اس لیے پوچھ لیا۔“

”دراصل میں کچھ دن تک ”سوگ“ کی کیفیت

میں رہا ہوں۔“
”سوگ؟“ میں چونکی۔ ”بھلا کیسا سوگ؟ کیا ہوا؟
کسی نے کچھ کہہ دیا؟“ میری جست پسند فطرت
انگڑائی لے کر جاگ اٹھی تھی اور فوری طور پر میرے
ذہن نے ایک کہانی کا تانا بانا بھی بن لیا تھا۔ گل کے پیار
میں پاگل لیکن۔۔۔ گل کا ہری جھنڈی دکھانا اور پھر
کیف کا سوگ میں اتنے دن غمزدہ رہنا۔۔۔ ادھر میرے
اندر مارے جست کے گد گدی ہونے لگی تھی اور میں
بس خیانت ساری کہانی کو جاننے کے لیے بے چین ہو
گئی تھی اور اس لمحے مجھے بھول گیا تھا کہ میری پہلی
ملاقات کافی ناگوار رہی تھی۔

”بس جی، کچھ نہ پوچھیں۔۔۔ لوگوں کے دورنے
چرے ہیں۔“ وہ رنجیدگی سے بولا۔

”کس کے؟“ میں حیران ہوئی۔

”ہماری پھوپھو محترمہ۔“ وہ جل بھن کر بولا۔

”مگر ان کے دو چرے کہاں ہیں؟ مجھے تو صرف ایک

چہرہ ہی دکھائی دیتا ہے۔“ میں نے ہونٹ پیکنی اتھرا کر

دی تھی۔

”میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں۔“ وہ جھنجھایا۔

”یہ جو میری پھوپھو ہیں نا۔۔۔ ایک نمبر کی بد عمد ہیں۔“

وہ خوب جلا بیٹھا تھا۔

”انہوں نے کیا کیا؟“

”پھوپھو نے کہا تھا ان چھٹیوں میں وہ ضرور ہمارے

گھر رہنے کے لیے آئیں گی مگر اب وہ مکر گئی ہیں۔“

کیف نے بسور کر تپا تھا اور ادھر میرا منہ اتر گیا۔ جو

کچھ میں سننا چاہتی تھی اور جس محبت کی کہانی کا مجھے

انتظار تھا، سب خواب ہوا، کھودا پہاڑ اور نکلا کیا؟

”تم گل کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ بھی بس آئے ہی والی

ہے۔“ میں نے اس کو تسلی دینے والے انداز میں کہا

تھا غمزدہ ہوں اچھا گویا اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

”تو یہ کریں جی، اچھوپھو کو تو اس لیے ساتھ لے کر

جاؤں گا۔ چند دن کے لیے ہی سہی، میری پکنی سے

جان چھوٹ جائے گا۔ میں بھی چار دن سکھ کا سانس

لے سکوں گا۔ مجھے پاگل کتنے نے کانٹا ہے کہ میں گل
لے جاؤں گا کہ میری مزید سختی آجائے میں دو کھانوں
کے لیے بھی پکنی سے باہر نہ نکل سکوں۔“ کہ تو
ٹھیک ہی رہا تھا۔ گل کی بڑھ چرائی اور کام چوری، مجھے
بڑھ کر کون جان سکتا تھا۔ کاپلی اور سستی خصوصاً۔۔۔
کے کاموں میں محترمہ گل پر ہی ختم ہوتی تھی۔

”پکنی کے کاموں سے تو گل کی جان جاتی ہے۔“

میں نے شو کوڑالی گھٹک کر اندر آتے دیکھ کر کھو رہا

اس کے لیے اتنا اہتمام کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی

پڑوس سے تو آیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شو کا بھلا کیا

قصور ہے۔ آرڈر تو میں نے خود ہی دیا تھا اور ادھر کیف

نے مجھے ہکا بکا کر دیا۔ وہ کباب کھاتے ہوئے بول رہا

تھا۔

”اسی لیے تو میرا اور فیلی پائون کا مشترکہ فیصلہ ہے

کہ گل ہماری بھابی نہیں بن سکتی۔“ میں اس کے

لیے چائے بناتے بناتے اچھل کر رہ گئی۔ اس نے بات

ہی کچھ ایسی کی تھی۔ میرا چو نکنا فطری تھا۔

”ہائے گل بھی ٹھکانے لگنے کے قریب قریب پہنچ

گئی۔“ صدے سے میرا پو بھر خون خشک ہو گیا تھا۔

آنکھوں کے سامنے بی اے کی موٹی موٹی کتابیں

گھومنے لگی تھیں۔ اگر اس سال بھی کوئی امید کی کرن

نظر نہ آئی تو مجھے قوی یقین تھا، ممانے اسلام آباد سے

واپس آکر ایڈمیشن فارم میرے منہ پر ضرور مارنا تھا

اور مجبوراً روتے دھوتے مجھے اس فارم کو بھرنا تو ضرور

ہی تھا۔ ورنہ ممانے دھناتی کون کروا تا۔

”پھوپھو کی خواہش ہے۔ میرے بھائی سے گل کی

بات بن جائے مگر میرے اور میری پائون جیسے ظالم سراج

کے ہوتے ہوئے بھلا یہ بات بن سکتی ہے۔“

”مگر گل میں بھلا کیا کمی ہے؟“ میں نے مرے

مرے لہجے میں کہا۔

”نہیں، کمی تو کوئی نہیں۔ ہمارے لیے تو بہت

اچھی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ ہمیں گھر سنبھالنے کے

لیے عورت کی ضرورت ہے نہ کہ کوئی ایسی آجائے جو

ہمارے نظام کو لگاڑ کر رکھ دے۔ اب دیکھیں نا گل
سال کے چھ مہینے بیرون ملک کے دوروں پر رہتی ہے۔
اپنے میں ہمارے گھر کی بھلا کیا حالت ہوگی اور ویسے
میں گل اپنے کینڈا والے چاچو کے بیٹے میں انٹر سٹڈ
ہے۔ پھوپھو خواجہ خاندان کی ہو رہی ہیں۔ خیر یہ ان کا اور
گل کا ذاتی معاملہ ہے۔ امید ہے گل پھوپھو کو قائل کر
دی لے گی۔“ کیف نے چوتھا کباب اٹھاتے ہوئے
وضاحت کی تھی۔ میں اس کی بات سمجھ کر سر ہلانے
لگی۔

”میں پھوپھو کو لینے کے لیے آیا تھا۔ ایک بھائی

کے لیے ایک لڑکی دیکھی تھی مگر وہاں بات بنتے بنتے وہ

گئی۔“ کیف کا منہ اتر گیا تھا۔

”مگر کیسے؟“ میں نے بے ساختگی سے پوچھ لیا۔

”محترمہ کو کچھ پکا نہیں آتا۔“

”ہائے صرف اتنی سی بات؟“

”یہ اتنی سی بات نہیں۔“ کیف نے پکنی رول

اٹھایا اور پھر دوبارہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ ”جو خاتون پکنی

کے نام سے گھبراتی ہوں۔ انہیں شوکیس میں سجانے

کے لیے تو گھر نہیں لے کر جاتا۔“

”ہاں یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔“ میں نے فوراً اتفاق

کر لیا تھا۔ کیف کو ویسے بھی بات کرنے کا سلیقہ آتا

تھا۔ وہ بہت اچھی طرح سے مقابل کو قائل کر لیتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ صرف چند دنوں میں میری کیف کے

ساتھ اچھی دوستی ہو گئی تھی اور اس کا بھی زیادہ تروت

ہمارے گھر میں گزرنے لگا تھا۔ کیف نے بڑی ممانور

میری ممانے بھی خاصی جان پہچان بنائی تھی۔ ایک تو

وہ بلا کا باتوئی تھا۔ ایسے ایسے لطیفے اور چٹکلے چھوڑا کہ

بس بس کر اگلا بندہ بے حال ہو جاتا۔ البتہ کیف کی

ہمارے گھر میں آمد و رفت رخسانہ آئی کو پسند نہیں

آئی تھی۔ اکثر جب کیف یہاں ہوتا تو آئی اسے کسی نہ

کسی ہمانے بلانے آجاتی تھیں۔

کیف چند ہفتوں کے قیام کی غرض سے یہاں آیا

تھا۔ اس کے آفس کا کوئی کام تھا۔



اس دن میں ماریٹ سے کچھ ضروری سامان لینے
کے لیے گئی تو کیف سے بھی ملاقات ہو گئی تھی۔ دو دن
بعد نظر آیا تھا۔ ان دنوں کام میں بہت مصروف تھا۔
اسی لیے پارک میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ ورنہ تو روزانہ
ہی میں اسے قریبی پارک میں غسٹے اور میاں گل فون پر
مصروف دیکھتی تھی۔ اس وقت بھی اسے فٹ پاتھ پر
چل قدمی کرتے دیکھ کر مجھے بے ساختہ خوشی محسوس
ہوئی۔

”کہاں تھے اتنے دن سے؟“ میں نے بڑے بڑے

تھیلے اس کے ہاتھ میں زبردستی تھماتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ مصروف تھا۔ تم سناؤ؟ آج کل کیا ہو رہا

ہے۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح شائستگی بھرے لہجے میں

دریافت کیا۔

”بس، وہی بڑھائی کاروبار۔“ میں نے دکھی دل سے

بتایا۔ ممانے آتے ہی میری ننھی سی جان پر پھر سے

کتابوں کا بوجھ لا دیا تھا۔ بقول ممانے جب تک

شادی نہیں ہوتی، فارغ رہنے سے بہتر ہے مصروف

رہو اور اب تو میں بچے دل سے شادی کے لیے دعا میں

کر رہی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس دفعہ بھی میں

ہرگز یاس نہیں ہو سکوں گی اور فیل ہونے سے بہتر تھا

میں کسی کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھر دوں۔ مگر

مسئلہ تو صرف یہ تھا کہ خاندان کا کوئی بھی مرعاج نہیں

پایا تھا اور خاندان سے باہر نکلنے جھانکنے کی ممانے

مجھے اجازت نہیں دے رکھی تھی اور نہ ہی میرا ایسا کوئی

ارادہ بھی تھا۔

”آئی کارا وہ تم سے جا ب کروانے کا ہے؟“ کیف

کا انداز کچھ سوچنا ہوا تھا۔

”نہیں تو۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر کیا ضرورت ہے، خواجہ خاندان نہیں تکلیف

دینے کی۔“ وہ منہ بنا کر بولا۔ ”آئی کو چاہیے تمہاری

شادی کر دیں۔“

”لو جی، کرو لگل۔ یہاں کوئی پروڈرل آتا تو بت بات بھی تھی۔ بندہ روہو روہو گھر والوں کو شادی کے لیے منوا ہی لیتا۔“ میں نے کڑھ کر سوچا۔
”تم بھوک بڑال کرو۔“ کیف نے اسے نئی راہ دکھانا چاہی تھی۔

”مما ان لو جھے ہتھکنڈوں سے متاثر نہیں ہو سکتیں۔“ میں نے ناپوسی سے نفی میں سر ہلایا۔
”اچھا، ایک اور طریقہ بھی ہے تم بیمار پڑ جاؤ۔“
”مگر کیسے؟“

”بھئی، ہر روز جھوٹ موٹ کا دورہ بنالیتا۔“
”پھر ممالوگ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر بھاگیں گی۔“ سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔“ میں نے ناپوسی سے کہا۔
”تم ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا۔“

”میں نہیں جاؤں گی مگر ڈاکٹر خود چل کر میرے پاس آجائے گا۔“ میں بیزار سی بولی۔ ”کچھ اور سوچو۔“
”کہہ دو، میری یادداشت چلی گئی ہے ابھی میں گاڑی نکال کر لاتا ہوں۔ معمولی سی ٹکڑے بعد تم بے ہوش ہو جانا۔“ اس نے ایک اور نادر ترین حل پیش کیا جسے سن کر میرا منہ بن گیا تھا۔

”ناکہ میرا دماغی علاج ہونا شروع ہو جائے اور پھر ما اور پاپا کو پتا چل جائے کہ میں انہیں پریشان کرنے کے لیے ڈرامے کر رہی ہوں۔“

”ایک اور حل بھی ہے میرے پاس۔“ وہ پھر سے سوچ میں گم ہوا۔

”جلدی بتاؤ۔“ میں بے صبری سے بولی۔
”تم خود کشی کرو۔“

”ہائے خود کشی۔“ میں گویا بدک کر دور ہوئی۔
”یعنی مری جاؤں؟ محض پڑھائی سے بچنے کے لیے۔“ میری آنکھوں کے ڈیلے گویا باہر نکلنے لگے۔

”نہیں تو۔“ وہ گویا جھنجھلا گیا۔ ”مرنے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔ صرف خود کشی کی کوشش کرنا۔“

میرس سے چھلانگ مار دیتا۔ ”وہ اطمینان سے بولا۔
”ناکہ میری ساری ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔ میں لنگڑی

ہو کر بستر سے لگ جاؤں۔“ ایسے خوفناک مشورے نے مجھے پسینہ پسینہ کر دیا تھا۔
”بدھو! دھیان سے چھلانگ مارنا نا کہ ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ جائیں۔ بس اس کا دھیان رکھنا کہ اس منظر کو کوئی دیکھے۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے مشکوک انداز میں اسے گھورا۔ ”تم مجھے دنیا سے بھجانے کے طریقے کیوں بتا رہے ہو۔“

”ایک آخری آئیڈیا بھی ہے میرے زرخیز دماغ میں۔“ کیف نے چٹکی جاکر کہا۔

”مجھے تو معاف کرو۔“ میں نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ میں سر دکھا کر گئی تھی۔

”ارے سن تو لو۔“ وہ میرے پیچھے بھاگا جاتا آیا۔
”کیا ہے؟“ میں ناراضی سے بغیر رکے بولی۔

”تم شادی کرو۔“ اس نے پھر سے میرا دل چلایا۔
”کس سے۔“ میں نے بغیر سوچے سمجھے دانت پیس کر بھناتے ہوئے کہا تھا۔

”ایک سے۔“ وہ میرے سامنے کھڑا بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ یوں کہ میرا اطمینان بل بھر میں ہوا ہو گیا۔

”مگر۔“ میں نے کچھ بولنا چاہا تھا مگر کیف نے گویا ہاتھ اٹھا کر میری بات قطع کر دی۔

”کوئی اگر مکر نہیں۔ کیا میں اور میری ماما تمہارا ہاتھ مانگنے آجائیں؟“ اب وہ بڑے صاف اور دو ٹوک انداز میں پوچھ رہا تھا اور میری حیرت کی گویا انتہا ہو چکی تھی۔

”مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں ہکا بکا رہ گئی۔ ”بھلا یوں کھڑے کھڑے رشتے طے پاتے ہیں؟“

”کیوں نہیں ہو سکتا۔“ وہ بڑے جوش سا بولنے لگا۔
”تم ہمارا آئیڈیل ہو ساتی! ہمیں جس لڑکی کی تلاش تھی۔ وہ لڑکی صرف تم ہو سکتی ہو۔ تم میں جو خوبیاں موجود ہیں۔ ہمیں ایسی ہی خوبیوں والی لڑکی کی تلاش تھی۔ میری تلاش یہاں آکر ختم ہو چکی ہے اور میں تمہیں اپنی بھابی بنانا چاہتا ہوں۔“

ہائے، مجھے کھڑے کھڑے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے اپنی اتنی تعریفوں نے تو میرے حواس معطل کر دیے تھے۔ اگر کچھ سنبھل کر کیف کے تاثرات جانچ لیتی تو ضرور ٹھنک جاتی۔ مگر کیا ہے کہ مجھے کسی کو جانچنا، رکھنا یا سمجھنا تو کبھی نہیں آیا۔ میں بے وقوفی کی حد تک سادہ ہوں۔ ان دنوں مجھے اپنی بے وقوفی کی خبر نہیں ہو سکی تھی، مگر وقت بہت بڑا استاد ہے۔ جو باتیں ماں باپ اور کتا میں تک سمجھا نہیں سکتیں، ان باتوں کو وقت اچھی طرح سے ذہن نشین کر دیتا ہے۔ اور وقت کی شاگردی میں رہنا کوئی آسان کام نہیں۔



یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب رخسانہ آئی نے اچانک کینیڈا شفٹ ہو جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ شوہر اور بیٹی جو تلخ درپس میں تھے سو وہ تنہائیوں سے گھبرا کر کینیڈا چلی گئی تھیں۔ ان کی انیکسی میں ابھی تک کیف رہا بس پڑ رہا تھا۔

آئی کے چلے جانے کا بڑی ماما اور میری ماما نے خاصا صدمہ لیا تھا۔ عرصہ دراز سے وہ ہمارے پڑوس میں رہ رہی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد بول لگتا تھا گویا براہِ والا گھر ستائوں میں ڈوب گیا ہے۔ آئی چل گئیں تو کیف بھی گدھے کے سر سے سینک کی طرح چند دنوں کے لیے غائب ہو گیا تھا اور میں جو اتنے دنوں سے اس کی عادی ہو چکی تھی ایک دم بولھلا کر رہ گئی اور جس دن وہ واپس آیا تھا۔ میں گویا پھٹ پڑی۔

”بغیر پٹائے کہاں دفع ہو گئے تھے؟“
”مسائس تو لینے دو بیٹا ہوں۔“ وہ گھاس پر پھسکا مار کے بیٹھ گیا تھا۔

”جلدی سے بکو۔“ میں غصے سے بولی۔ اسود بھائی اور غانی کے بعد کیف ہی تھا، جس سے میں اس قدر بے تکلفی سے پیش آتی تھی اور دوسرے ماما اور پاپا، کیف کی شرافت، نجابت کو دیکھ کر مطمئن تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے کیف سے ملنے اور گپ شپ سے

نہیں روکا تھا اور ویسے بھی ہم کون سا ہر وقت ملنے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ زیادہ تر پارک میں ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ پارک میں بچوں کے ساتھ دلی بال کھیلتا تھا اور میں ماما کے ہزار مرتبہ مجبور کرنے پر چار پانچ راؤنڈ لینے کے لیے نکل آتی تھی۔ جب تک میں راؤنڈ لیتی تھی۔ اتنی در تک وہ دلی بال کھیلتا رہتا تھا۔ جوں ہی میں تھک ہار کر تیج پڑ بیٹھ جاتی۔ وہ بال پھینک کر بھاگ آتا تھا۔

”یو سائے نا، میری وہ۔ اس کا ہر تھ ڈے تھا۔“ وہ پسینہ صاف کرتا ہوا بولا۔ یو سائس کی ”وہ“ تھی یعنی دوست، مگنیتیر یا پھر بیوی۔ اس نے بھی ”وہ“ کی وضاحت نہیں کی تھی۔ ”میں نے بھی کبھی وضاحت طلب نہیں کی تھی۔ دراصل مجھے کیریڈن کی بھی بھی عادت نہیں رہی تھی اور نہ ہی میرا کیف کے ساتھ ایسا کوئی ریلیشن تھا جو میں یوسائے کے بارے میں کنشس رہتی۔ وہ مجھے خاصا ہر دو، مخلص اور سادہ مزاج لگا تھا اور ان دنوں تو میری ماما کے کہنے پر وہ مجھے آنا کس اور انگلش بڑی دل جمعی کے ساتھ بڑھا رہا تھا اور میں وقت کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی تھی کہ کیف سے اچھا کوئی آج تک مجھے بڑھایا تھا اور نہ ہی کچھ سمجھایا۔

ماما کیف سے بہت خوش تھیں کیونکہ میرے منتہلی ٹیٹ دیکھ کر ماما دل خوش ہو گیا تھا اور وہ اس کامیابی کا سارا کریڈٹ کیف کو دے رہی تھیں۔ میری محنت کو وہ کسی کھاتے میں نہیں سمجھتی تھیں۔

”تو بتا کر جاتے۔“ میں نے ناراضی جتائی۔
”کیوں بھئی، آپ نے مجھے مس کیا تھا؟“ وہ صاف مجھے چڑا رہا تھا۔

”ہو نہ ہو، کوئی نہیں۔“
”تم تو خوش ہوگی پڑھائی سے جان چھوٹی رہی اتنے دن۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ میں جزیر ہوئی۔
”تم آوارہ گردی کر آئے؟“

”لڑکی! احترام سے بلایا کرو۔ میں تمہارا استاد ہوں۔“ وہ خوا خواہ استاد بنا۔

”تمہاری یوسا ٹھیک ہے؟“ میں نے جان کر اسے چھیڑا۔

”ایک دم ٹھیک ہے“ فرسٹ کلاس۔“ وہ دوسرے آئس کریم والے کو آنا دیکھ کر اٹھ گیا تھا۔

”اور تم؟“

”میں تمہارے سامنے ہوں۔“ وہ دو آئس کریم لے آیا تھا۔

”بڑے فریش لگ رہے ہو۔“ میں نے اپنا فیورٹ فلیور رنڈ دیکھ کر منہ بنالیا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”آئس کریم۔“

”مگر مجھے مینگو فلیور پسند نہیں۔“ میں نے ناک چڑھائی۔

”تو نہ کھاؤ۔ مجھے دے دو۔“ وہ اطمینان سے بولا تھا۔

”تم سے ایک بات کرنا تھی ساجی!۔“ کافی دیر سوچنے کے بعد وہ بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔ میں کچھ چونک گئی۔

”کیا؟“

”وہ دراصل میری ماما آنا چاہتی ہیں۔“ بلا آخر اس نے کہہ ہی دیا۔

”تو آجائیں۔۔۔ اس میں سوچ بچار کرنے والی کیا بات ہے۔“ میں اس کی بات کا مفہوم نہیں سمجھی تھی۔ دراصل مجھے بات تو کیا، لہجہ سمجھنا اور چہرے پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔

”میرا مطلب ہے، ایک خاص مقصد کے لیے آئیں گی۔“ وہ سر جھکائے گھاس کے تنکے نوچ رہا تھا۔

”اس کے قریب ہی خشک گھاس کے تنکوں کی ایک ڈھیری لگ چکی تھی۔

”کیسا مقصد؟“ اب میں کچھ کچھ سمجھ تو چکی تھی۔

”تاہم مزید وضاحت بھی ضروری تھی۔

”ایک کے لیے آئیں گی۔ میں نے تمہاری اتنی تعریفیں کی تھیں کہ وہ تم سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی ہیں۔“

”اس نے تعریف کا ایک جال میری طرف پھینک دیا

تھا اور میں اس جال میں الجھنے کے قریب قریب پہنچ چکی تھی۔ دراصل اپنی تعریف کے ناپسند ہوتی ہے اور میری جن خوبیوں کی میرے گھر والوں کے نزدیک کوئی وقعت یا اہمیت نہیں تھی۔ وہ انہی خوبیوں کو میری نظر میں اور بڑھا کر پیش کرتا تھا۔ دراصل یہ بھی ایک فن ہے۔ شائستگی اور سلیقے کے ساتھ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا فن۔ یہ بہتر بھی کسی کی کو آتا ہے۔

”تم بہت اچھی کو لنگ کرتی ہو۔ تم میں سلیقہ ہے۔ گھر سنبھال سکتی ہو۔ ماما کہتی ہیں ایک لڑکی کو ہرن میں طاق ہونا چاہیے اور وہ عورت ہی کیا جو گھر داری کے قرینے سے واقف نہ ہو۔“ وہ اپنے مخصوص دھیمے اور براثر لہجے میں کہہ رہا تھا اور اس کی باتوں سے اس کے لہجے کی تاثیر سے کوئی بھی عقل و دم والا بندہ قائل ہو سکتا تھا جبکہ میں تو پھر ایک احمق اور بدھوشی لڑکی تھی۔

دراصل میرے لیے بے وقوف اور کم عقل جیسے الفاظ ہی مناسب تھے۔ اس وقت میں مفاکنہ حد تک خود کو احمق ترین مخلوق بھی کہہ سکتی ہوں، ہاں اس وقت مجھے یہ الفاظ بہت زہریلے اور انا مذاق اڑانے والے محسوس ہوئے تھے جب ماما نے مجھے بتلایا کہ

”تم احمق اور پاگل ہو ساجی! ہمیں یہ سب تمہارے لیے بہتر نہیں لگ رہا۔“

”آپ تو چاہتی ہی نہیں، میں قدر دان لوگوں میں جاؤں جو میرے سلیقے سے متاثر رہیں۔ جو میری ڈگریوں کی بجائے میرے ہاتھ کے ڈانکے کی تعریف کریں۔ پلیز ماما! میں ساری زندگی احساس کمتری کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ مجھ سے یہ طعنہ بھی نہیں برداشت ہو سکے گا کہ میں کند ذہن تھی یا پھر میرا اکیڈمک ریکارڈ اچھا نہیں تھا۔ میں احساس کمتری کا شکار تھی اور اسی خوف کے زیر اثر میں نے کیف کے بھائی کے حق میں ووٹ دے کر اپنے لیے ایک بھرے پرے کنے کا انتخاب کر لیا تھا۔

میرا ٹھنڈا میر کارڈ زلٹ آیا اور میں خوش قسمتی سے پاس ہو گئی۔ ابھی میری اس خوشی کو سلیبویٹ کر رہے تھے کہ ایک نیا واقعہ رونما ہو گیا۔



پوری زندگی میں شاید پہلی مرتبہ میں نے خوشی خوشی کالج چلنے کی تیاری کی تھی اور اس سے پہلے کالج کے لیے ضروری چیزوں کی شاپنگ بھی کی تھی۔ ماما اور بڑی ماماں کالپٹ پر حیران تھیں۔ اور ڈیڈی پاپا بے انتہا خوش۔

مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میرے اندر تبدیلیوں کی اصل وجہ کیف کی ذات تھی۔ وہ میرے لیے ایک مخلص دوست ثابت ہوا تھا اور اس نے مجھے احساس کمتری کے محسوس نکال دیا تھا۔ اس نے میری ذات کی اہمیت کو اپنے جاندار لفظوں کا پیرا بن دے کر مجھے پہلے سے بھی زیادہ با اعتماد کر دیا تھا۔ یہ بات بھی مجھے بہت بعد میں پتا چلی تھی کہ دراصل کیف کا مقصد مجھے با اعتماد کرنا نہیں بلکہ میرا اعتماد جیتنے کی کوشش کرنا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہاں تو بات وہی رہی تھی اس دن کی جب میں کالج جانے سے پہلے جھٹ پیٹ ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ ماما اور بڑی ماماں ایٹل اپنے کمروں میں تھیں۔ ڈیڈی اور پاپا نماز کے بعد سو جاتے تھے۔ جب تک وہ فریش ہو کر میز تک آتے تھے۔ میں ان کی پسند کا ناشتہ تیار کر چکی ہوتی تھی۔ یہی میری روٹین تھی۔ اس وقت بھی میں نے شو کے ساتھ مل کر برتن میز پر بچا دیے تھے جب کیف کی کال نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

میں موبائل اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ساتھ ساتھ یونیفارم بھی پریس کر لوں گی کیونکہ میں جانتی تھی کیف لمبی بات کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

”استاد محترم! خیریت تو ہے۔ صبح صبح کھڑا کادیا ہے؟“ میں نے موبائل کان سے لگا کر استری کا پلگ لگاتے ہوئے کہا۔

”بس ایسے ہی۔“

”جھوٹ نہ بولو۔“ مجھے قطعاً یقین نہیں آیا۔

”سویرے سویرے میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔“

”اتنے بھی تم سچے نہیں ہو، دوست! میں نے طنزیہ کہا۔

”یہ تو تم نے سچ کہا۔ سو فیصد ٹھیک کہا۔“ اس نے فوراً اتفاق کر لیا تھا۔

”ہم ہمیشہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔“ میں خواہ مخواہ اترائی۔

”نجانے کیوں وہ ہنس دیا۔

”تم بہت سادہ ہو۔“

”شکریہ، تواضع۔“ میں اسے چڑانے کی غرض سے بولی تھی۔ شاید وہ میری سادگی پر چوٹ کر رہا تھا۔

”بہت نادان بھی ہو۔“

”ٹھیک فرمایا آپ نے۔“ میں مزے سے بولی۔

”اور تم بہت چالاک ہو۔“

”ہاں، واقعی۔“ وہ پھر سے مسکرایا تھا اور اس کی ہنسی کی آواز سن کر میں نے بس ایسے ہی عام سے لہجے میں کہہ دیا تھا۔

”اور بھی کبھی یہی چالاک آپ کے منہ پر بھی آپڑتی ہے۔ خود کو عقل کل نہیں سمجھنا چاہیے۔“

”بڑی عقل کی باتیں کرنے لگی ہو۔“ دوسری طرف حیران ہونے کی اداکاری کی گئی تھی۔

”آخر کس استاد کی شاگردی میں ہوں۔“ میں نے عاجزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

”فون کیوں کیا تھا؟“ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دوہرایا۔ کپڑے استری ہو چکے تھے۔ اب میں جوتے نکال رہی تھی۔

”آج ماما تمہارے گھر آئیں گی۔“ بلا آخر اس نے فون کرنے کی وجہ بتائی دی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے میں محسوس ہی گئی تھی اور میرے دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہو گئیں۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں کیا تھا اور میری خاموشی سے وہ اپنے مطلب کے معنی اخذ کرنے لگا۔

”تمہیں برا لگا؟“ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مجھے ہرگز برا نہیں لگا مگر پھر بھی اس نے پوچھا۔

”مجھے برا کیوں لگے گا۔“ انٹرٹل میرے استاد محترم

کی ماما آئیں گی۔ مجھے تو ابھی سے مینو کی فکر ہو گئی ہے۔ کچھ دیر بعد میں نے کافی ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا۔

”چھی بات ہے۔۔۔ اپنی کوکنگ کے جوہر دکھا کر ماما کو امپریس کر لیتا۔“ وہ شاید مسکرایا تھا۔

”مجھے بھلا کیا ضرورت ہے۔“ میں نے مصنوعی ناراضی سے کہا اور جیکے سے کال منقطع کر دی تھی۔ دراصل میں کچھ گھبرا گئی تھی اور ایسی گھبراہٹ کا شکار بھی میں پہلی مرتبہ ہوئی تھی اور یہ گھبراہٹ کیف کی ماما کو دکھانے کے لیے ہوئی تھی۔ ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ پہلی نظر میں ہی بندھ کچھ گھبراہٹ اور خوف کا شکار ہو جاتا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی شخصیت کے لیے کون کا سلفظ مناسب تھا۔ باوقار، مہذب، بارعب یا براسرار انہوں نے ماتھے تک دوپٹہ لے رکھا تھا۔ یوں کہ آنکھیں تنک دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ جھکا ہوا سر اور جھکی ہوئی آنکھیں۔ خاموش لب مسادہ سا چہرہ، آنکھوں میں سادگی تھی کوئی سوال نہیں تھا۔

صاف بات تو یہ تھی۔ بڑی ماما اور میری ماما کو کیف کی ماما پسند نہیں آتی تھیں اور جب کھر والے پسند نہیں آتے تھے تو پھر ایک کو دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈیڈی اور پاپا خاموش تھے فی الحال انہوں نے کوئی رائے نہیں دی تھی اور نہ ہی انہوں نے ایک سے ملنے یا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی جبکہ ماما اور بڑی ماما نے صاف کہہ دیا تھا۔

”کافی بھری پری فیل ہے۔ ایک کے پانچ بھائی، ماں اور خیر سے معذور دادی بھی موجود ہیں۔ مجھے تو ساجی کے لیے یہ رشتہ پسند نہیں۔ اوپر سے ایک کی ماں نے ہمارے ساتھ کلام تک نہیں کیا۔“

”بڑا خاندان ہونے میں کیا برائی ہے۔ اس وقت تو ڈیڈی اور پاپا کی موجودگی کے باعث میں کچھ نہیں بولی تھی۔ تاہم ان کے اٹھنے کے فوراً بعد مجھ سے رہائیں گیا تھا سو بول اٹھی۔“

”تمہیں کچھ پتا نہیں ساجی! یہ بیوی کی بات ہے۔

ہمارے درمیان ہی رہنے دو۔ ہم جو مناسب سمجھیں گے۔ وہی فیصلہ کریں گے۔“ خلاف معمول ماما نے مجھے بغیر ڈپٹے آرام سے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

”ایک ہی تو پوائنٹ مجھے اپنے حق میں مناسب لگا تھا اور آپ اسی پر اعتراض کر رہی ہیں۔“ میری دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔ کسی بڑے خاندان کا حصہ بننا میرا خواب تھا۔ ایسا گھر جس کے کلین میری تعلیم کی بجائے میرے سلیقے اور سکھانے کے کمن گائیں اور میں اپنے خلوص اور خدمت گزار کی کے جذبے کی بدولت ان کے دلوں کو جیت لوں اور میں جانتی تھی اس وقت ماما اور بڑی ماما نے مجھ پر فخر کرنا تھا۔ فی الحال تو وہ میرے اکلوتے پن کی وجہ سے تذبذب کا شکار تھیں۔

”تم شروع سے تنہا اور سکون ماحول میں رہنے کی عادی ہو بیٹا! تمہارے لیے ایک بورے لٹنے کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہو گا۔“ بڑی ماما نے مجھے سمجھانا چاہا تھا مگر میں نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

”ماما! یہ پوائنٹ تو بہت ویک ہے۔ میں ہر طرح کے ماحول میں ایڈجسٹ کر لوں گی۔“ بات تو کافی بے شری والی تھی۔ اپنے پڑپوئل پڑپوئل کھلی ڈلی گفتگو کرنا مگر میں مشرقی لڑکی بننے کی ادکاری کر کے خاموش رہنے کے چکر میں اتنا اچھا پڑپوئل ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ اب تو کوئی ڈھنگ کا پڑپوئل آیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے جو خواتین ہمارے گھر آچکی تھیں۔ وہ سب سے پہلے میرے میزک میں گرید اور نمبر پوچھنے لگتی تھیں اور جنہیں خبر ہو جاتی تھی کہ میں نے میزک تین سال میں کیئر کیا ہے۔ تو وہ مڑ کر دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھیں۔

”پلیز ماما! محض اس وجہ سے آپ کیف کے گھر والوں کو انکار مت کیجیے گا۔“ میں نے التجائیہ کہا تھا اور اب تو مجھے پورا یقین تھا کہ ماما جو اتار بی لیں گی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، بلکہ اس کے برعکس ماما نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بھرائی آواز میں بولیں۔

”بیٹا! ہم تمہارے لیے ہر چیز فریکٹ ویکٹا چاہتے ہیں۔ تم ہماری اکلوتی بیٹی ہو۔ ہر باپ اپنی اولاد کے لیے حساس ہوتے ہیں۔“ ماما بہت دیر تک مجھے سمجھاتی بھجاتی رہی تھیں۔ زمانے کی اونچ نیچ۔ اتار چڑھاؤ زندگی کے نشیب و فراز۔ اور میں خاموشی سے سر جھکائے سنتی رہی تھی۔ مگر میرا دل پھر بھی ایک کے حق میں دوڑ رہا تھا۔

”ایک دفعہ دیکھ لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔“ بہت دیر سوچنے کے بعد بڑی ماما نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

”مجھے سفینہ (کیف کی ماما) کا رویہ بہت عجیب لگا تھا بھابھی! ماما اور بڑی ماما اب بہت دیر گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں، سو میں چپکے سے اٹھ گئی۔“

آنے والے بہت سارے دن اسی سوچ بچار میں گزر گئے تھے۔ ماما لوگ ایک دفعہ جھلم جا کر ایک کو بھی دیکھ آئی تھیں۔ ڈیڈی اور پاپا کے علاوہ اسو بھائی اور عمو بھائی بھی ایک سے مل کر آئے تھے اور وہ انہیں ہر لحاظ سے اچھا لگا تھا۔

”اپنی ماں کی طرح ہے۔۔۔ مہذب، خاموش۔۔۔ باوقار اور۔۔۔“ یہ ماما کا ایک کے لیے مہمو تھا۔ ماما کچھ کہتے کہتے رک سمجھتی تھیں اور میں ان کی خاموشی سے بے چین ہو گئی۔

”اور کیا بھلا چرا اسرار۔۔۔؟“ میری زبان بھلا رک سکتی تھی۔ ماما نے مجھے بیشک کی طرح گھوری سے نوازا تھا۔

”نہیں۔۔۔ بہت سنجیدہ مزاج۔“ ماما مجھے نہیں بلکہ غانی کو بتا رہی تھیں جو خرابی طبیعت کی وجہ سے جھلم نہیں جا سکی تھی اور اب جیکے لینے کے لیے صبح صبح اسو بھائی کے ساتھ نازل ہو جاتی تھی۔ اسو بھائی اسے ڈراپ کر کے اپنے آفس چلے گئے تھے۔

”ایک کا برس اچھا چل رہا ہے ماشاء اللہ“ اس نے چند سال میں ہی بہت ترقی کی ہے۔“ بڑی ماما

ایک سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئی تھیں۔ ”شکل و صورت کیسی ہے۔ گورا ہے؟ کالا ہے؟ سانولا ہے؟ کیسا ہے؟“ غانی نے چل کر پوچھا تھا۔ اب کے ماما نے غانی کو گھورا۔

”بہت خوش شکل ہے۔ ساجی کے ساتھ نیچے گا۔“ جواب بڑی ماما کی طرف سے آیا تھا اور اس جواب نے مجھے بھی مطمئن کر دیا تھا۔

ایک سے چھوٹے چار اور بھائی تھے۔ سب سے بڑا ایک تھا اور اس کے بعد کیف، عون، فائز اور اشعر تھے۔ اور یہ بات سن کر ہم حیران رہ گئے تھے کہ عون اور فائز دونوں شادی شدہ تھے۔ ماما نے اس بات پر بھی خاصا اعتراض کیا تھا کہ بیویوں کو چھوڑ کر چھوٹے دونوں کی شادی کیوں کی ہے۔ ویسے میری ماما کو اعتراضات تو اور بھی بے شمار تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ ماما کو اپنی قدرے فربہ ماں، نانا، ننی بی بی کے لیے ایک جیسا سامرا، خوبرو اور لائق فائق لڑکا پسند آ گیا تھا۔ سو بھر پر اکنبہ بھی ماما نے نظر انداز کر دیا تھا اور سفینہ آئی کا رویہ بھی۔

بیویوں کے درمیان تمام معاملات طے پا گئے تھے۔ اب مجھے لی اے کی بجائے بیابہ ہی کرنا تھا مگر بھانے کیوں سب کچھ حسب نفا ہونے کے باوجود اندر کہیں عجیب سی بے قراری چٹکیاں بھرنے لگی تھی اور میں کافی دن تک تو یہی بھنچتی رہی تھی کہ شاید ماما اور پاپا سے دوری کا احساس دل میں چھین دے رہا ہے۔ دل کو اذاسی کی دہیز چادر میں لپیٹ رہا ہے مگر یہ احساس پاپا کے گھر سے لے کر ایک کے گھر تک میرے ساتھ رہا تھا مگر اس سے بھی پہلے کچھ اضطراب تو میرے اندر خود بخود بھرنے لگا تھا۔

ایک دن کیف چلا آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ جا کر اپنی شادی کی شاپنگ کر لوں۔ اس میں کوئی اعتراض والی بات بھی نہیں تھی۔ سو ماما نے مجھے اجازت دے دی تھی۔

تقریباً تین دن تک شاپنگ کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔ اگرچہ شاپنگ بھی میں نے نہ ہونے کے برابر کی تھی۔

ایک تو موت میں کافی ہلکے ہلکے اور کم قیمت کے کپڑے پہنے تھے۔ دوسرے مجھے ویسے بھی بھاری لباس سے اچھن ہوتی تھی اور جب ہلکے کی باری آئی تو کیف نے مجھ سے پوچھا۔

”لہذا کیا ہونا چاہیے؟“

”نہنگا نہیں۔“

”تو پھر؟“

”میں کچھ اور لوں گی۔“ میں نے بھاری بھر کم ہلکے دیکھ کر ایک ہلکا سا نفیس کام والا شلوار قمیض پسند کر لیا تھا۔

”شائنگ پنک لے لو“ ایک کو یہ فکر پسند ہے۔“ کیف نے مجھے سرخ رنگ کا انتخاب کرتے دیکھ کر فوراً کہا تھا۔ حالانکہ سرخ رنگ کو میں اپنا لکھی فکر سمجھتی تھی۔ یہ رنگ میرا پسندیدہ تھا مگر اس کے باوجود میں نے ایک کی پسند کو اولیت دی تھی۔

شائنگ کے دوران یوسا ہمارے ساتھ رہی تھی۔ یوسا، کیف کی کزن اور منیجر تھی اور جس طرح کیف اس پر دل کھول کر خرچ کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کیف یوسا سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ کیف کی پوسا کے لیے محبت اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی اور میں وثوق سے کہہ سکتی تھی کہ اتنی خریداری میں نے نہیں کی تھی جس قدر یوسا نے کی تھی۔ منگے ترین کپڑے اور سونے کے زیورات، اس کے علاوہ بھی نجانے کیا کچھ۔

میرا سلمان کیف نے میرے حوالے کر دیا تھا اور یوسا پوری گاڑی اپنی چیزوں سے بھر کر جہلم چلی گئی۔ حالانکہ جب میں برائیل ڈریس خرید رہی تھی تب کیف برابر مجھے جتا رہا تھا۔

”ہاتھ ہولار کھنا فریڈ! تمہارے انہوں نے میری جیب میں کچھ خاص رقم بھر کر نہیں بھیجا۔“

”اپنے بھائی سے کہنا وہ شادی کر رہا ہے پھر ہتھ ڈے سیلیبیوٹ کر رہا ہے۔“ میں نے بھنا کر کہا تھا۔

اگرچہ مجھے خود ان باتوں کا خاص خیال تھا مگر کیف کا بار بار جتنا مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔

پھر ایک دن کیف نے اچانک فون کر کے مجھے حیران کر دیا۔ ”ایک سے بات کرو گی؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”میں۔۔۔ مگر کیوں؟“ میں گھبرا اٹھی۔ شادی میں چند دن تو رہ گئے تھے اور آج سے پہلے ادھر سے کوئی ایسا معاملہ سامنے نہیں آیا تھا اور پھر ماسے پوچھے بغیر میں بھلا کیسے بات کر سکتی تھی۔

”بس ایسے ہی تم نہیں کرنا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔“ کیف نے مزید کچھ سننے سے پہلے فون رکھ بھی دیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ کیف کو کبھی میں سمجھ نہیں پاتی تھی۔ عجیب سا بندہ تھا۔ گھڑی میں ٹولہ، گھڑی میں ماشہ۔

ان ہی الجھی سبھی سوچوں سمیت شادی کا دن بھی آیا تھا۔ اس دن عام لوگوں کی طرح مجھ پر بھی گھبراہٹ سوار تھی اور اُنسو بھی وقتاً فوقتاً بغیر کسی وجہ کے گرتے جا رہے تھے۔ ماما اور بڑی ماما میرے سامنے خود کو پیش رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر یہ کوشش کبھی بھی ناکام ہو جاتی تھی۔ پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ گھر کے لان میں شامیانے لگے تھے۔ رات کو مہندی کی تقریب کا انتظام ہوٹل میں تھا۔ البتہ بڑی ماما کی خواہش تھی کہ رخصتی کسی ہوٹل سے نہیں بلکہ گھر سے ہونا چاہیے۔

نکاح سے کچھ دیر پہلے میں نے عجیب سی دہلی دہلی سرگوشیاں سنی تھیں اور کچھ دیر بعد کھل کر بات سامنے آگئی۔ کیف نے ماما سے بڑے واضح لفظوں میں کہا تھا۔

”آئی جی! آپ نکاح نامے میں حق مہر کے طور پر ایک سے کچھ بھی لکھوائیں۔ ساجی کے تحفظ کے طور پر۔“

”پرینا! اس کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ شرعی طور پر ہو گا۔ ہمیں منظور ہے۔“ ماما نے سلیقے سے کہا تھا۔

اگرچہ بات تو درست تھی مگر میرے والدین اس چیز کو کافی غیر مناسب سمجھتے تھے۔

”نہیں! آئی! ضرورت ہے۔ یہ ساجی کا حق ہے۔“ وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا تھا۔ ”میں ایک سے بات کرنا ہوں۔ وہ اپنا گھر چار فرنگیز میں سے دو فرنگیز اور کارخانہ ساجی کے نام لکھ دے۔ یہ ساجی کا حق مہر ہو گا۔“

”مگر یہ تو بہت زیادہ ہے۔“ ماما گھر آکر بولیں۔

”اتنا بھی زیادہ نہیں۔۔۔ میں نے کماتنا یہ ساجیہ کا حق ہے۔“

اس کا اندازہ تو کچھ قسم کا تھا۔ ماما جی ہی ہو گئی تھیں۔ اگرچہ مجھے بھی یہ حق مہر بہت زیادہ لگ رہا تھا مگر میں بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھی ورنہ ضرور بول اٹھتی۔

”ایک کیا سمجھے گا۔ ہم کس قدر دلچلی ہیں۔“ مجھے یہی سوچ مارے ڈال رہی تھی۔ میں ماما کو منع کرنا چاہتی تھی مگر بابا اور ڈیڈی کے ساتھ مولوی صاحب کو دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ اگرچہ سننے میں آیا تھا کہ ایک نے کیف کے اس مطالبے پر کافی ناگواری کا اظہار کیا تھا۔ وہ مان نہیں رہا تھا مگر نجانے کیسے کیف نے اسے متاثر ہی دم لیا۔ کیف کے خلوص اور ہمدردانہ فطرت کی میں کچھ اور قائل ہو گئی تھی۔

سفینہ بیگم یعنی کیف کی ماما اس وقت بھی کچھ نہیں بولی تھیں، جب حق مہر کے متعلق دہلی دہلی سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ تب بھی وہ خاموش اور سر جھکا کر بیٹھی رہی تھیں۔ نہ ان سے کسی نے پوچھا تھا، نہ مشورہ لیا اور نہ ہی بڑھ چڑھ کر انہوں نے بولنے کی کوشش کی تھی۔ ایک چپ تھی ان کی، جو گھر آنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

بس انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر خاموش لبوں سے ایک دعا دی تھی اور میرے لیے ان کی یہ دعا پوری زندگی کا حاصل تھی۔

”سدا سکھی اور آباد رہو۔“



ایک کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات نے میرے سارے خدشات دور کر دیے تھے۔ مجھے خوف تھا کہ وہ ضرور حق مہر میں لکھوائی جانے والی لمبی جوڑی جاسید او کے طعنے دے گا جتنے گایا کبھی بکھار طنز کی مار مارے گا۔ تاہم ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے لیے ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر ثابت ہوا تھا اور اس کی محبت پر پہلے روز ہی میں اول ایمان لے آیا تھا۔ سب سے مہمتر بات یہ تھی کہ اس نے میرے تعلیمی ریکارڈز کا ریکارڈ ہرگز نہیں لگایا تھا بلکہ اس معاملے میں بھی اس نے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا۔ ”ممو!“ وہ زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی اس کی گپ شپ نہ ہونے کے برابر تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنی ماں اور بھائیوں سے بے حد محبت کرتا تھا اور مجھ سے بھی اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

”ساجیہ! اچھے امید ہے، تم میرے گھر میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہو گی۔ پلیز! میری ماں اور بھائیوں کی عزت کرنا۔ ان کا خیال رکھنا۔ اس گھر میں سب سے مظلوم آستی میری دادی ہیں۔ میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈال رہا، بس دن میں کبھی بھاران کی جبر سہری کر لیا کرنا اور دوسرے نمبر پر میری ماں ہیں۔ ان کی ذات بھی قابل توجہ ہے۔ ٹھوڑا سا وقت انہیں بھی دے دیا کرنا اور بس، میرا تم سے کوئی مطالبہ نہیں۔ میں ہمیشہ تم سے غلط رہوں گا اور تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ بس ایک وعدہ کرو، کبھی بھی اپنے دل کو کسی اور کے خیال سے آلودہ نہیں کرو گی۔ میں سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں مگر بے وفائی ہرگز نہیں۔ تمہیں کیف نے میرے لیے پسند کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم، ہم سب کے حق میں بہتر ثابت ہو گی۔ ہم بھائیوں میں بہت پیار ہے۔ ہمارے اس پیار کو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرنا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اسے سرشار کر دیا تھا۔

میرے لیے ایک کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ جس طرح ایک نے مجھے اپنے دل میں جگہ دی تھی، اسی طرح وہ بھی میرے دل کے ہر گوشے میں سا گیا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ ہمیشہ چاہے جانے کے لائق بہت اچھا بہت نیک، ہر دلعزیز۔ ایسے ہی لوگ ہمیشہ دلوں پر حکومت کرنے کا فن رکھتے ہیں۔ رخسانہ انہی اسی لیے تو ایک کو اپنا داماد بنانا چاہتی تھیں۔ جب ادھر سے دل برداشتہ ہو گئیں تو پھر بیٹی اور شوہر کے پاس چلی گئیں۔ ایک اور کیف کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کسی اور نے حاصل نہیں کی تھی۔ عون اور فائز دونوں نے انٹر کے بعد شادی کر لی تھی اور دونوں ہی ایک کے کاروبار سے منسلک ہو گئے تھے۔ دونوں کو مناسب جاب ایک نے ہی مہیا کی تھی۔ تاکہ وہ اپنی فیملی کا بوجھ خود اٹھا سکیں۔ اشعر اسٹیل میں مقیم تھا۔ کم کم ہی گھر آتا تھا۔ البتہ عون اور فائز کی بیویاں نیا اور سی گھر میں ہی ہوتی تھیں اور گل سے بھی بڑھ کر ست اور کمال تھیں۔ پورا گھر نجمہ بی کے کندھوں پر تھا۔ وہ سیاہ و سفید کی بالک تھیں۔ جو مرضی پکا دیتی تھیں اور جیسا مرضی پکاتیں یہ سب صبر اور شکر کر کے کھا لیتے تھے کہ گھر کی خواتین نے بھی ضرورت کے وقت کچی پکین میں نہیں جھانکا تھا۔

کیف ٹھیک ہی کہتا تھا۔ ان کے گھر میں سلیقے، قرینے کی بہت کمی تھی۔ تاہم یہ بات سراسر غلط تھی کہ چونکہ کیف سنبھالتا ہے۔ شاید اس وقت مذاق اس نے کہہ دیا ہو گا تاہم میں تو صرف نجمہ بی کو ہی ہر ایک پر رعب جماتے اور کاموں کا رونا دھونے دیکھ رہی تھی۔ ایک بہت مصروف رہتا تھا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا کہ وہ رات سے پہلے گھر نہیں آتا تھا۔ نجمہ بی بتایا کہ ایک کھانا باہر سے کھا لیتا ہے اور مجھے سالن کے نام پر ملغوبے دیکھ کر ان کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ ایسے ملغوبے سے باہر کا کھانا ہی بہتر تھا۔ مگر گھر کے مو بے چارے بھلا کیا کرتے۔

اما کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔ وہ پورا دن عبادت میں مشغول رہتی تھیں۔ گویا انہوں نے

دنیا کو خیر یاد کہہ دیا تھا۔ ایک عرصے سے ان کی یہی روٹین تھی۔ تینوں وقت کا کھانا انہیں کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔

اسی طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ سی، آثار قدیمہ جیسی وادی بھی پانگ پر جت لینے بس چھت کو گھورتی رہتی تھیں اور جب اس کام سے تھک ہار جاتیں تو پھر گہری نیند میں گم ہو جاتیں۔ نجمہ بی جیسے تیسے بد مزاجی بخنی انہیں پلا جاتی تھیں۔

نیا اور سی نے بھی ساس اور وادی ساس کے کمرے میں جھانکنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن اے سی لگائے اپنے اپنے کمروں میں بند ہی وی دیکھنے میں مصروف رہتی تھیں۔ دونوں کے پاس ایک ایک بچہ تھا اور ان کی اپنی بے شمار مصروفیات تھیں۔ سو وہ گھر پر بھلا کیوں توجہ دیتیں۔ سونے کھانے اور آرام کرنے کے علاوہ ان کا تیسرا محبوب ترین مشغلہ پارلر کے چکر لگانا تھا۔ صحت اور حسن کو نکھارنے کے علاوہ کوئی اور کام ان کے پاس نہیں تھا۔

اسی گھر کی خواتین کی روٹین دیکھ کر تو مجھے غش آنے لگے تھے۔

”نیا اور سی گھر کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتیں۔“ میں پورا ہفتہ ماما کے گھر رہنے کے بعد واپس آئی تھی۔ یہاں آتے ہی اسی گندگی، غلاظت نے استقبال کیا تھا۔ رانی اگرچہ صفائی کر کے کئی تھی مگر پھر بھی جگہ جگہ فروٹ کے پھلکے اور ٹائیوں کے ریپر پڑے تھے۔ حتیٰ کہ صوفوں کے اوپر ہسٹکس کا چورا بھی شان سے بکھرا ہوا تھا۔ اگر لاؤنج میں بیٹھ کر بیٹ بوجا کی کئی تھی تو پھر جھوٹے برتن اور پھلکے میٹھے میں کتنا نام لگ جانا تھا۔ رات کو ایک اپنے مخصوص ٹائم یعنی ساڑھے گیارہ بجے گھر آیا تو میں نے کافی ناگواری سے اپنے بھرے دل کو خالی کرنا چاہا تھا۔

”وہ اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتیں، سو اس لیے۔“ وہ فریض ہو کر بیڈ پر تیم دراز ہو گیا تھا۔ ایک کو اور مجھے بھی لی وی سے پچاسی نہیں تھی۔ سو ہمارے کمرے کا لی وی خاموش رہتا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں براہان گئی۔ ”جس گھر میں قیام ہو چاہے وہ کرائے کا ہی کیوں نہ ہو، اسے اپنا سمجھ کر اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنا چاہیے۔“ ”یہ تو تمہاری سوچ ہے۔“ اس نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

”مگر انہیں بھی ایسا سوچنا چاہیے۔ رانی ایک دفعہ صفائی کر جاتی ہے۔ پورا دن ہمیں خود ہی گھر کو صاف رکھنا ہوتا ہے۔ اگر گندگی یا پھیلاؤ انہیں میٹھیں گے تو اگلے دن تک بھلا کیا حالت ہوتی ہوگی۔ بچے اس گندگی میں کھیلنے لگتے ہیں۔ فرش سے گندی چیزیں اٹھا کر کھاتے ہیں۔ اسی لیے آئے دن واکٹرول کے پاس بھاگی رہتی ہیں۔“ میں نے ٹکس کر کہا تھا۔ اپنا جاس بھایا میکے والا گھر دیکھ کر آئی تھی سو اسی لیے طبیعت خاصی ادب رہی تھی کیونکہ میرے پیچھے اس کمرے کی صفائی تک نہیں کروائی گئی تھی۔ فریچر پر گرد کی ایک تہہ چمک رہی تھی۔

”اب بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ عون اور فائز کو چاہیے ان چیزوں کی طرف دھیان دیں۔ بیویوں سے انہیں سمجھ اور نہ سہی، کم از کم بچن کی طرف توجہ خود دے لیا کریں۔ میں نے بھر کا راشن دس دن میں اڑ جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب گھر کی خواتین توجہ نہیں دیں گی تو ہر چیز کو ضائع کر دیا جائے گا مگر یہاں شروع سے ہی ایسے حالات ہیں۔ وادی اور ماما سیدھی سادی خواتین تھیں۔ پکانا، کھانا آنا انہیں تھا۔ شروع سے ہی نجمہ بی سنبھالتی ہیں۔ نیا اور سی نے یہی کچھ دیکھا ہے۔ سو انہیں جان مارنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ خیر چھوٹو، ان باتوں کو یہ بتاؤ گھر والے کیسے ہیں؟ سفر میں پر اہم تو نہیں ہوئی؟“

ایک نے بات بدل دی تھی۔ جس بات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تھا۔ اس پر بھلا بحث میں وقت کیوں ضائع کیا جاتا۔ اب وہ میرا حال احوال پوچھ رہا تھا۔ وہ میرے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بہت دھیان سے سنتا تھا۔ اگرچہ چھوڑ کر تو مجھے ایک ہی آیا تھا تاہم واپس میں ڈرامیور کے ساتھ آئی تھی۔ ایک ہفتہ تک

رہتا تو نہیں تھا مگر چونکہ عداوبھائی فیملی سمیت کراچی سے آگئے تھے سو ان کے بچوں کے لیے میں وہاں رک گئی تھی۔ حالانکہ میرا ابھی مزید رہنے کا ارادہ تھا مگر ایک نے مجھے ایک دن بھی اوپر نہیں رہنے دیا تھا۔ ”مسکدہ تو کوئی نہیں تھا مگر میں نے آپ کو بہت مس کیا۔“ میں ہونٹوں میں مسکان دبا کر مزے سے بولی۔ اگرچہ میں نے سچائی کو ظاہر کیا تھا مگر ایک میرے اس سچ کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”سراسر جھوٹ۔ اگر مس کرنا ہی تھا تو میرے ساتھ ہی واپس آ جاتیں۔“ ”پورے دو ماہ بعد گئی ہوں جناب، صرف ایک ہفتے کے لیے۔“

”اور میرے لیے یہ ہفتہ پورے دو ماہ کے برابر تھا۔ دن گزرتا تھا نہ رات۔“ وہ میری طرف دیکھ کر دلکشی سے مسکرایا۔

”سراسر جھوٹ، اگر ایسی بات تھی تو آ جاتے نا۔“ میں لاڈ سے بولی۔

”بس جی، کیا کریں۔۔۔ مجبوری تھی۔“ ایک نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”کیسی مجبوری؟“ میں نے آنکھیں دکھائیں۔ ”میری جان! کاروبار سلطنت کی مجبوریاں کیا کم ہیں۔ ذرا ادھر ادھر ہو جاؤں تو لاکھوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے بولا تھا۔

”کیوں بھلا فائز اور عون وغیرہ ہوتے تو ہیں۔“ ”مگر وہ اتنی توجہ نہیں دیتے۔ لاکھوں کا نقصان ان کی نظر میں کچھ نہیں ہوتا۔ اگر میری غیر موجودگی میں کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو وہ لوگ سنبھال نہیں سکتے۔ ابھی نا سمجھ ہیں۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ جائیں گے۔“

وہ حد درجہ سنجیدہ تھا اور خاموش ہی رہتا تھا۔ کم بولتا تھا مگر بہت اچھا بولتا۔ زیادہ تر میں ہی اسے بولنے پر اکساتی تھی۔ خود سے کبھی بھی گفتگو کا آغاز نہیں کرتا تھا۔ ہاں، محبت لٹانے کے معاملے میں وہ نجوس ہرگز نہیں تھا اور اظہار کے معاملے میں تو بالکل نہیں۔ اپنے مخصوص لہجے میں دھیما دھیما بولتا وہ سیدھا دل

میں اتر جاتا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ میرے بازو پر ہاتھ رکھے بڑی نرم گرم جذبے لٹاتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کے علاوہ کچھ اور سوچ سکتی ہوں۔“ میں اس کی محبت لٹاتی نظرسے نظرحراگئی تھی۔

”ہمیشہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ اس کا گھیر لہجہ یوں ہی دل دھڑکا رہا تھا۔

”بھلا کیسے؟“ میں نے بوجھل پلکوں کو بمشکل اٹھا کر پوچھا۔

”تمہاری سوچوں میں، خیالوں میں، باتوں میں صرف میں ہوں، میرے علاوہ کوئی اور نہیں۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔

”میرا دل پکا ایمان دار ہے۔ بے ایمانی نہیں کرتا۔“

”اور میں اسے بے ایمانی کرنے بھی نہیں دوں گا۔“ وہ میرے کان کے قریب گنگنایا تھا۔ ایک کی قربت کا شمار اس کی آنکھوں سے ہوتا ہوا میرے دل میں اتر آیا تھا اور میں اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کی آواز اپنے کانوں سے سن رہی تھی۔



دن کچھ اور آگے سر کے گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے کچن ہی نہیں بلکہ پورے گھر کا انتظام سنبھال لیا تھا اور میرے اس عمل سے کسی اور کو تو نہیں البتہ نجمہ بی کو خاصا دھچکا پہنچا تھا۔ انہوں نے دبے دبے لفظوں میں مجھے سمجھانا بھی چاہا تھا۔ ان کی ہر ممکن کوشش تھی کہ میں امور خانہ داری سے دور رہوں مگر میں نے ان کی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔

میرے کچن سنبھالتے ہی ہر چیز میں ترتیب اور نفاست نظر آنے لگی تھی اور خوش رنگ کھانے دیکھ کر تو کیف کے علاوہ عون اور فائز بھی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکے تھے۔

اس گھر کے افراد کا ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ سب لوگ

ایک جگہ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ رات کو مرد حضرات گھر میں ہوتے تھے مگر پھر بھی کھانا اپنے اپنے کمروں میں ہی کھایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود تقریباً سب ہی ہر روز نئی ڈشز کو دیکھ کر نہ صرف چونکے تھے بلکہ ”فرا“ ”فرا“ سب ہی نے میرے ہاتھ کے ڈانٹنے کو سراہا بھی تھا۔ ان میں نیا اور سی بھی شامل تھیں۔

”ساجی بھابھی! آپ تو برا اچھا کھانا بنا لیتی ہیں۔ کیا باقاعدہ کورس کیا ہے۔“ کسی تو کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آ رہی تھی۔

”نہیں“ میں نے اپنی بڑی ماما سے سیکھا ہے۔“ میں بھلا جھوٹ کیوں بولتی۔

”آپ میں بہت سلیقہ ہے بھابھی!“ اب کے نینا نے کہا۔ ایک بات تو اچھی تھی کہ یہ دونوں میری تعریف سے نہ جلتی تھیں اور نہ ہی سر ہٹنے میں بخل سے کام لیتی تھیں۔ اور پھر میں کون سا کسی سے تعریفی سر شکیٹ حاصل کرنے کے لیے کام کرتی تھی۔ یہ میرا گھر تھا اور ایک کے حوالے سے اس گھر کا ہر کام میرے لیے اہم تھا اور ہر فرد اہم ترین۔

کچن کی حالت بہتر کرنے کے بعد میں نے وادی کا کمرادیکھا تھا۔ وہ اس گھر کی بزرگ ہستی تھیں مگر ان کی اہمیت اور حالت کسی ٹوٹے پھوٹے ناکارہ سامان سے بڑھ کر نہیں تھی۔

سب سے پہلے میں نے ان کے لیے آئرن راولڈ کا سنگل بیڈ منگوا لیا جس کا گدا انتہائی نرم اور آرام دہ تھا۔ اس پرانے قدیم پلنگ کو اٹھا کر اسٹور روم میں رکھوا دیا تھا۔ وادی کے کمرے کے صدیوں پرانے پردے میل پکیل اور دھول مٹی کے باعث اپنی اصل رنگت کھو چکے تھے۔ انہیں اتروا کر کوڑے دان میں پھینکوا دیا اور نئے پردے دیے تھے۔ چھتیں، دروازے اور کھڑکیاں جھاڑیں۔ فرش کو سرف ڈال کر رگڑ رگڑ کے رانی سے دھلوا لیا۔ کمرے میں اتنے سالوں سے رچی بو کا دھیرے دھیرے ہی سخی خاتمہ ضرور ہو گیا تھا۔

وادی کے سارے کپڑے استری کروا کر الماری میں ترتیب سے رکھے تھے۔ ایک سفید رنگ کا سوٹ انہیں منسلک دھلا کر پہنا دیا۔

اور جب دوبارہ انہیں کمرے میں لایا گیا تو ان کی بوڑھی آنکھیں روشن روشن منظر دیکھ کر نمی کے باعث چپکنے لگیں۔ وہ بول نہیں سکتی تھیں مگر اشاروں سے انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ بہت خوش محسوس کر رہی ہیں۔ انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرے ہاتھوں اور سر کو چھوا تھا۔ اس محبت کے انعام پر میری آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ میں نے وادی کے سفید جھاگ جیسے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”وادی! اس میز پر کیلے رکھے ہیں۔ آؤ ابھی موجود ہیں۔ یہ پھل نرم ہے۔ آپ آسانی سے کھالیں گی۔“ بوا کل پانی بھی پیاس ہی رکھا ہے۔ آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہوئی تو یہ کھنٹی بجائے گا۔ رانی فوراً آجائے گی۔ میں ابھی آپ کے لیے مزید اس سواپ بنا کر لاتی ہوں۔“

”ہاں! ہاں۔“ وادی گویا میری بات سمجھ چکی تھیں، سو اسی لیے اثبات میں سر ہلانے لگیں۔ میں نے ایک سے کہہ کر ایک نرس کا بندوبست بھی کروا لیا تھا۔ یہ نرس بہت اچھی تھی۔ یہ وہ عورت تھی۔ وادی کی جی جان سے دیکھ بھال کرنے لگی۔ انہیں منسلاتی دھلاتی۔ روزانہ نیا سوٹ پہناتی احتیاط سے کھانا کھلاتی تھی۔ وقت پر دوا دیتی۔

وادی کو خوش باش اور بہتر حالت میں دیکھ کر مجھے لگتا تھا گویا میرے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔ اسی طرح لاما کا کمرہ بھی ابتری کا شکار تھا مگر میرے ہاتھوں نے اس کمرے کو کبھی سنوار کر ہی چھوڑا تھا۔ مانا نے بھی مجھے اپنی من مانی کرنے دی تھی۔ وادی کی طرح انہوں نے بھی خاموشی سے مجھے سراہا ضرور تھا اور میرے سر پر پہلے دن کی طرح ہاتھ رکھ کر خاموشی دعا دی اور پھر بیچ کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

گھر کا اندرونی نظام میرے ہاتھ میں آیا نہ صرف

گھر میں سلیقہ نظر آنے لگا بلکہ کچن کے اخراجات بھی نہ ہونے کے برابر ہو گئے تھے۔ راشن ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اور جو پیسے بھی مختلف بلز اور راشن کے لیے ایک دیتا تھا۔ ان میں سے بھی کافی بچ جاتے تھے۔ حالانکہ پہلے پہل مینے میں دو دو دفعہ راشن آتا تھا۔ جوں ہی میں نے یہ بات نجمہ بی سے کی تو وہ ٹھنڈے لہجے میں بولیں۔

”بوا! میں بھلا کیا کروں۔۔۔ کیف باؤ، راشن اور بل وغیرہ کے پیسے مجھ سے لے جاتے تھے۔ مگر نہ بل ادا ہوتا تھا اور نہ ہی راشن آتا۔ مجبوراً میں پھر ایک سے پیسے مانگنے کھڑی ہو جاتی تھی۔“ نجمہ بی جی تو کہہ رہی تھیں۔ انہیں بھلا اس بڑھاپے میں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

”اگر کیف کو پیسے چاہیے ہوں تو ایک سے مانگ۔ گھر کے اخراجات میں سے پیسے کیوں لیتا ہے۔“ میں الجھ کر رہ گئی۔

”ان ہی کے پیسے ہی جی، جہاں سے مرضی لیں۔ ہم تو اس معاملے میں بول نہیں سکتے۔“ وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہوئی تھیں۔

”بوا! میں ذرا آرام کروں۔ اللہ تمہیں سکھ دے۔“ جب سے آئی ہو۔ میری بوڑھی بڑیوں کی بچت ہو گئی ہے۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ تمام زندگی ان کا اسی گھر میں قیام رہا تھا۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں، سوا ایک کے باقیو ما نہیں اپنے گھر لے آئے تھے۔ یہ ان کی خاندانی ملازمہ تھیں۔

میں اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ رات کے کھانے کی تیاری کرنا تھی مگر ماما کی فون کال نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ فون بند کر کے ابھی کچن میں قدم رکھا ہی تھا، جب کیف آندھی طوفان کی طرح چلا آیا۔

”نجمہ بی کہاں ہیں؟“ مجھے دیکھ کر وہ ٹھک گیا تھا۔ ”وہ آرام کر رہی ہیں۔“ میں چکن کا پکٹ کھول کر گوشت کا حساب لگا رہی تھی کہ ایک پکٹ سے رات کے لیے سالن بن سکے گا۔

”اور تم کیا کرنے لگی ہو؟“

”کھانے کی تیاری۔“ میں نے ایک اور پکٹ فریزر میں سے نکالتے ہوئے بتایا۔

”یہ کام مجھ کی بے پرواہی رہنے دینا تھا۔“
”کیوں؟ میں نہیں کر سکتی کیا؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”بہت اچھا کرتی ہو۔ مگر خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم نے اور ایک نے ہنی مون کے لیے نہیں جانا۔“ وہ کچھ کہتے کہتے بات پلٹ گیا تھا۔

”نہیں بھلا ہنی مون کے لیے جانا ضروری ہے؟“
”بہت ضروری ہے۔ تم لوگوں کو کیسے کھونٹے پھرنے ضرور جانا چاہیے۔“ وہ اسٹول کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔ یعنی اس کا ابھی مزید گفتگو کرنے کا ارادہ تھا۔

”تمہیں ایک سے بات کرنا چاہیے تھی۔“ وہ مجھے اکسا رہا تھا۔

”دیکھو گی۔۔۔ ایک فارغ ہوں گے تب ہی تو کہیں جائیں گے نا۔“ میں نے نوکری میں سے پیاز نکال کر پھیلنا شروع کر دی تھی۔

”اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرو گی تو پھر یوں ہی بیٹھی رہ جاؤ گی۔ وہ نہیں فارغ ہونے والا۔ یہ کاروبار یہ روپیہ پیسہ اسے جان سے زیادہ پیارا ہے۔ ادھر ادھر ہونے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب یہ تمہاری محبت پر منحصر ہے کہ تم اپنی بات اس سے منوا سکتی ہو یا نہیں۔“ وہ بڑے عجیب سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”اگر تو تمہاری محبت کا پلڑا بھاری ہوا پھر تو سمجھو تم کامیاب ہو گئیں۔“

”مجھے ایک کی محبت پر شک نہیں ہے۔ اگر وہ فارغ ہوئے تو ضرور میری بات مان لیں گے مگر مجھے ان کی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ سو اس لیے میں اپنی وجہ سے ایک کو پریشان نہیں کر سکتی۔“ میرا انداز دو ٹوک قسم کا خاصا اور روکھا تھا۔ تب ہی تو کیف کا لہجہ بھی بدل گیا اور گفتگو کا انداز بھی۔

”تمہاری مشرقیت کا اظہار کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ ویسے ہی تمہارے دامن میں پھنس چکا ہے۔“

”کیف! میں اس کے الفاظ سن کر رنگ رہ گئی تھی۔“

”تم کس قسم کی لہجہ کو بوز کر رہے ہو؟“

”میں نے کچھ غلط کہا؟“ وہ فوراً ”موصوم بن گیا تھا۔“

”میرے بھائی کو محبت کے دامن میں الجھا لیا ہے۔ ویسے میں چاہتا بھی یہی تھا۔“

”کیف! ازرا سوچ مجھ کر بات کرو۔ میں اس وقت تمہاری بڑی بھائی بھی ہوں۔ میرا اور تمہارا رشتہ بدل چکا ہے۔“ میں نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا تھا۔

”ہماری دوستی کا رشتہ تو ابھی تک قائم دائم ہے۔ دوست ہونے کے ناتے تم میرا ساتھ دو گی نا۔“ وہ اتنے کھدے لہجے میں بولا تھا کہ میرا دل کلپ کر رہ گیا۔

”کون سی دوستی؟“

”وہ ہی جو میرے تمہارے درمیان تھی۔“ وہ چبا چبا کر بولا۔

”تم آخر چاہتے کیا ہو؟“ میں اس کے بدلے انداز دیکھ کر ٹھنک گئی تھی۔ وہ مذاق کے رنگ میں بات نہیں کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ گرا طنزیہ، کاٹ دار قسم کا تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی سننا اٹھی۔

”اب کیا ہے نا دانش مندانہ سوال۔۔۔ میں بھلا کیا چاہتا ہوں۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا تھا اور پھر بولنے لگا۔ اور میرا رنگ لمحہ بہ لمحہ فق ہوتا جا رہا تھا۔



نیا اور سی بھی ان دنوں اپنے حجرے سے باہر نکل آئی تھیں اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دونوں نے گھر پلو امور میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ اگر میں کپڑے دھونے کے لیے مشین لگاتی تو سی یا نیا فوراً ساتھ دینے کے لیے آ جاتی تھیں۔ اسی طرح اگر میں سالن پکا رہی ہوتی تو نیا برتن دھونے کھڑی ہو جاتی۔ آٹا گوندھ دیتی۔ حتیٰ کہ روٹی بھی پکا دیتی۔ مجھ کی گویا چھٹی ہو گئی تھی۔ اب وہ صرف سودا سلف لا کر دیتی تھیں۔

دوسری طرف سی کپڑے استری کرتی۔ مردوں کے الگ رکھتی۔ خواتین کے الگ رکھے جاتے ان

دونوں کی شخصیت میں در آنے والی تبدیلیوں نے فائز اور عون کو بھی چونکا دیا تھا اور وہ ان دونوں کے سدھر جانے کا تمام تر کڑٹ مجھے دیتے تھے۔

ادھر کیف کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ سب گھر والے اس طرح سے میرے گرویدہ ہو جائیں گے۔ ملا اور دادی کچھ کشتی تو نہیں تھیں مگر ان کی آنکھوں میں موجود شکر گزاری کے رنگ میری نظروں سے اوچھل نہیں تھے۔

نیا اور سی فیشن سے لے کر اسکن کی کیئر تک ہر مشورہ مجھ سے لینے کے لیے بھاگی بھاگی چلی آتی تھیں۔ ان کے خیال میں میرے پاس معلومات کا بہت بڑا خزانہ موجود ہے اور میں بڑے شر سے آئی تھی سو مجھے ہر فیشن کے بارے میں علم تھا۔ یہ تو نیا اور سی کی سادگی بھی حالانکہ مجھ بدلے فیشن کا کچھ پتا نہیں تھا مگر میں غالی سے مفید مشورے لے کر انہیں معلومات فراہم کرتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ دونوں میرے اور بھی قریب آ گئی تھیں۔

ان کا زیادہ وقت اب میرے ساتھ گزرتا تھا۔ مل جل کر محبت پت کاٹ بھی ہو جاتے تھے گھر بھی صاف ستھرا ہو جاتا تھا اور پھر کافی دیر کپ شپ بھی چلتی رہتی۔ وہ دونوں صرف سونے کے لیے اپنے کمرے میں جاتی تھیں۔ زیادہ تر لاؤنج میں ہی بیٹھی رہتیں۔

اس دن بھی سی اپنی جی کا مجھ سے پوچھ کر فراق سی رہی تھی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھی۔ ایک دم میں نے میگزین ہاتھ سے رکھ کر کچھ سوچتے ہوئے سی سے پوچھا۔

”بہت دن ہوئے کیف گھر نہیں آیا۔“

”وہ گھر کہاں آتا ہے۔ زیادہ تر شرے باہر ہی رہتا ہے۔“ وہ احتیاط سے سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے بولی۔

”مگر کیوں؟“ میں حیران ہوئی۔ جب سے میں آئی تھی۔ کیف کا بھی معمول دیکھ رہی تھی۔ تاہم میں نے ایک سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیف کہاں جاتا ہے۔

”کیف کیوں؟“ میں نے سی سے پوچھا۔

”نہیں میرے خیال میں مجھ کی جانتی ہیں۔“

”پتا نہیں۔“ صاف لگ رہا تھا وہ ٹالنے کی کوشش میں ہے۔

”کیوں پتا نہیں؟ یہ کو، مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔“

میں نے جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا لیا تھا اور میری ناراضی کے خیال سے وہ فوراً ”بول اٹھی۔“

”نہیں بھائی! ایسی بات نہیں۔“ وہ کچھ گھبرا گئی تھی۔ ”دراصل پہلے ایک بھائی اور کیف کی کبھی بی نہیں تھی۔ کیف ہر وقت ایک بھائی سے جھگڑتا رہتا تھا اور یہ جھگڑا شدت اختیار کر جاتا تھا۔ بات بات پائی تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک دفعہ کیف نے غصے میں ایک بھائی کا سر پھاڑ دیا تھا۔ ایک دفعہ گولی بھی چلا دی تھی۔ مگر یہ کافی سال پرانی بات ہے۔ اب تو اس نے ایک بھائی سے صلح کر لی ہے۔ پہلے سے کافی بدل گیا ہے۔“

ورنہ تو ہر وقت خون سوار رہتا تھا اس کے سر پر۔ پھر جب اس نے بتایا کہ وہ ایک بھائی کے لیے لڑکی پسند کر چکا ہے۔ تو ہم سب حیران رہ گئے اور زیادہ حیرانی اس وقت ہوئی تھی جب ایک بھائی نے اس کی پسند کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔

ان دنوں ہم لوگ ایک بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھ رہے تھے۔ عون کا خیال تھا۔ ایک بھائی کے ساتھ گل مناسب رہے گی۔ مگر کیف کو گل پسند نہیں تھی اور یہ ہماری اور ایک بھائی کی خوش نصیبی تھی کہ آپ ہمیں مل گئیں۔ ”دراصل پہلے پہل ہمارے ذہن میں تھا کہ آپ بہت مغرور اور تنک چڑھی ہوں گی۔ اسی لیے میں اور نیا آپ سے ذرا دور دور ہی تھیں مگر آپ تو ہماری سوچوں کے بالکل برعکس نکلی ہیں۔“

وہ سادگی بھرے لہجے میں بتاتی چلی گئی تھی۔

”کیف کا جھگڑا ایک کے ساتھ کس بات پر تھا؟“

میں نے سوچوں کے بھنورے نکل کر پوچھا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا۔ میرے آنے سے پہلے کی بات ہے۔“

”نیا کو بتا ہو گا؟“ میں نے سی سے پوچھا۔

”نہیں میرے خیال میں مجھ کی جانتی ہیں۔“

”اب تو ان کے درمیان کوئی لڑائی نہیں؟“ میں اپنی تسلی کے لیے پوچھ رہی تھی۔
”نہیں، بالکل بھی نہیں۔ ایک بھائی تو مزاجاً بھی اور دل کے بھی بہت اچھے ہیں۔ کیف جذباتی اور قصہ ور ہے۔ تاہم ایک بھائی نے بھی بات نہیں بڑھنے دی؟“

وہ فراک سی چکی تھی۔ اب سلمان سمیٹ رہی تھی اور میں گہری سوچوں میں ڈوب ابھر رہی تھی۔ دراصل میرا ذہن ہر ہی طرح سے الجھ چکا تھا۔
”آخر کیف نے مجھے کس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے؟ مجھے ایک کے لیے پسند کرنا۔ حق ہمیں اتنی بھاری جائیداد لکھوانا۔“ میرا ذہن ایک نقطہ پر آکر ٹھہر چکا تھا۔ ”بہر حال جو بھی ہے۔ کیف قیوم اپنے گھر والوں سے لے کر ایک تک سب کو دھوکا دے سکتا تھا مگر مجھے نہیں۔ میں یعنی ساجد مراد اس کے جال میں کبھی نہیں پھنس سکتی اور میرا یہ خود سے عہد تھا کہ اس ساری پلاننگ کی وجہ آخر جان کر ہی رہوں گی۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور پھر مطمئن ہو گئی۔



یہ اس دن کی بات ہے جب ایک کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا تھا اور ٹھیک اسی شب کیف چلا آیا۔ اس کے انداز آج کافی بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا وہ کوئی فیصلہ کر کے آیا ہے۔ میں اس وقت چکن میں تھی اور وہ میرے پیچھے چکن میں ہی چلا آیا۔ ”مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔“ اس کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔ میری چھٹی حس نے فوراً مجھے چونکا دیا۔

”کون سی بات؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ اس کے دھونس بھرے انداز نے مجھے بے حد غصہ دلایا تھا مگر میں بھی ضبط کر گئی۔ ”کہاں؟“

”بیٹھک میں۔“ مجھے تم سے تہائی میں بات کرنا ہے۔“

”جو کہتا ہے۔ یہیں کہہ دو۔“ میں پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا تھا۔ پھر بڑے پراسرار انداز میں بولا۔

”میرے ساتھ ایک ڈیل کر لو۔“
”کیسی ڈیل؟“ اب کے میں چیخ ٹھک گئی تھی۔ بات معمولی نوعیت کی نہیں تھی۔ میرا دل خوف کے مارے سکڑنے لگا۔

”یہ گھر تمہارے نام ہو چکا ہے اور ایک کی دو فرخچاز بھی۔ تم ان کے کاغذات قانونی طور پر میرے نام کر دو۔“ اس نے گویا بڑے اطمینان سے آگ پر پڑوں کے چھینٹے پھینکے تھے۔
”کیا مطلب؟“ میں چیخ اٹھی۔

”چلاؤ مت، میری بات آرام سے سنو۔ میں نے یہ تمام کوششیں اسی وجہ سے کی تھیں۔ مجھے ایک کا اور تمہارا اعتماد جیتنا تھا اور پھر اپنا مقصد پورا کرنا تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ یوسا کے ذریعے اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا مگر میرا اپنی زندگی کی چپلی اور بڑی خوشی کو کھو دینے کے خوف نے مجھے تم تک پہنچایا۔ میں یوسا کو ایک کے نکل میں دے کر کوئی رسک نہیں

لے سکتا تھا۔ حالانکہ یوسا کے ذریعے ایک کی ساری پر اپنی مجھے مل سکتی تھی۔ اب تو صرف اس گھر کی اور دو فرخچاز کی بات ہے۔ بہر حال تم مجھے تمام کاغذات دے دو۔ علاوہ ازیں نتائج کی ذمہ داری تم ہی پر ہوگی۔ میں تمہارے ارد گرد ایک جال بن دوں گا۔ تم اس جال سے نکل نہیں پاؤ گی۔“

وہ گویا زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا اور میرے قدموں کے نیچے سے زمین دھیرے دھیرے سرکنے لگی تھی۔

”تم دھوکے باز ہو کیف! تم نے مجھے ہی نہیں اپنے بھائی کو بھی دھوکا دیا ہے۔ جس کے ساتھ تمہارا خون کا تعلق ہے۔ مجھے افسوس ہے تمہاری گندی ذہنیت پر۔“ لالچ پر، کمینگی دکھانے پر۔ ”میں گویا غصے کے عالم میں پھٹ پڑی۔“

”کچھ بھی کہہ لو۔ کاغذات تو تمہیں دے دی ہیں پڑیں گے۔“ اس نے گویا آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔
”اور اگر نہ دوں تو؟“

”تو میرا اپنی تہائی کے لیے تیار ہو جانا۔ میں ایک کو صاف لفظوں میں بتا دوں گا کہ تم میری محبت میں گرفتار تھیں اور میرے مجبور کرنے پر تم ایک سے نکل کر کرنے پر تیار ہو گئی تھیں تاکہ ایک کی دولت، ہم دونوں ہتھیالیں۔ تمہارے پاس موجود کاغذات تمہاری لالچ کے گواہ ہیں۔ ایک کو مزید یقین دلانے کے لیے میں تمہاری اور اپنی دوستی کا قصہ بھی سنا دوں گا۔ ایک دو گواہ بھی پیش ہو جائیں گے۔ پھر تم کیا کر سکو گی؟“

وہ گویا استہزائیہ مسکرا رہا تھا۔ میری بے وقوفی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس نے مجھے ہی نہیں، ایک کے ساتھ بھی دھوکا دیا تھا اور نجانے اس نے مزید کیا کچھ کرنا تھا۔ یہ اوّل خوف کے مارے پھپھڑا رہا تھا مگر میں نے خود کو کمزور ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”میں تمہیں کبھی بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔ دھوکے باز اور فریبی لوگوں کو ان کے انجام تک پہنچا کر رہوں گی۔ تم نے رشتوں کے تقدس کا بھی خیال نہیں رکھا۔ کیا اتنے

سال کلچر اور یونیورسٹی میں بیٹھی سیکھتے رہے ہو؟“
”زیادہ بڑبڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ ورنہ اپنی بربادی کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ کیف نے گویا آخری وار تنگ دی تھی۔

”تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو۔ اگر جائیداد کا کوئی جھگڑا ہے تو ایک سے کہو۔ اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے۔“ میں گویا تنک کر بولی تھی۔

”اگر وہ آرام سے مانی جاتا تو پھر مجھے اتنی بڑی پلاننگ کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ ہمارے حق پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اور ہمیں اپنے کاروبار میں ستھوا دار ملازم رکھنا چاہتا ہے۔ مانی فٹ! اس کی چاکری کرتی ہے میری جوتی۔ اسے ہر صورت مجھے برابر کا حصہ دار بنانا ہو گا ورنہ میں ہر حد سے گزر جاؤں گا۔“ وہ دباؤ کر بولا۔

”تم سوری کیف! میں تمہاری بات نہیں مان سکتی۔ مجھے اپنے شوہر کا اعتبار اور مان عزیز ہے۔ میں اس کے اعتماد کا خون نہیں کر سکتی۔“ میرے دو ٹوک فیصلہ کن انداز نے اسے بھڑکا کر رکھ دیا تھا۔ وہ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔

”میں تمہیں ایک کی زندگی سے نکل پھینکوں گا۔“ وہ غصے کے مارے کف اڑا رہا تھا۔

اور پھر اس نے اپنا کاناچ کر دکھایا۔ وہ مجھے ایک کی زندگی سے باہر نکل چکا تھا۔ یہ اسی مان، اعتبار اور اعتماد کو بچانے کا نتیجہ تھا جو میں اپنی ماں کے گھر واپس آچکی تھی۔ ایک نے کچھ زیادہ تو نہیں کہا تھا مگر اس کے چند الفاظ نے میرے جسم سے گویا جان تک نکال لی تھی۔

”مجھے دکھ ہوا ہے ساجد! میرا دل اس وقت صدمے کے زیر اثر ہے۔ میں تمہارے ساتھ حتیٰ کہ پیش نہیں آنا چاہتا۔ تم ابھی چلی جاؤ ڈرائیور باہر منتظر ہے۔ اگر میں اس صدمے اور دکھ کی کیفیت سے سمجھو تا کر کے سنبھل گیا تو تمہیں لینے آ جاؤں گا۔ ورنہ ہمارے راستے جدا ہیں۔ تم وہ کاغذات بھی ساتھ لے جانا۔ میں تحفہ دے کر واپس لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

دھیمالوجہ، جھکی آنکھیں اور ضبط کی سرخیوں سے سجا چہرہ۔ اس نے نہ وضاحت طلب کی تھی اور نہ ہی مجھے خود سے دور کرنے کی وجہ بتائی۔ مگر میں جان تو چکی تھی کہ کیف کی خود غرضی اور کمینگی رنگ لے آئی ہے۔

میں نے اسی شب سلمان باندھا تھا اور خالی دل لیے ایک کے گھر سے نکل آئی۔ اپنے پیچھے وادی، ملا اور نیا، سنی کو منتظر اور روتا چھوڑ کر۔ مگر پورے ڈیڑھ ہفتے بعد بھلا کیا ہوا؟



”آپ۔۔۔ میں نے پروے برابر کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گویا پتھر ہو گئی تھی۔ ایک عین میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ کب دے پاؤں گے میں داخل ہوا تھا۔ مجھے

قطعاً خبر نہیں ہو سکی۔ اپنی تلخ اور زہریلی سوچوں میں گم، ٹھنکی کے سامنے کھڑے کھڑے میری ٹانگیں گویا شل ہو کر رہ گئی تھیں۔

”ہاں میں۔۔۔ کیا تمہیں امید نہیں تھی کہ میں واپس آؤں گا۔“ وہ ہی مخصوص نرم اور دھیمالہجہ۔ میرے دل کی دھڑکنیں اول روز کی طرح بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

”جس طرح مجھے گھر سے نکالا تھا۔ بھلا کوئی امید باقی رہ گئی تھی کیا؟“ نچانے کمال سے ڈھیروں آنسو میری آنکھوں میں خود بخود اتر آئے تھے۔

”وہ وقت اور لمے ہی کچھ ایسے تھے۔ ابھی تک اپنے ان الفاظ پر پچھتا رہا ہوں مگر میں بھی بھلا کیا کرتا،“ کیف نے کمالی ہی کچھ اس طرح سے سنائی تھی کہ اس کے حرف حرف پر اعتبار آ گیا۔ تم بے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ یہی میری سب سے بڑی ناولی تھی جس پر ابھی تک پشیمان ہوں۔ جو کچھ وہ بتا رہا تھا، میری طرح کوئی بھی آدمی ان باتوں کے جال میں پھنس سکتا تھا۔“ وہ سر جھکائے دھیمی آوازیں کہہ رہا تھا۔

”آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ میں ابھی لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی جب ایک نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

”پلیز ساجی! پہلے میری بات سن لو۔ پھر جو کچھ کہو گی،“ میں سنتا رہوں گا۔ جو سزا سناؤ گی۔ مجھے منظور ہو گی۔“ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔ گویا کہہ دینے یا نہ کہنے کے درمیان الجھ رہا تھا۔ پھر جب بولا تو آوازیں ہمیشہ والا ٹھہرا تھا۔

”بات کمال سے شروع کروں۔ بہت پہلے سے،“ جب میں چوہدری قیوم کے آگن میں کھینے والا پہلا بچہ تھا۔

پورے آٹھ سال تک میں پہلا اور آخری بچہ ہی رہا تھا۔ اس دوران میرا کوئی اور بھائی اس دنیا میں نہیں آیا۔ میرے دادا کے لیے یہ بات خاص تشویش ناک تھی مگر انہوں نے مجھ پر ہی گویا صبر کر لیا تھا۔ ان کی مجھ

سے محبت کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ مجھے اپنی زندگی کی واحد خوشی سمجھتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں گونے والدین کی اولاد تھا۔ میری ماں اور باپ دونوں قوت گویائی سے محروم تھے۔ میرے ابا، دادا کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کی زمینوں اور کارخانے کے اکلوتے وارث۔

ان کے ہاں، میں پہلا صحت مند بچہ پیدا ہوا تھا۔ میرے دادا کے لیے میری پیدائش ہفت اگلیم کی دولت کے برابر تھی۔ انہوں نے جی بھر کے میرے ناز اٹھائے تھے۔ مجھے بے تحاشا محبت سے نوازا تھا۔ میں ان کی محبت کے حصار میں خود کو ہمیشہ محفوظ سمجھتا تھا مگر یہ حصار تب ٹوٹ کر ٹکڑا گیا جب میرے دادا اس دنیا سے چلے گئے مگر جانے سے پہلے وہ اپنی ساری جائیداد میرے نام کر گئے تھے۔ اور ان کے چلے جانے کے بعد کے بعد دیگرے میرے چار اور بھائی پیدا ہوئے۔ اور پھر ہمارے ابا معمولی سے بخار میں چل بسے۔ تب میں کافی سنبھل چکا تھا اور کچھ وقت کی سختیوں نے مجھے اچھی طرح سے سارے سبق پڑھا دیے تھے۔

میں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ کاروبار سنبھال لیا تھا۔ تب کیف بہت نا سچھ اور ناواں تھا اور میری نظر میں تو بالکل بچہ تھا۔ مجھے اپنی ماں اور بھائیوں سے بہت محبت ہے۔ اسی محبت نے مجھ سے بے تحاشا جدوجہد

کروائی۔ میں نے اپنے قوت بازو پر، اپنی محنت اور جدوجہد سے اپنا گھر بنایا تھا۔ چار فرخچاز خریدیں۔ ایک دم سے سارا کچھ نہیں ہو گیا تھا۔ بے تحاشا محنت اور قربانیوں کے بعد میں اپنا ایک نام بنایا تھا۔

تب کیف بڑھنے کے لیے ہاشل میں مقیم تھا اور ما کی کسی کزن کے گھر بھی اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ انہی کی بیٹی یو ساسا سے وہ شادی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اس بات سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ ہماری رشتے کی اس خالہ نے یعنی یو ساسا کی ماں نے میرے خلاف کیف کے دل میں زہر بھرا شروع کر دیا تھا۔

وہ چاہتی تھیں کہ کیف اپنے حصے کی جائیداد لے کر ان کے پاس آجائے اور جب میں نے ایمان داری کے ساتھ قانونی طور پر اپنے چاروں بھائیوں کو دادا کی جائیداد کا حصہ دار بنایا تو ہم سب کے حصے میں تھوڑی تھوڑی سی برابری آئی۔ یہی بات ہماری خالہ کو بھڑکا گئی تھی۔ ان کی نظر میرے کاروبار پر بھی اور وہ چاہتی تھیں کہ میں اپنے بزنس میں سے بھی کیف کو حصہ دوں۔ ظاہر ہے، میں نے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں کیف مجھ سے بدگمان ہو گیا۔ میرے ساتھ جھگڑا رہا۔ بات خون خرابے تک آ گئی تھی۔ میں کیف کو حصہ دار بنانا بھی لیتا انچرچ میں خالہ اور ان کی بیٹی نہ ہوتی۔

یہ مسئلہ ضد اور انا کا بن گیا تھا۔ میری اور کیف کی ناراضی چل رہی تھی۔ ایک دن وہ خود میرے پاس چلا آیا۔ اپنی گزشتہ غلطیوں کی معافی مانگتا رہا تھا میں نے بھی کھلے دل سے اسے معاف بھی کر دیا۔ ہمارے پہلے کی طرح تعلقات بحال ہو گئے تھے۔ مجھے نہیں خبر تھی کہ یہ سب ایک سازش اور منصوبے کی کڑی ہے۔

پھر ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ پھوپھو کے بزنس میں قیام پزیر فیملی سے خاصی انڈر اسٹینڈنگ رکھتا ہے اور ان کی بیٹی کو وہ میرے لیے پسند کر چکا ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی عورت ایسی نہیں تھی جو ہمارے اس طرح کے معاملات نمٹاتی۔ فائز اور عون کی شادیوں کے تمام معاملات اسی نے ہی دیکھے تھے۔

اگرچہ فائز اور عون نے نو مینج کی تھی۔ دوران تعلیم ہی دونوں پر شادی کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ بہر حال جو بھی تھا احسن طریقے سے ان کی شادیاں ہو گئی تھیں۔

اما کی ساری ذمہ داریاں کیف نے ہی نبھائیں۔ اوہ کیف نے مجھے جو کچھ تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے لگا، تم میرے آئیڈیل کا ایک حصہ ہو۔ میرے دل نے تمہارے حق میں فیصلہ دے دیا تھا اور میں بغیر دیکھے ہی تمہاری سادگی اور معصومیت کا سیر ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ ہماری ماں ایسے معاملات نہیں دیکھ

سکتی۔ جو کچھ کرنا تھا کیف نے ہی کرنا تھا اور وہ اپنی پلاننگ کے تحت سب کچھ کرنا رہا اور میں اپنی سادہ دلی میں اس سے ہمیشہ دھوکا کھاتا رہا۔

شادی کے سلسلے میں ہونے والے اخراجات کے لیے جب رقم کم رہ گئی تو وہ دوبارہ مجھ سے پیسوں کا مطالبہ کرنے لگا۔ اگر مجھے سمجھتا ہوتا تو میں تب ہی سمجھ جاتا مگر میں نے شک اور بدگمانی کو کبھی دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ پھر حق مہر کے طور پر اتنی بھاری جائیداد پر کیف کی ضد اور اصرار۔ میں حیران ضرور ہوا تھا مگر چونکا پھر بھی نہیں۔ میں ناانستہگی میں وہ ہی سب کچھ کرنا رہا جو وہ مجھ سے کروانا چاہتا تھا۔

میرے لیے سب سے برا انعام تم تھیں ساجیہ! ایسا انعام جو مجھے کیف کے توسط سے ملا۔ میں تمہاری سادگی اور معصومیت کا اسیر ہو گیا تھا۔ مجھے تم سے اور تمہارے خالص جذباتوں سے بھرے دل سے محبت ہو گئی تھی۔ تب کیف نے سوچا کہ بازی الٹی جا رہی ہے اور وہ اس بازی کو اپنے حق میں کرنے کے لیے بے صبری کا مظاہرہ کر گیا یعنی تمہارے ساتھ دیکھو گفتگو کر کے ایسی گفتگو جو کسی نے من و عن سن لی تھی اور پھر مجھے بھی سنا دی۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگ اپنے زرخیز دماغ کو لوگوں کے گھر اور دل اجاڑنے کے لیے کیسے استعمال کر لیتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ میرے دل میں شک کی آگ جلا کر خود اپنے دل کو آباد کرنے گیا تھا مگر ہماری لالچی اور خود غرض خالہ نے کل رات یو ساسا کو ایک کروڑ پتی سیٹھ سے

بیابا دیا اور کیف قیوم کے دل پر گویا شام غریباں اتر آئی۔ اس صدمے میں وہ بانیگ سے ٹکرا کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ ادھر آنے میں اسی لیے دیو ہو گئی تھی کہ مجھے اس کے پیچھے ہسپتال جانا پڑا۔

دیکھو ساجی! مجرم تو وہ ہم دونوں کا ہے مگر میں نے اسے تمہاری طرف سے بھی معاف کر دیا ہے۔ کیا کروں، میری قوت گویائی سے محروم ماں، بول نہیں

سکتی، مجھے حکم نہیں دے سکتی۔ مگر اس کی آنکھوں کی
الٹا کو لوٹا دینا میرے بس میں نہیں ہے اور میری ماں کی
خواہش ہے کہ جب میں واپس آؤں تو تم بھی میرے
ساتھ ہو۔ کیا تم میری ماں کی خواہش پوری کرو گی؟“
وہ آنکھوں میں اس کے دیے سجائے منتظر کھڑا
تھا۔ میری ایک ہاں نے اس کے چہرے کو تینا کی بخش
دینا تھی۔ مگر میں بھی پورے ایک سنیے کی ناراضی کا
حساب لیے بغیر اسے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اگرچہ
ایک مجرم نہیں تھا۔ مجرم تو وہ تھا، جولائی میں اور پوسا
کے حصول کی خاطر خون کے رشتوں کو کھو دینے والا
تھا۔ اب اس مجرم کو بھلا اور کیا سزا دی جانی تھی۔
یہ چار اہل تروا نے کے ساتھ ساتھ ٹانگ بھی تڑوا چکا
تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے اپنی غلطی کا
احساس ہو گیا تھا۔ وہ پشیمان تھا، شرمندہ تھا۔ سو میں
نے سوچا تھا کہ ایک پشیمان کو بھلا اور پشیمان نہ ہی کیا
جائے تو بہتر ہے۔

مگر ایک کوستانے کا میں پورا پورا ارادہ رکھتی تھی۔
سو اس لیے خود پر ناراضی کا خول پڑھائے بولی۔
”میں آپ کو معاف نہیں کر سکتی ایک! آپ
واپس چلے جائیں۔ میں اپنی انسلٹ نہیں بھول سکتی۔
آپ نے بغیر وضاحت لیے مجھے گھر سے کیوں نکالا؟“
”مجھے معاف کر دو ساجی! میں واقعی شرمندہ
ہوں۔“ ایک میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر گھبرا
اٹھا۔ وہ ہر صورت مجھے منانا چاہتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ
ایک کو منانا آسانی کہاں تھا اور ابھی وہ اسی سوچ میں گم
تھا کہ مجھے کیسے منائے کہ اچانک دھاڑ سے دروازہ کھلا
اور مہی اور نیا کمرے میں داخل ہو کر مجھ سے لپٹ
گئیں۔

”ہم آپ کو زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے بھابی!
اللہ کی قسم، آپ کے بغیر پورا گھر دیران ہو گیا ہے۔“
مہی اور نیا بھرائی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ میں نے
ان دونوں کی بے لوث محبت کو محسوس کرتے ہوئے
ایک کو دیکھا تو وہ معصوم صورت مینا کر بولا۔

”اللہ کی قسم! میرا دل اور کرا بھی دیران ہے۔“
میری نظر ایک کے چہرے سے ہٹ کر ایک اور چہرے
سے الجھ گئی تھی۔ یہ چہرہ ماما کا چہرہ تھا مگر میں جانتی تھی کہ
یہ خاموش آنکھیں اور او اس چہرہ کا الٹا کر رہا ہے۔
مجھے اس لمحے ٹوٹ کر اس عورت کی خاموشی پر پیار آ گیا
تھا۔

کچھ لوگ اس خاموشی کو پراسراریت سمجھتے تھے مگر
میں جانتی تھی یہ پراسراریت نہیں۔ اس خاموشی میں
ایک کی ماں کا بھرم پوشیدہ ہے۔ آج بھی میرے گھر
والے اس حقیقت سے ناواقف تھے۔ کوئی بھی نہیں
جانتا تھا کہ سفینہ بیگم کیوں خاموش رہتی ہیں اور نہ ہی
میں نے کسی کو بتانے کی کوشش کی تھی کہ ماما خاموش
کیوں ہیں۔ وہ قوت گویائی سے محروم ہیں۔

میری سوچتی ہوئی نظر نے اس لمحے ایک مرتبہ پھر ماما
کے پاکیزہ چہرے کا طواف کیا تو ان کے چہرے کی التجا
میرے دل پر گویا جا لگی۔

”ساجی! چلو نا، میرا گھر اور میرے بچے کا دل بچ بچ
تمہارے بغیر دیران ہے۔“

میرے دل کو ایک دم کچھ ہونے لگا تھا اور میں
بھاگ کر ماما سے لپٹ گئی۔ بدگمانی کے باطل پھٹ چکے
تھے۔ دلوں پر جی گرد صاف ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے
گھر والوں اور ایک کے گھر والوں کے چہرے پر چمکتی
خوشی کو دل سے محسوس کیا تھا اور گویا کھل کر مسکرا
دی۔

کلے، اودے، سرسئی، سیاہ بالوں کے پیچھے کا منظر
... خود بخود صاف ہو گیا تھا۔ اب ستاروں سے بھرا
آسمان میرے سامنے تھا، اور میں نے کنکشاؤں کی
بارات کو اپنے گھر میں اترتے دیکھا اور مسکرانے لگی۔



ان کے نام جو امن اور آزادی کی جدوجہد میں کام آئے

یہ کون تھی جن
جن کے لہو کی
اشرفیاں چمن چمن چمن چمن
دھرتی کے پیہم پہلے
کشتوں میں ڈھلچکی جاتی ہیں
کشتوں کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ غم
یہ کون لٹ
جن کے جسموں کی

بھر پور جوانی کا کنڈن
یوں خاک میں مریزہ مریزہ ہے
یوں کوہِ کوہِ بھر ہے
اے ارضِ بحر، اے ارضِ بحر!
کیوں توجہ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نمل
ان ہونٹوں نے اپنے مرجان
ان ہاتھوں کی بے گل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟
اے پوچھنے والے پر دیسی!

یہ طفلِ دو جواں
اس نور کے نورس موتی ہیں
اس آگ کی گچی کسبیاں ہیں
جس میٹھے نور اور زری آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں چھوٹا
صمیم بغاوت کا کشتی
اور صبح ہوئی من من، تن تن
ان جسموں کا چاندی سونا
ان جہروں کے نیلم مرجان
جگ ملک، رنخشاں رنخشاں
جو دیکھتا چلے بروہی
پاس آئے دیکھے تھی بھر کر
یہ زلیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کشتی

فیض احمد فیض

ایک دکنی غزل

کچھ پہلے ان آنکھوں آگے کیا کیا نہ نظر اگڑے تھا
کیا روشن ہو جاتی تھی گلی، جب یا رہا اگڑے تھا

تھے کتنے اچھے لوگ کہ جن کو اپنے غم سے فصحت تھی
سب پوچھیں تھے احوال جو کوئی درد کا مارا اگڑے تھا

اب کے تو خزاں ایسی ٹھہری، وہ سارے زمانے بھول گئے
جب موسمِ گل ہر پھیرے میں آ کے دوبار اگڑے تھا

تھی یاروں کی بہتات تو ہم اغیار سے بھی بیزار تھے
جب مل بیٹھے تو دشمن کا بھی ساتھ گوارا اگڑے تھا

اب تو ہاتھ سجھائی نہ دیوے لیکن اب سے پہلے تو
آنکھ اٹھتے ہی ایک نظر میں عالم سارا اگڑے تھا

فیض احمد فیض

امکاں صورت ما

زلیست سفر میں، لاکھ کدورت
لیکن تم ہی

روزِ ازل سے امکاں صورت
کھٹن مراحل کب رہتے ہیں

رستے سارے کٹ جاتے ہیں
سفر کی مشکل ہنس کر جھیلو

آبلہ پائی ایک حقیقت
سر کا سودا رہے سلامت

آئے نہ جنبش پائے جنوں میں
زندل میں ظریف احسن

رقص ہمارا جاری ہے
زنجیر کا نغمہ جاری ہے

ظریف احسن

خالی ہاتھ کا دکھ ایسے کیوں ترپاتا
صحرا تھا وہ شخص تو پیاس ہی دگ جاتا

ہجر کی دھوپ میں چوبِ خشک ہوئے ہم
راکھ نہ کرتا تو وہ پھر صدیوں سلگاتا

سود و زیاں کا روزِ حساب کیا جاتے
اپنوں میں کب کھلتا ہے ایسا کھاتا

جبر میں ساری بات انا پر آتی ہے
چاہت میں تو جو جی چاہے، منواتا

میرے ساتھ اُلجھ کر بات بڑھا بیٹھا
جو اُلجھن تھی دھیرے دھیرے سلجھاتا

محفل میں جس بات پر برہم ہو بیٹھا
دھیرے سے تنہائی میں وہ سمجھاتا

سب سے اچھی بات تمہاری ہے مولا
سب سے اچھا رنگ تمہارا ہے داتا

حمید وثاہین

شکست جہاد رنگارنگ عیول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، پھر جب اسے پکڑتا ہے تو چھوڑتا نہیں“

پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

ترجمہ۔ آپ کے پروردگار کی پکڑ کا یہی طریقہ ہے جب وہ یقینوں میں رہتے والے ظالموں کو پکڑتا ہے۔

فوائد و مسائل:-

ہجر م کو اگر اللہ کی طرف سے فوری سزا ملے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ چھوٹ گیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ایک خاص وقت تک مہلت دیتا ہے پھر اچانک پکڑ لیتا ہے۔

ہجر م کو مہلت دینے میں اللہ تعالیٰ کی صفات رحمت کا اظہار ہے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر ہدایت قبول کر لیں اور اس طرح وہ عذاب سے بچ کر انعام کے مستحق بن جائیں۔

سخاوت اور دیادلی

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ایک دفعہ نماز میں مشغول تھے کہ گلی میں ایک سائل کی آواز کانوں میں پڑی۔

جلدی نماز ختم کر کے باہر نکلے۔ صدا دینے والے سائل کی خستہ حالی دیکھی تو اپنے خادم قبر کو کواڑ دی۔ وہ باہر ہوا تو پوچھا۔

”ہمارے اخراجات میں سے کیا بچ گیا ہے؟“

قبر نے جواب دیا ”آپ نے دو سو درہم اہل بیت میں تقسیم کرنے کو دیے تھے۔ وہ ابھی تقسیم نہیں کئے گئے ہیں۔“

فرمایا ”ماری رقم لے آؤ۔ اہل بیت سے زیادہ مستحق اگیا ہے۔“

قبر نے دو سو درہم لاکر دیے تو سب کے سب اس سائل کو دے دیے اور ساتھ ہی معذرت کی کہ

”اس وقت میرا ہتھ خالی ہے۔ اس سے زیادہ خدمت نہیں کر سکتا۔“

آپ صدفات و خیرات کے علاوہ اہل علم کی سرپرستی بھی کرتے تھے اور ان کو انعام کے طور پر بڑی بڑی رقموں سے فائدہ دیتے تھے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی مجالس وقار اور شان کا مرقع ہوتی تھیں۔ لوگ ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ اور ان کے سامنے ایسے سکون اور خاموشی سے بیٹھتے تھے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔

وقار، شان، اور بلندئ مرتبت کے باوجود سیدنا حسین رضی اللہ عنہ تمکنت اور خود پسندی سے کوہوں دور تھے۔ بے علم الطبع اور منکر المزاج تھے۔ نہایت کم حیثیت کے لوگوں سے بھی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں کچھ فقراء کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے حضرت امام حسینؑ کو دیکھ کر اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔

آپ رضی اللہ عنہ سواری سے اتر پڑے اور فرمایا۔

”یہ شک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پست نہ کرے۔“

پھر ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ فارغ ہوئے تو ان سب کو دعوت پر بلایا۔ جب وہ لوگ حاضر ہوئے

تو آپ رضی اللہ عنہ نے کھروالوں کو حکم دیا جو کچھ ذخیرہ ہے، وہ سب بھجوا دو۔

لارکانہ

استاد قمر جلالوی نے لارکانہ نام کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے کہا۔

”پرانے زمانے میں ایک راجا تھا۔ جو محل میں بہت سی رانیں کی موجودگی کے باوجود اولاد خیز سے محروم تھا۔

دلی عہد کی خواہش میں فقیروں، عورتوں، سادھوؤں، منتوں کی خدمت میں ماضی دی۔ ٹونا، ٹوٹکا، جادو، منتر جس نے جو بتایا وہ کیا مگر کوہ سرد نہ ملا۔ آخر ایک دن راجا کو معلوم ہوا کہ اب جہاں موجودہ شہر لارکانہ ہے، اس ویرانے میں ایک سادھو رہتی

رہائے بیٹھا ہے جو اس کے پاس جاتا ہے، من کی مراد پاتا ہے۔ راجہ بھی پابادہ اس طرف روانہ ہوا۔

راجہ کی صورت دیکھتے ہی سنیاسی چلایا۔

”لرکا۔ لرکا۔ لرکا۔“

یعنی میرے پاس آنے سے تیری تقدیر کا کھانا نہیں بدل سکتا۔ تیری قسمت میں لرکا نہیں ہے۔ راجہ تو

ملاؤں و نامراد ہو کر واپس چلا گیا مگر اس دن سے وہ علاقہ ”لرکانہ“ ہو گیا۔

اسیہ جاوید۔ علی پور چیتہ

دھوکا دہی

دھوکا دہی کے وقت ہمارا تصور اتنا محدود و کمزور ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے فقط ایک شخص کو دھوکا دیا ہے جبکہ درحقیقت ہم ایک فرد، ایک دل، ایک ذہن، ایک ارادے، ایک خاندان، ایک نظام اور معاشرتی نظام کو دھوکا دیتے ہیں کیونکہ ایک انسان سے کم انکم اتنے روابط تو ہوتے ہیں۔

مسرت جبین۔ سعودی عرب

ڈر کے مارے

دو گلیب باز دیہاتی نوجوان مصروف گفتگو تھے۔

ایک بولا ”میرے آبا پرندوں کو ڈرانے والے پتلے بناتے ہیں بہت ماہر ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے ایسا پتلا بنا کر کھیتوں میں کھرا کیا کہ پورا ایک سال ایک پرندہ بھی ہمارے کھیتوں کے قریب سے نہیں گزرا۔“

دوسرا بولا ”یہ کوئی خاص بات نہیں ہے میرے آبا نے ایسا پتلا بنا کر کھیتوں میں لگایا کہ جو پرندے پتھلے سال ہمارے کھیتوں سے دائرہ چاک کئے تھے، وہ سارا ڈر کے مارے واپس کر گئے۔“

صائمہ عمران۔ لاہور

شیطان

شیطان نے فرعون کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ فرعون نے پوچھا۔

”کون ہے؟“

شیطان اندر آ گیا اور کہنے لگا۔

”لعنت ہے تمہاری خدائی پر۔ دعا تو تم خدائی کا کرتے ہو اور یہ تنگ ہیں جتنے کہ دروازے پر کون ہے؟“

نوشین اقبال۔ گاؤں بدرمرجان

حضرت علیؑ نے فرمایا

”میرا بیوی سواری ہے جو کبھی اپنے سوار کو گرنے نہیں دیتی۔“

”ہمیشہ سچے لوگوں سے دوستی رکھو کیونکہ وہ اچھے دلوں میں سرمایا اور بُرے دلوں میں محافظ ہوتے ہیں۔“

”نیت کتنی بھی اچھی ہو، دنیا آپ کو آپ کے دکھاوے سے جانتی ہے اور دکھاوے لکنا بھی اچھا ہو خدا آپ کو آپ کی نیت سے جانتا ہے۔“

عابدہ صابر۔ دہلی نالہ خور

بے قصور

ایک شرابی شراب پینے سے تنگ آ گیا اور خالی

تو بلیں توڑنے لگا۔
ایک توڑی: ”تیری وجہ سے میری نوکری چلی گئی۔“
دوسری توڑی: ”تیری وجہ سے میرا گھر تباہ ہو گیا۔“
تیسری توڑی: ”تیری وجہ سے میری بیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔“
چوتھی اکٹائی تو وہ بھری ہوئی تھی۔ اُسے دکھ کر بولا۔

”تو سائیڈ پہ ہو جا۔ تیرا کوئی قصود نہیں“
بلقیس افتخار۔ سیالکوٹ

غصہ پی جانا،

عبداللہ بن صیاد فی ذکر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں امام بخاریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اندر سے آپ کی کینیز آئی اور تیزی سے نکل گئی۔ پاؤں کی ٹھوکر سے راستہ میں بھی روشنائی کی شیشی آ لٹ گئی۔ امام صاحب نے ذرا غصے میں فرمایا۔

”کیسے چلتی ہے؟“
کینیز بولی: ”جب راستہ نہ ہو تو کیسے چلیں؟“
امام صاحب یہ جواب سن کر انتہائی محفل اور بردباری سے فرماتے ہیں۔

”جا میں نے مجھے آنا دیا“
صیاد فی کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ”اس نے آپ کو غصہ دلانے والی بات کہی تھی، آپ نے اسے آنا دے کر دیا“
فرمایا۔

”حدیث شریف میں آیا ہے: ”اے ابن آدم! جب تجھے غصہ آئے تو اسے پی جا۔ جب مجھے تجھ پر غصہ آئے گا تو میں پی جاؤں گا۔“
سعدیہ محمد حسین

رشک،

دود و ستوں پر رشک کرنا چاہیے۔ ایک دہ جو۔
دولت مند ہوا والد کے راستے پر مال خرچ کرتا ہوا

دوسرا وہ جو عالم ہوا اور علم کے ذریعے فیصلے کرتا ہو۔
دیا زورین۔ ڈھری

زندگی،

سقراط سے سوال کیا گیا۔
”موت سے بھی سخت تر کوئی چیز ہے؟“
اس نے جواب دیا: ”زندگی“ کیونکہ ہر قسم کے رنج اور مصیبتیں زندگی ہی میں سہی پڑتی ہیں جبکہ موت اس سے رہائی دلاتی ہے۔“
عبداللہ بن اقبال۔ گاول بدر مرغان

رب کائنات،

حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس وقت تک کھانا تناول نہ فرماتے جب تک کوئی مہمان دسترخوان پر موجود نہ ہوتا تھا۔

ایک دن کوئی بھی مہمان نہ آیا تو وہ مہمان کی تلاش میں بستی سے باہر گئے۔ وہاں ایک بوڑھا راہ گیر جا رہا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اسے لے آئے اور کھانے میں شریک کیا لیکن کھانا شروع کرتے وقت اُس نے اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دل میں ادا وہ کیا کہ ایسے ناشکرے کو آئندہ کبھی اپنے دسترخوان پر نہیں بلاؤں گا۔ اُسی لمحے غیب سے آواز آئی۔

”اے ابراہیمؑ! اس بوڑھے نے ایک دفعہ شکر ادا نہ کیا تو تم نے آئندہ کے لیے اسے نہ کھلانے کا عزم کر لیا۔ خدا میری فیاضی کا اندازہ لگاؤ کہ مجھ سے لے کر اب تک اس نے ایک مرتبہ بھی میرا نام نہ لیا لیکن آج تک میں نے اُس کا مدق بند نہیں کیا۔“
تحريم۔ گوجہ



حیات کی طاری

آمتہ ابالا کے ڈاڑی سے

کہتے ہیں پانچواں موسم دل کا موسم ہے اور اگر دل کا موسم اچھا ہے تو ہر چیز اچھی لگے گی اور ہر منظر میں خوبصورتی چھلکے گی۔ اور جب دل اُداس ہو تو ہر رنگ پھیکا، اُداس اور ادھورا لگے گا۔ میری ڈاڑی میں تحریر اس غزل میں لکھ کر ادا سب کو یاد کرے اور جس کا نام بھی اُداسی ہی ہے۔ آپ سب قارئین کی نذر۔

اُداسی،

چپ چاپ رہنا کچھ نہ کہنا یہ بھی ایک اُداسی ہے
ہنس کے سارے صدمے رہنا یہ بھی ایک اُداسی ہے

بیٹھے بیٹھے کھوسا جانا تو بستی دُور خیالوں میں
چلتے چلتے ہنستے رہنا یہ بھی ایک اُداسی ہے

دل کی باتیں سن کر ہنسنا تو سب کی عادت ہے
ان باتوں پر ہنستے رہنا یہ بھی ایک اُداسی ہے

مار کے کنکر لہریں گنا، بیٹھ کے چیل کنار
کچھ لوگوں کا ہے یہ کہنا یہ بھی ایک اُداسی ہے

سیدہ صائمہ نواز کے ڈاڑی سے

میری ڈاڑی میں تحریر بقیلِ خفائی کی یہ نظم مجھے بہت پسند ہے۔ امید ہے آپ کو بھی ضرور پسند آئے گی اور آپ کی ڈاڑی کی بھی ذہنت بنے گی۔

میری قسمت تو نہیں زلف تیری
جب سنوارو، یہ سنواری جائے

چیز ہوتی ہے اُسی کی جانال
نام سے جس کے پکاری جائے

سعد آتی ہے مجھے سانس تو لوں
جیسے اک پیڑ میں آری جائے

ماہرہ سیدہ لعل علی کے ڈاڑی سے

غم کی شدت ہو یا خوشی کی انتہا آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ آنسوؤں کی خاموش زبان ہر کیفیت کو عیاں کر دیتی ہے جسے ایک حساس دل بخوبی سمجھ لیتا ہے۔ عقلی جوان نے اس غزل میں آنسوؤں کی ہیبت بڑی ہی خوبصورتی سے بیان کی ہے۔

شب تاریک میں روشن ستارے میرے آنسو ہیں
تجلی تو جانِ جالِ تجھ کو بھی پیارے میرے آنسو ہیں

میرے چہرے کے ہنسر سے کوئی چشمہ نہیں پھوٹتا
میری غم ناک آنکھوں کے کنارے میرے آنسو ہیں

رکھیں تو آنکھ جل جائے، نہیں تو آگ لگ جائے
انہیں پانی نہیں بھرا، شرارے میرے آنسو ہیں

تجہاری آنکھ بھی غم ہے، میری بھی چشمہ غم دیدہ
تو قدر مشترک ہیں اک تمہارے اور میرے آنسو ہیں

سجودم جوتے ہیں جو کھڑوں کو بھول پتوں کو
وہ تبسم کے نہیں قطرے، وہ سارے میرے آنسو ہیں

پلٹ کر اُس نے دیکھا تو وہ واپس لوٹ کر آیا ہے
زبانِ خاموشی کے استعارے میرے آنسو ہیں

سن اے غلطیِ محبت بھی تو کا دو بار ہے جس میں
منافع تیری خوشیاں ہیں، خسارے میرے آنسو ہیں

صبا سلیم کے ڈاڑی سے

میری ڈاڑی میں تحریر احمد اسلام احمد کی یہ نظم دورِ حاضر کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ باذوق قارئین کی نذر قریہ قریہ پوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال کب لوٹے گا سرے سے ہمارے لوہے کا یہ جال

لوہے کا یہ جال کہ جس میں
ساتھ برس سے قید ہیں اپنے سارے خواب و خیال

بخبر ماہ و سال
بخبر ماہ و سال کہ جن کے

چہرے ہرے پھوڑ ہیں لیکن آنکھیں لالو لال
آنکھیں لالو لال کہ جن میں

ہوئے ہوئے تیرے ہیں پھیکے زرد ممال
قریہ قریہ پوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال

کب تک اس مٹی کے بیٹے ہوں گے یوں بے حال
کب تک ہم کو بننا ہوگا۔ نیلا مٹی کا مال

سیدہ لوباجاد کے ڈاڑی سے

میری ڈاڑی میں تحریر تابش کمال کی یہ خوبصورت نظم آپ سب بہنوں کے لیے۔

تاکید،

اُسے کہنا
اگر آئے، تو ساتھ اپنے
کوئی جگنو، کوئی تارا بھی لے آئے
کہ میرا دل
میرے گھر کی طرح
تاریک رہتا ہے

میری بی بی سے

سردہ چودھری
تنہائی کی شب کٹ جائے گی اتنے ہی ہم مجبور نہیں
دہرا کر اس کی باتوں کو کبھی ہنس لیں گے کبھی رو لیں گے
سائرہ محرابی احمد
پیار کی رہ میں ڈر لگتا ہے
بڑا مشکل یہ سفر لگتا ہے
یہ اداسی کا فصول ہے شاید
پھیکا پھیکا سا قمر لگتا ہے
نینقا نا
ہر سمت میں کئی بڑی پھولوں کی گردنیں
اب کے صبا ہی بارش میں شمشیر بن گئی
جن سمت وہ اٹھی ہے ادھر مرنے کی حیات
اس کی نظر ہی گردن تقدیر بن گئی
فوقیہ زباب چیمہ
پھر لوں ہوا کہ ساتھ تیرا چھوڑنا پڑا
ثبات ہوا کہ لازم و ملزوم کچھ نہیں
فائستہ اکبر
اس دل کے جدا ٹائوں میں اک موسم ہے برائوں کا
اک صبح بھری راتوں کا، اک جنگل وصل کے غولوں کا
ہم لوگ جنوں کے عالم میں منزل کی طلب بھی بھول گئے
اب دل کو مھلا سا لگتا ہے صحرائیں عکس سرواں کا
لہو عنایت
میں اب مردوں کے جیوں مجھ کو یہ خوشی ہے بہت
اُسے کھنٹ تو ملا مجھ کو بد دعا دے کر
س عطاریہ
کبھی اس طور سے ہنسنا کہ دنیا کو دلا دینا
کبھی اس رنگ میں رونا کہ خود پر مسکرا دینا

آجلا
انا کی آگ میں چاہت کے پھول جوتے گا
وہ اعتبار کی آنکھوں میں دھول جوتے گا
جواختلاف کی آتش کبھی بھڑک اٹھی
تو مجھ کو ڈر ہے وہ پہلے اصول جوتے گا
ذہیر کی
ذہیر اسماعیل
تمہاری آنکھ سے دل تک کا سفر کرنا ہے مجھ کو
یہ کتنی خوبصورت منزلوں کا راستہ ہو گا
اگر تم روکھ جاؤ تو ہماری جان نکل جائے
مگر یہ خود ہی سوچو تم میں اتنا حوصلہ ہو گا
انیسہ رحیم
موسم تھا بے قراء، تمہیں سوچتے رہے
کل رات بار بار تمہیں سوچتے رہے
بارش ہوئی اور گھر کے درپے سے لگے ہم
چپ چاپ سو گوار تمہیں سوچتے رہے
شازیہ رانا
کرب کے شہر میں رہ کر نہیں دیکھا تو نے
کیا گردن رہی ہم پر، نہیں دیکھا تو نے
اے مجھے صبر کے آداب سکھانے والے
جب وہ بچھڑا تھا وہ منظر نہیں دیکھا تو نے
نمرہ، افسر
لغز میں شامل فطرت ہیں ازل سے میر
تم فرشتوں کی نظر سے مجھے دیکھا نہ کرو
انعم عنبر
گھر چھوکنے میں صرف ہواش نہیں شریک
سناں کچھ اس میں گھر کے دیے کا بھر بھی ہے

کرن فاروق
اس نے کیا کچھ کہا تھا، یاد نہیں
اور دھن کی ترنہ نہیں کھولی!
اس کے بچے کی سرد بارش میں
دل نے اس کی تمتنا ہی دھولی
سائرہ منیر
تو جس میں آسودہ وفا تھا
وہی سنہرا عمل رہی ہوں
کستارہ بھی احترام سے کر
تری دعاؤں کا پھل رہی ہوں
اسلم عروج
پھولوں میں کھلتا ہے کون
خوشبو میں ہنستا ہے کون
صدائے لگانے کا فن سیکھ
اب چہرے پڑھتا ہے کون
نہرا اکرام
بے مدد و بے حساب سے نکلیں
زندگی کے عذاب سے نکلیں
جو بھی ہونا ہے امتحان ہو جائے
روز کے احتساب سے نکلیں
انیسہ لاج
بہلے جانے کی سرکش محبت دیکھتے جاؤ
تمہیں دینا سکھا دے گی سائت، دیکھتے جاؤ
بڑے اونچے سروں میں بات کرتے ہو عزت کی
محبت ہے خادوں کی تجارت، دیکھتے جاؤ
رقیہ انجم
ڈلا کر خود ہی آنسو پونچھا ہے
نجانے لاگ سچ ہے یا لگاؤ
ملا ہے آج مجھ سے والہانہ
لگا ہو گا کسی جانب سے لگاؤ
عالیہ عظیم
آئینہ ہے تمہارا عکس لیے
پڑھ گیا ہے جمال شیشے کا
تم غلط فہمیاں نہیں پالو
کس سے مفتا ہے بال شیشے کا

صدف
سچ ہے کہ تیرے بعد اداسی کا راج ہے
لیکن تیرے فراق میں مر تو نہیں گیا
منزل نہ مل سکی یہ مقدس بات ہے
صد شکر ہم سے فوق سفر تو نہیں گیا
نذیر افتخار
پھر سے سویا درد جگانے آ جاتے ہیں
جب بھی میرے یار پرانے آ جاتے ہیں
اب بھی دل کی بھیل میں تیری یاد کب
اُبلے اُبلے ہنس نہانے آ جاتے ہیں
عزیزہ
جو ساہبان تھا دھوپ میں لوگوں کے واسطے
وہ پیر اپنی چھاؤں میں جلتا ہے ان دنوں
سعدیہ عروج
وہ تغافل سے لگتا ہے نئے زخم مگر
دل کے زخموں کو وہ گہرا نہیں ہونے دیتا
میری آنکھوں میں سما دیتا ہے پٹنے لیکن
کوئی سنا بھی وہ سچا نہیں ہونے دیتا
عارف سلیم
بس ایک ہی خواہش تھی کہ ہم چاند کو چھو لیں
اس ایک ہی خواہش نے ہمیں مار دیا ہے
کس کس سے چھپائیں دل بیمار کی حالت
احوال کی پرسیش نے ہمیں مار دیا ہے
شہلا مظہر
بختا ہے روح کو جس نے زخموں کا پیر بن
محسن وہ شخص کتنا طبیعت شناس تھا
افشاں غلام
کتابوں سے دلیں دہل یا دل کو سانس نہ دوں
وہ مجھ سے بوجھ بیٹھے ہیں محبت کس کو کہتے ہیں
فوزیہ انیس
بے فائدہ ہے زیست میں احباب کا جوم
ہو پیکرِ خلوص تو کافی ہے اک شخص



صباحت ارشاد باجوہ... گوجرانوالہ

سب سے پہلے عید کی ماڈل بہت پیاری لگی۔ اس کے بعد کوئٹہ بھی اچھی لگی اور آپ سے فرمائش کرنی ہے کہ ٹرانسفل اور کالی کی ترکیب بتائیں اور اس کے بعد ناول اور ناولٹ میں کچھ بھی پسند نہیں آیا۔ ”عم میرے ہو“ کچھ خاص نہیں تھا۔ ایک عورت جو اتنا کچھ کرتی ہے اسے اتنی آسانی سے معاف کر دیا جاتا ہے۔ ”جیسے کچھ ہو انہیں“ شروع کیا تو پتا تھا ایڈ کیا ہونا ہے خواتین ہمارے دکھ سکھ کا سامھی ہے جب اس کو پڑھتے ہیں تو وقتی طور پر اپنی ہر پریشانی بھول جاتے ہیں اور میرے خیال میں یہ ایک نیکی ہے کہ ہم دوسرے انسان کی پریشانی شئیر کرتے ہیں اور یہ کہنا تو میں بھول ہی گئی کہ ”میرے خواب مجھے لوٹاؤ“ حکم سا گیا ہے پلیر اس کی رفتار تیز کریں اور میں نے ابرار الحق اور جیو کے مسعود رضا کا انٹرویو کا کا تھا۔

ج: پیاری صباحت! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو کوئی ناولٹ اور ناول پسند نہیں آیا، ہم پرچے کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ بشری اسعد اور فرحت اشتیاق تو بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں ابرار الحق کا انٹرویو شائع اور خواتین دونوں پرچوں میں شائع ہو چکا ہے شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔

بینا شاہ... ٹوپی صوابی

ٹائٹل ریڈینٹ سی ماڈل اچھی لگی۔ اب آتے ہیں

شمارے کی طرف۔ ”جھلٹانے لگی عید“ ساڑھ رضا کی اچھی تحریر تھی۔ ”جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو“ انتہائی زبردست جا رہا ہے۔ فرحت باجی سے ذرا اوجھے کہ کیا وہ رومن کھوم کے آئی ہیں۔ کیونکہ بغیر کھوے تو اس طرح کی منظر کشی ہو نہیں سکتی۔ ”سفال گر“ اس دفعہ بھی اچھا تھا۔ دیکھتے ہیں کہ آئندہ آخری قسط میں بشری جی کیا کرتی ہیں۔ ”میرے خواب لوٹاؤ“ میں یا سمین ماں کے روپ میں کیا کر رہی ہے، سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ وہ تو ماں کے نام کی توہین ہے۔ ٹایاب جیلانی کا مکمل ناول تو بہت ہی زبردست تھا۔ ج: پیاری بینا! آپ نے خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا بہت خوش ہوئی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچانی جاری ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے ہمہ دل سے شکریہ۔

نانکھ ندیم... اسکاٹ لینڈ (ای میل)

گزشتہ دس سال سے خواتین کی باقاعدہ قاری ہوں۔ نہایت شان دار ڈائجسٹ ہے۔ فرحت اشتیاق، رخسانہ نگار، نمبر احمد، شمہ بخاری، راحت جبین، نگلت عبد اللہ، رفعت سراج، عالیہ بخاری اور دیگر تمام مصنفین بہت عمدہ لکھ رہی ہیں۔ معاشرے کی اصلاح اور بچیوں کی تربیت کے حوالے سے یہ تمام خواتین مصنفین ایک مثبت کردار ادا کر رہی ہیں۔ میں بیاہ کر اسکاٹ لینڈ کو بے آگہی ہوں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ شائع اور خواتین کو بذریعہ ڈاک میں کس طرح منکوا سکتی ہوں۔ میں کیسے نئی آرڈر کروں

... پلیر ہماری مدد کریں۔ شکریہ۔

ج: پیاری نانکھ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ خواتین ڈائجسٹ لینڈ میں بذریعہ ڈاک بھجوا جا سکتا ہے۔ طریق کار معلوم کرنے کے لیے 021-32735021 پر فون کریں۔

اسماء اقبال عمران... لاہور

آج سے سات آٹھ سال پہلے جب میں خواتین ڈائجسٹ شائع اور کرن کی کمپنیاں پڑھتی تھی تو سوچتی تھی یا اللہ! یہ سب راسخز کتنا اچھا لکھتی ہیں ان پر ڈرامے یا فلمیں کیوں نہیں بنی ہیں اور آج یہ دن ہے کہ ہر چینل پر ہماری راسخز یعنی ادارے چاند نگر گروپ کی اجارہ داری ہے کیوں نہ ہو آخر نام ہی کافی ہے ان راسخز کی وجہ سے ہی ان کے ڈرامے کتنے ہٹ ہو رہے ہیں۔ ان سب راسخز سے موہانہ گزارش ہے کہ کامیابیوں کو خواب انجوائے کیجئے مگر کبھی اپنی پہلی سیڑھی کو مت بھولیں، پلیر بہت ڈیجسٹری مصروفیت میں اپنے ادارے کو مت بھولیں گے۔

ماہ اکتوبر کا سارا ڈائجسٹ اچھا تھا مگر جس طرح پہلے رسالہ ہوتا تھا اور کمپنیاں ایسی کہ پڑھنے لگو تو جب تک ختم نہیں ہوتی تھیں پھوٹنے کو دل نہیں کرتا تھا مگر اب یہ احساس ذرا کم ہو گیا ہے بہر حال بھی کوئی کمپنی بہت اچھی ہوتی ہے اور بھی عام سی۔ ناول بھی سب ٹھیک تھے۔ فارغہ جبین بہت عرصے بعد آئیں لیکن وہی پرانا موضوع، وہی تھکی بنی کمپنی۔

شازیہ عطا بس امریکہ کی اسٹوری، اسٹور، سڑکوں کے نام اور شاپنگ مال وغیرہ۔ پتا نہیں مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ ہر راسخز (خدا را!) الزام سب پر نہیں ہے۔ ہر ناول یا کمپنی میں اللہ کے تعلق کو زبردستی شامل کر دیتی ہیں۔ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔

وہ میرا ہے، کیا یہ ناول واقعی، نمبر احمد، نے لکھا ہے؟ (حیرت انگیز) نہایت فلمی اور اچھوڑ کر تحریر تھی۔ مصباح خادم کی کاملیت پسند کافی حقیقت لیے ہوئے تحریر تھی، ہم صنف نازک بھی کیا چیز ہوتی ہیں اور پھر کیا ہو جاتی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں ایک ایک لفظ کو سوچنا پھر لکھنا اور پھر

چھپانا، سب کام اپنی اپنی جگہ نہایت اہم ہیں اور ہم آپ کے شکر گزار ہیں اور تعریف کے ساتھ مثبت تنقید بھی ہوتی چاہیے تاکہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے آسکیں۔ ج: پیاری اسماء! ہم تنقید کا ہرگز برا نہیں مانتے۔ آپ خط شامل اشاعت ہے۔ یہ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی خوش نصیبی ہے کہ چینل کی مصروفیات کے باوجود ہماری مصنفین ہمارے پرچوں کے لیے وقت نکال لیتی ہیں۔

لیکن شازیہ عطا کے ناول میں آپ زیادتی کر گئیں انہوں نے امریکہ کی اسٹوری، اسٹور سڑکوں اور شاپنگ مال وغیرہ کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن ان کے ناول میں کمپنی بھی تھی اور وہ ہمارے پاکستانی مسلمان لکھروں کی کمپنی تھی۔ جو سوال انہوں نے اٹھائے ان کا تعلق بھی ہمارے معاشرے سے تھا۔

آپ کی تنقید اور تبصرہ متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

ثمین شفیق اعوان... شاہدرہ کلاہور

ٹائٹل موقع کی مناسبت سے اچھا تھا۔ رفعت ناہیدہ سجاد صاحبہ کے ”چراغ آخر شب“ سے شروعات کی کہ ”کرن کرنا روشنی“ اور باقی تمام سلسلے ایسے ہیں جن میں سے بہت کچھ مجھے اپنے پاس محفوظ کرنا ہوتا ہے، لہذا پہلے پڑھنے کا کام کرتی ہوں۔ تو جناب جیسے ہی کمپنی کا آغاز کیا، ایسا گا رفعت ناہیدہ اس بار یکسوئی سے لکھ نہیں پائیں وجہ۔ اس ماہ آپ کے ناول کے حالات، واقعات اور کرداروں میں ربط خاتمہ سابقہ کیفیت سے تعلق۔

ہماری مصنفین کا ذکر ہو اور فرحت اشتیاق صاحبہ نہ ہوں! بیا تو وہی نہیں سکتا۔ اپنے اس ناول میں بھی اس قدر ماہرانہ انداز سے قاری کو حالات و واقعات سے متعارف کروا رہی ہیں کہ بندہ ارد گرد کو بھول کر لیزا کے ساتھ رومانی سیر کو نکل جانے پر خود کو مجبور مانتا ہے۔

بہترین کی دو ٹوئیں ہماری بشری جی بھلا سی سے کم ہیں کیا؟ سفال گر ”میں ایسا جادوئی اثر تھا کہ بیان سے باہر ہے، یوں لگا جیسے عمر نے صوفیہ کے ساتھ میرے بھی دل و دماغ پر چھی جادو کر دیا۔ لا جواب! آپ کے دماغ اور قلم میں جانے کیسا اثر ہے کہ پڑھنے والا ایمان کی اصل روح کو پالیتا ہے۔

افسانوں میں ساتھ رضا کا جھلانا لگی عید“ زبردست تھا پھر ”جینس تو ایسے“ راشدرہ رفعت کو پڑھائیے ایک بلیکی پھلکی حشر تھی۔

قراۃ العین نے بھی اچھی کوشش کی۔ ”زندگی کے رنگ“ سعید جی کے سنگ پڑھ کر دل آپ کو داد دینے کو چل چل گیا۔ مکمل ناول میں نایاب جیلانی صاحبہ نے ”تم میرے ہو“ کے لفظی جال میں الجھائے رکھا اور عجیب سی مینشن بھی دماغ کو تنگ کرتی رہی مگر معذرت کے ساتھ کہ

آخر میں آپ کی گرفت وصلی پڑتی دکھائی دی۔ سب سے آخر میں آسیہ رزانی صاحبہ کا ناول ”جیسے کچھ ہوا ہی نہیں“ میں آپ نے کمال کر دیا جتنا بگنی خوب صورتی اور ماہر انداز میں آپ نے زمانے کی فٹاکی اور دلی کدوؤں کو پیش کیا اور یہ بھی کہ کس طرح سے ہم اپنے فیصلوں پر قسمت کا فہم لگا کر خود پری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

ج: پیاری شیریں! آپ نے بڑی خوب صورتی سے خواتین ڈائجسٹ کی تحریروں کا تجزیہ کیا۔ آپ کی تعریف و تقدیر متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

مہر شمسو۔ گوجرانوالہ (ای میل)

ناٹھل بے حد عمدہ تھا۔ ناول ناولت بہت اچھے چارے ہیں۔ نگت عبداللہ کے ناول کا اشارت ہے ”اس لیے ابھی کروادوں کا تعارف ہی چل رہا ہے۔ فرحت اشتیاق کا ناول بہت زبردست اور معلوماتی ہے۔ نایاب کا ناول بھی اچھا تھا۔ ”سفال گر“ کی تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں ہوتے، حکیم بیگم کا کردار بہت بہتر ہے۔ آسیہ رزانی کی ”داوی اماں“ بہت سوئٹ تھیں، حلیمہ بہت ترس آیا۔

افسانوں میں ساتھ رضا کا افسانہ بہت اچھا تھا۔ راشدرہ رفعت نے اپنے افسانے میں بہت عام گرامر مسئلہ اٹھایا ہے۔ قراۃ العین کا افسانہ بھی بہت اچھا تھا۔ سعید جی کا افسانہ بھی اچھا تھا مگر صرف اتنا بتا دیں کہ اتنی سگھڑ لڑکیاں کہاں ہوتی ہیں۔ تمام سلسلے اچھے تھے۔ عدنان بھائی کے لیے دل سے دعا کرتی ہے۔

پلیز رفعت سراج کو ڈھونڈ لائیے۔ ساجدہ حبیب سے گزارش ہے کہ وہ ”وردی“ وعدہ اور وفا نہیں“ جیسی کہانی

لے کر پھر تشریف لائیں اور انیسو۔ سلیم کہاں ہیں؟ ہم آج کل کے حالات پر اپنی سیانی کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ ج: مہر شمسو! ای میل کرنے کا شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

پارس بلوچ۔ ڈھرکی

بھلے ہی میرے الفاظ سادہ اور بے قیمت ہوں لیکن ان لفظوں میں گندھی ہوئی جو محبت ہے وہ سادہ اور بے قیمت نہیں ہے اور ہمیں خواتین ڈائجسٹ سے محبت ہی تو ہے لیکن اگر محبت کا جواب محبت سے نہ دیا جائے تو دل ٹوٹ جاتا ہے!

عید فہر کا ناٹھل شاندار تھا۔ قدرے عجبت اور بے چینی کے ساتھ صفحات اٹھتے ہوئے جوں ہی فہرست میں پہنچے تو اپنی تین تین فیورٹ رائٹرز کو بیک وقت ایک ساتھ دیکھ ہم بے ہوش ہوتے ہوئے پہلے ذکر کروں گی ”سفال گر“ کی مارے اور اب سب سے پہلے ذکر کروں گی ”سفال گر“ کی ساتھ کا! بشری سعید! آپ واقعی مجھے کوئی ساتھ ہی معلوم ہوتی ہیں کوئی متر ہے جو کہ ہم پڑھ کر بھونک دیا گیا ہے کہ پہلی قسط سے لے کر اب تک ہم کسی فیورٹ کے حصار میں قید ہیں۔ ایسی نایاب بے مثال ولا زوال تحریروں بہت کم کم پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اس کے بعد ہم بہت سے قارئین کے دلوں پر راج کرنے والی بہت ہی پیاری کسی یادگار اور خوب صورت ناولوں کی تخلیق کا فرحت اشتیاق کے مکمل ناول ”جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو“ پر پہنچے گمانی نہایت دلکشی و خوب صورتی سے آگے کی جانب رواں دواں ہے۔ ہماری دلچسپی اپنے پورے عرصہ پر ہے۔

دوسرا مکمل ناول ہماری موسٹ فیورٹ رائٹرز نایاب جیلانی کا ”تم میرے ہو“ ہر طرح سے ایک دلچسپ اور منفرد تحریر تھی۔ موضوع بھی خاصا مختلف تھا۔ کیونکہ آری پر تو ہم نے بہت سی تحریروں پڑھی ہیں لیکن ایف فورس کے متعلق یہ پہلی تحریر تھی جو ہم نے پڑھی۔ ناول میں آسیہ رزانی صاحبہ کا ناول ”جیسے کچھ ہوا ہی نہیں“ بہت پسند آیا۔ جلد یا بدیر میر کا پھل ضرور ملتا ہے جس طرح کہ حلیمہ کو اس کی خاموشی و مہر کا پھل ملا (صارم کی صورت میں)

افسانوں میں قراۃ العین چنا کا افسانہ ”اپنے جیسے کا“ ان کی ایک اچھی اور بہترین کاوش تھی۔ نگت عبداللہ کا ”میرے خواب لوٹا دو“ نہایت روانی اور خوب صورت طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے۔

ج: پارس ہمیں بے حد افسوس ہے کہ پچھلے چار ماہ سے آپ مسلسل خط لکھ رہی ہیں اور آپ کا ایک بھی خط شامل نہ ہو سکا۔ اچھی بسن! آپ کے لفظ سادہ سہی لیکن بے قیمت ہرگز نہیں اور آپ کی محبت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں خطوط خواہ کتنی ہی تعداد میں موصول ہوں۔ کسی ایک بھی خط کی قدر و قیمت ہرگز کم نہیں ہو سکتی۔ ہمارے دل میں اپنی تمام قارئین کی بے حد قدر و احترام ہے۔ آپ کا دل دکھنا اس کے لیے معذرت۔ تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ ایک بات نوٹ کر لیں خط کا شائع ہونا اہم نہیں ہے، اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ کی رائے ہم تک پہنچ گئی اور اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ ہم تمام خطوط پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔

اسماء سعید۔ راولپنڈی (ای میل)

میں پانچویں جماعت میں تھی، جب سے خواتین ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا تو اب ایم اے کیسے ہوئے بھی مجھے دس سال ہو گئے ہیں اور سرکاری نوکری کر رہی ہوں مگر اتنے عرصہ میں شاید ہی کوئی ڈائجسٹ مس کیا ہو۔ اس ماہ کے پرچے کی میں جتنی تعریف کروں کم ہے۔ یوں تو ہر ماہ ہی رسالہ بہت اچھا ہوتا ہے مگر اس ماہ کے رسالے نے تو مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ تمام کہانیاں بہت سبق آموز تھیں۔ لیکن ”جھلانا لگی عید“ نے تو میری آنکھیں ہی جھلانا دیں۔ ”جینس تو ایسے“ آج کل کے زمانے کی جتنی تصویر ہے۔ رشتے کے لیے اتنا اعلیٰ معیار بنا کر اپنی خامیوں کو بھلا دیتے ہیں۔

”اپنے جیسے کا“ نے بہت متاثر کیا۔ سسرال والوں کے معاملے میں لڑکیاں پتا نہیں کیوں دل چھوٹا کر لیتی ہیں ”رنگ زندگی“ کے غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ کوئی انسان مکمل نہیں ہوتا۔ غرض کہ ماہ نومبر کا خواتین پڑھ کر شادی شدہ و غیر شادی شدہ لڑکی اپنی زندگی سنوار سکتی ہے۔ ان شارٹ نویمبر کے خواتین کو ”بیہست رسالہ آف دی ایئر“ قرار دینا چاہیے۔

ج: پیاری اسماء! آپ کی محبت نے ہماری پیمائشیں غم کر دیں۔ قارئین کی خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ اتنی طویل رفاقت اس بات کا ثبوت ہے کہ خواتین ڈائجسٹ اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہے، ہر ماہ ہماری پیمائش کو شش ہوتی ہے کہ پرچے کا معیار برقرار رکھیں بلکہ اسے خوب سے خوب تر بنا کر پیش کریں آپ کی حوصلہ افزائی ہمارے ارادوں کو مزید مستحکم کر دیتی ہے۔

حوصلہ افزائی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے اتنے عرصے بعد آپ نے خط لکھا، بہت اچھا لگا! اب باقاعدگی سے شرکت کرنی آپ سے چاہیے گا۔

فاترہ محمود۔ بہاول پور

مجھے ”خواتین“ اور ”شعاع“ بے حد پسند ہیں۔ اتنے پسند ہیں کہ گھر والوں کی مخالفت کے باوجود مشکل پڑھائی سے جان بچا کر خریدتی ہوں۔ میں ایف ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ مگر جب 7th کلاس میں تھی۔ تب سے یہ پڑھ رہی ہوں مگر باقاعدگی سے 9th کلاس سے پڑھنا شروع کیا ہے۔ مجھے خواتین ڈائجسٹ کے تمام سلسلے بے حد پسند ہیں۔

ج: پیاری فاترہ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ، لیکن آپ نے نویمبر کے شمارے کی کسی تحریر کا ذکر ہی کیا۔ آئندہ ہمیں خط لکھیں تو تحریروں کے بارے میں بھی اپنی رائے ضرور لکھیں۔

آمنہ اجالہ۔ ڈھرکی

نویمبر کا شمارہ اس بار قدرے تاخیر سے بارہ نومبر کو ملا۔ بند پکوں تلے کسی حسین منظر میں کھوئی ہوئی ماڈل بہت پسند آئی۔

کہانیوں میں سب سے پہلے بشری سعید کے ناول ”سفال گر“ کے دروازے پر دستک دی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا پرناں احمد عرف ایڈم گرانٹ کو معاف کر پائے گی؟ مکمل ناول میں نایاب کا مکمل ناول ”تم میرے ہو“ بے حد عمدہ اور دلکش تھا۔ رمشا اکرام کا انتقام اور بدلے آگ میں اس حد تک آگے نکل جانا، ہمیں سخت اچھے میں ڈال گیا لیکن شکریہ کہ اسے اینڈ میں ختم آگئی۔

اس کے بعد ”جراغِ آخر شب“ پڑھا۔ غیم ملک جیسے ملک دشمن عناصر کے اتنے لمبے ہاتھ ہیں کہ پکڑ میں ہی نہیں آتے کہیں۔ ایسے ہی آستین کے سائیں میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگوں کے لیے کسی شاعر نے کیا خوب شعر کہا ہے کہ۔

گھر پھونکنے میں صرف ہوائیں نہیں شریک شامل اس میں کچھ گھر کے دیے کا ہنر بھی ہے فرحت آپ نے بہت انتظار کروایا ”جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو“ کی دوسری قسط پڑھنے کے لیے ماضی اور حال کو ایک ساتھ لے کر کہانی نہایت عمدہ طریقے سے آگے بڑھ رہی ہیں۔

”میرے خواب لوٹاؤ“ بہت اچھا جا رہا ہے، بس نگہت عبد اللہ سے اتنا کہنا ہے کہ کہانی میں تھوڑی سی تیزی لائیں اور تاجور و شمشیر علی کے کرداروں کو بھی واضح کر کے دکھائیں۔

”جیسے کچھ ہی نہیں“ آسیہ رزاقی اپنی پرانی جون میں نظر آئیں۔ اپنوں کی ستم روی کا شکار حلیہ آزمائش کی بجٹی میں جل کر بالآخر کنڈن بن ہی گئی۔ اب آتے ہیں افسانوں کی طرف افسانے سب ہی اچھے تھے ”اپنے حصے کا“ قرۃ العین چناسب ربازی لے گئیں۔

عید قربان کے حوالے سے سلسلہ ”عید قربان کی لذتیں“ بھی بہت پسند آیا۔ ج: آمنہ جی! تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ پرچا آپ تک لیٹ پڑ گیا، اس کے باوجود آپ نے اتنی جلد پڑھ کر مھر پور تبصرہ کیا، یہ قابل ستائش ہے۔

اقصی۔ احمد مگر چٹھہ

مجھے جس تحریر نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ہے فرحت اشتیاق کا ناول ”جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو“ بہت ہی زبردست ناول ہے اور دوسرا نگہت عبد اللہ کا ناول ”میرے خواب لوٹاؤ“ یہ بھی بہت زبردست ہے۔ ہم چاروں ہمیں بڑے ہی شوق سے خواتین اور شعاع پڑھتی ہیں اور ہم نے ان رسالوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

ہمارے گھر میں بی بی وی نہیں ہے، موبائل بھی نہیں، ہو سکتا ہے کہ آپ کو یقین نہ آئے لیکن یہ سچ ہے۔ ہماری زندگی یہی رسالے اور ریڈیو سے ہے۔ ہمیں سارے

رسالے خواتین، کرن اور شعاع ٹائم پر ہی مل جاتے ہیں۔ آپ سے ایک ریکویسٹ کرنی ہے کہ آپ FM-97 کے ڈی، جے آصف بشیر کا انٹرویو بمعہ تصویر شائع کریں۔ ج: پیاری اقصیٰ فرحت اشتیاق اور نگہت عبد اللہ تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچ گئی ہے۔ مگر بی بی کی گئی کا شکوہ رہنے دیجئے بی بی کی تمام چینلز پر خواتین ڈائجسٹ کے ذرائع ہی دکھائے جا رہے ہیں۔ آپ خواتین ڈائجسٹ پڑھ لیں بی بی وی ذرائع دیکھ لیں، ایک ہی بات ہے۔ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے، جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

فرخ فاطمہ۔ حویلی لکھا اوکاڑہ

ٹائٹل پر معصوم البری و شہرہ سفید لباس میں چاند کی شہزادی لگ رہی تھی لیکن بیک گراؤنڈ میں بلیک طر اچھا نہیں لگا۔ سب سے پہلے ”سفال گر“ سے ملاقات کی۔ اس ناول کی تعریف کے لیے تو الفاظ ہی نہیں ہیں۔ بشری سعید نے اب کی قسط میں ان لوگوں کے صوفیہ کو بد صورت کہنے کی وضاحت پیش کی۔ بشری! یقین مانتے، اگر آپ ایسا نہ بھی کرتیں تب بھی ان کرداروں کے غیر فطری رویے کے حوالے سے کوئی غیر حقیقی پن نہ ابھرتا۔ کیونکہ مصنفہ نے ناول کا شروع سے ہی ایسا ایجنڈا بنایا ہے کہ لفظ لفظ خود اپنے آپ سے بھی بڑھ کر قابل اعتبار لگتا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ اگر یہ بھی بیان کریں گی کہ سورج مغرب سے طلوع ہوتا ہے تو میں وہ بھی مان لوں گی۔

آسیہ رزاقی صاحبہ کے ناول کا نام تھوڑا عجیب لگا۔ لیکن آسیہ رزاقی اور بور کریں، نام ممکن۔ ناول دل کو چھو گیا۔ حلیہ کے صبر کا صلہ اس کو مل گیا۔ نگہت عبد اللہ کی یہ قسط فٹاننگ تھی۔ اربہ کا کردار بہت اسٹرونک ہے۔ ”جو بچے ہیں سنگ“ میں گھر بیٹھے بیٹھے رومانی میر کر کے سواد آگیا۔ سکندر کے رویے نے اس مکمل ناول میں جان ڈالی ہے۔ اب آگے واضح ہو گا کہ اس کے خورے نفرت کرنے

کی وجہ کیا ہے۔ نایاب جیلانی جی کی کہانی بھی اچھی تھی۔ آخر میں عبد نے رمشاء سے ناراضی جلد ہی ختم کر دی بلکہ ختم کیا کر دی، میرے خیال میں یہی کہانی کا ایک پوائنٹ تھا۔ راشدہ رفعت کا افسانہ اچھا تھا۔ قرۃ العین چنا کا افسانہ ہمارے معاشرے کی ایک عمومی خرابی کی نشاندہی کرتا

ہے۔ قرۃ العین نے کافی اچھے موضوع پر قلم اٹھا کر دل جیت لیا۔

سانہ رضا کا افسانہ پہلے تو ٹھیک ہی لگ رہا تھا لیکن مصنفہ کے اس جملے نے ”آپ میرا اصلی نام لیجئے گا، میرا نام عمر فاروق ہے۔“ اس کو ”ٹھیک“ سے ”چھا“ بنادیا۔ شاعر عسکری کا انٹرویو خاص نہیں لگا۔ وہی پرانے سوالات اور پرانے جوابات ”عید قربان کی لذتیں“ میں قاری بہنوں سے مل کر مڑا آیا۔ ”میری خاموشی کو“ سلسلے کے سوالات دوبارہ دے دیں۔

خواتین ڈائجسٹ میں ایک محاورہ اکثر کہانیوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض جگہ یہ ”مرغ کی ایک ٹانگ ہونا“ ہوتا ہے اور کہیں یہ ”مرغ کی ایک ٹانگ ہونا“ ہوتا ہے۔ درست محاورہ کیا ہے؟ مہربانی کر کے ضرور بتائیے گا۔ کیا نیلہ عزیز شادی شدہ ہیں؟ پلیر جواب ضرور دیجئے گا۔ وہ میری فیورٹ رائٹرز ہیں۔

کافی ماہ ہو گئے ہیں نیلہ ابرار راجہ نے بھی نہیں لکھا۔ نیلہ جی! جلدی سے ایک مکمل ناول لکھ ماریں۔ دعائیں دیں گے۔ فائزہ افتخاری تو خواتین ڈائجسٹ میں آمد کی امید ہی فصول ہے۔ جب بھی دل اداں ہو تو پرانے رسالے نکال کر میں فائزہ کا ناول ”کاکلی“ بھی اور ”منار“ یار ”تقریباً کچھ تو بہر ملاقات“ پڑھتی ہوں اور اسی اڑ چھو ہو جاتی ہے۔

ج: فرخ افانزہ کی تحریریں تو ہمیں بھی بے حد پسند ہیں۔ فی وی کی مصروفیات کے باوجود طویل عرصہ بعد انہوں نے شعاع کے لیے ناول لکھا، جسے قارئین نے بے حد پسند کیا۔ اس ماہ کے شعاع میں اس ناول کی آخری قسط شامل ہے۔ فائزہ کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔ وہ بے تکلفی اور بے ساختگی سے ہلکے پھلکے جملوں میں بڑی بات کہہ جاتی ہیں۔

ج: صحیح محاورہ مرغ کی ایک ہی ٹانگ ہے۔ نیلہ عزیز نہ صرف شادی شدہ ہیں بلکہ ایک گڑیا بی بی کی والدہ محترمہ بھی ہیں۔

کرن تینو۔ میرپور خاص

میں مارچ سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں اور پھر مجھے جسے اس کی لت لگ گئی ہے ”انی ڈانٹیں“ میں کہ مت

پڑھو مگر آپ اس ڈائجسٹ کو پھوٹا مشکل ہے۔ سب تحریریں بہت اچھی ہیں جتنی تعریف کروں کم ہے۔ مجھے سب بہت پسند ہیں۔ بشری سعدی کی تحریر ”سفال گر“ بھی بہت اچھی جاری ہے۔ پڑھنے کی شروعات ہی میں ”سفال گر“ سے کرتی ہوں بے صبری سے۔ ہمارے شہر میں سیلاب آیا ہوا ہے اس وجہ سے ستمبر کا شمار میں خرید نہیں پائی۔

ج: پیاری کرن! خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید، آپ نے خط لکھا، بہت اچھا لگا۔ آپ اپنی امی کو خواتین ڈائجسٹ کی کہانیاں پڑھ کر سنائیں، پھر وہ آپ کو نہیں ڈانٹیں گی بلکہ انہیں آپ سے زیادہ خواتین ڈائجسٹ کا انتظار رہے گا۔ ستمبر کا شمار بیچو ایجا جا رہا ہے۔

نیلیم مقبول۔ اسلام گڑھ میرپور شاعر عسکری کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا اور علیم ڈار کے بارے میں پڑھ کر بہت فخر محسوس ہوا۔

آپ نے ابھی تک کسی نیوز کاسٹر کا انٹرویو شائع نہیں کیا۔ اس بارے میں خاص طور پر کہنا چاہوں گی کہ پلیر عانتہ بخش اور خالد میر اور شاہ زیب خانزادہ کا انٹرویو شامل کریں۔ نگہت عبداللہ کا ناول ”میرے خواب مجھے لوٹا دو“ بہت اچھا چل رہا ہے۔ نایاب جیلانی کے مکمل ناول میں عبد جرار اور عناس جرار کا کرکٹر بہت پسند آیا۔ افسانہ جو خاص طور پر پسند آیا وہ سانہ رضا کا ”عید کی شام“ تھا۔

آخر میں عمیرہ احمد، شہر بخاری اور نمرہ احمد سے کہوں گی کہ پلیر ہمارے لیے وقت نکال کر کچھ لکھیں۔

ج: پیاری نیلیم! خواتین کی محفل میں خوش آمدید نیوز کاسٹر کے انٹرویو ہم شائع کرتے رہتے ہیں، خالد میر کا انٹرویو بھی شائع ہو چکا ہے۔ عانتہ بخش اور شاہ زیب کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

ویا زورین۔ ڈگری کلچر ہری

ایچا جی! میں ایک کرسچن لڑکی ہوں۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ اچھی بات جس کے بھی منہ سے سنو اسے لکھ لو، تو

ہمارے گھر میں آپ کے رسالے پڑھنے پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ یہ رسالے ہر طرح سے معیاری اور بہترین

ہیں۔ آپ سے ایک چھوٹی سی درخواست ہے کہ میں اس رسالے کے ذریعے اپنی کسٹمز اور دوستوں کو کرسچن کی مبارک باد دینا چاہتی ہوں۔ میری طرف سے کسٹمز رشتے داروں اور دوستوں اور تمام کرسچن کیونٹی کو میری کرسچن عید مبارک باد ہو۔

خواتین کا شمار اس بار 10 تاریخ کو ملا۔ دیدہ زیب کڑھائی کے وائٹ سوٹ میں ملبوس نظرس جھکا کر دیکھتے انداز میں مسکراتی ہوئی ماڈل بے حد دلکش تھیں۔ پہلے تو اپنا موٹو فیورٹ ناول ”سفال گر“ پڑھا۔ اختتام کو رواں دواں یہ تحریر بشری صاحبہ کی یقیناً ”یاد رہ جانے والی تحریر ہے جو کہ شاید ہی ہمارے ذہنوں سے جو ہو جائے۔

اس کے بعد ”چراغ آخر شب“ کی طرف بڑھے۔ رفعت ناہید صاحبہ کی تعریف کرنا تو گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ وہ کہانی کو نہایت خوش اسلوبی سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ ”میرے خواب لوٹا دو“ نگہت آئی کا شہکار ناول رفتہ رفتہ ہمیں اپنے رقت میں لے رہا ہے لیکن پلیر اس کی صفحات کو کچھ پڑھا اس تو کہانی میں کچھ تیزی آجائے۔ ”جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو“ فرحت اشتیاق نے تو ہمارا دل ہی جیت لیا ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے گماں ہوتا ہے کہ ہم بھی وہیں کہیں ان کرداروں کے بیچ سانس لے رہے ہیں۔ نایاب آئی کا مکمل ناول بہت پسند آیا۔ ”جیسے کچھ ہو نہیں“ آسیہ رزائی صاحبہ نے بھی خوب لکھا۔ بالا آخر حمید نے اپنے مہربان اور حوصلے سے وہ سب کچھ پایا جو اس کی خواہش تھی۔

افسانوں میں ”جس تو ایسے“ راشدہ رفعت اپنے حصے کا قرۃ العین دونوں بے حد پسند آئے ”رنگ زندگی“ کے سجدہ نے بھی بہت اچھا لکھا۔

ج: پیاری دیا! ہماری جانب سے بھی کرسچن کی مبارک قبول کیجئے۔ آپ کی بہن اور دوستوں تک بھی آپ کی مبارک باد ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ آپ کا تفصیلی ممبر بہت اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی آراء سے آگاہ کرنی رہیں گی۔

نیلیم تارا احمد۔ ڈی جی خان

ناٹھل پر دلکش انداز سے مسکراتی ہوئی ماڈل پسند

آئی۔ سب سے پہلے ”سفال گر“ جس کی تعریف کے لیے شاید میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بشری جی اتنا کہانی کی حد میں لکھ گئے ناول سے لگتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کا لمبا عرصہ امریکہ میں گزارا ہے یا پھر آپ کی نانچ بہت وسیع ہے۔ خوب صورت لفظوں کی یہ تحریر ”انداز بیاں بہت زبردست ہے۔

نمرہ جی! آپ کہاں غائب ہو گئیں۔ آپ کا مکمل ناول ”مصطفیٰ“ جو ابھی تک ہم نہیں بھولے ہیں، پُر اثر تھا۔ ہمارے معاشرے میں نہ صرف دینی تعلیم کا فقدان ہے بلکہ معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

رفعت ناہید کا ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ غفت سحر پاشا! آپ کہاں غائب ہو جاتی ہیں اور وہ بھی لمبے عرصے کے لیے۔ پلیر از میرٹ کے اٹھارے مزاج اور رویہ کل کی بے وقوفیوں کے ساتھ تشریف آوری فرمائیں۔

ج: نیلیم تارا! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچانی جاری ہے۔

فاطمہ چوہدری۔ جھنگ صدر

مجھے ڈائجسٹ میں کچھ کسی کی تو خیال آیا کہ بجائے خود سے لکھنے کے آپ سے بات کرنی چاہیے۔ آئی! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے ناول ”ناول کی تعداد کو کم کر کے افسانوں کی بھرا کر دی ہے اور جو قسط وار ناول ہیں ان کے صفحات اتنے کم ہو گئے ہیں کہ ابھی صحیح طرح سے کسی ایک بات کی وضاحت بھی نہیں ہو پاتی اور باقی آئندہ لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ ڈائجسٹ اب بہت خالی خالی سا لگنے لگا ہے۔ اس دفعہ خواتین ڈائجسٹ میں نمرہ احمد کا نام پڑھ کر جتنی خوشی ہوئی، گمانی پڑھ کر اتنی ہی یوریت محسوس ہوئی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ نمرہ احمد کی لکھی ہوئی کہانی ہے۔ نایاب جیلانی کی کہانیاں حقیقت سے بہت دور لگتی ہیں میں مانتی ہوں کہ ہماری نئی راسخز ترقی کی طرف گامزن ہیں مگر ہماری رخسانہ نگار عدنان، عنینہ سید، راحت جنیں، آسیہ رزاقی، نگہت عبداللہ جیسے زرخیز ذہن، حقیقت سے قریب ترین مواد اور بہترین پلاٹ کی ان کے پاس ابھی کی ہے۔ باقی میں اتنا ضرور کہوں گی کہ آج کے دور میں اگر دیکھا جائے تو جتنی فاشی ہمارے ملک میں کیل کی صورت میں، رومانس اور عریانیت سے بھرے رسالوں کی صورت

روشن حرف وہ سگانے

روشن ہاشم

اسکول کی ایک ٹیچر یاد ہیں۔ انہوں نے مجھے آٹو گراف دیا تھا۔ ان کے لکھے ہوئے وہ روشن حرف میرے ساتھ ساری عمر روشنی بن کر چلے۔

بیٹیاں بھول ہیں۔ ایک شاخ سے لٹی ہیں مگر سو سکتی ہیں نہ کبھی ٹوٹی ہیں۔

ایک بی بی شاخ یہ کچھ اور نئے بھول کھلا دیتی ہیں۔
4 گانگی میں تصور خاتم کا اپنا انداز تھا۔ کبھی کبھی مسکان چرے پہ جا کر جب وہ غزل گاتیں تو سنسنے والا اس میں محو ہو جاتا۔ ان کا ایک بہت خاص انداز تھا۔ انہوں نے ناصر کاظمی کی غزل گائی تھی جو بار بار میں نے سنی ہے اور آج تک یاد ہے۔

دل میں اک لہری اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ، ہوا چلی ہے ابھی
شور برپا ہے خانہ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
تو شریک سخن نہیں تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی
یاد کے بے نشان جزیروں سے
تیری آواز آرہی ہے ابھی
شر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی
سو گئے لوگ اس حویلی کے
اک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

1 اب کہاں لالہ و گلزار کی باتیں کہاں وہ دن کہاں وہ راتیں اسکول و کالج کے لالباہی دن عمر فریفتہ کو اب کہاں آواز دیں کتنے ماہ سال بیت گئے پڑھائی شادی اپنوں کا ساتھ اور بہت کچھ ملا اور چھوٹ گیا پر ایک شعر جو آج تک زباں پر رہتا ہے۔

منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تنہا ساتھ نہ تھی
تھک تھک اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا
وقت کے ساتھ ساتھ اس شعر کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا۔ والد والدہ بڑی بہن بڑے بھائی شوہر اک اک کر کے سب ساتھی چھوٹتے ہی چلے گئے یہ شعر تو اب حسب حال ہے۔

نئے پڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بٹاؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا اب باہر جاؤں کس کے لیے
خوشیوں کا دور بھی آیا بیت گیا۔ یادیں چاہے سانی ہوں یا دردناک وقت کا ظالم دریا سب بہا کر لے جاتا ہے۔

قسمت میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہتا ہے
چند لکیریں ابھی سی اور ہاتھوں میں کیا رکھا ہے
2 پسندیدہ شاعر تو بہت سارے ہیں۔

ابن انشاء کی مشہور زانہ نظم ”پھرونی وشت“ کا یہ حصہ بار بار پڑھا ہے اور ازبہ ہے۔

اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا
یہ بھی کہنا کہ اب بھی نہ جاتا لوگو!
راہ نکلتے ہوئے پتھر سی گئی تجھیں آنکھیں
آہ بھرتے ہوئے چھلتی ہوا سینہ لوگو!
ہونٹ جلتے تھے جو لیتا تھا کبھی آپ کا نام
اس طرح اور کسی کو نہ ستانا لوگو!

3 ارے یہ کیسا سوال کر دیا یہ تو اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات ہو گئی۔ اب کوئی ہمارے منہ پر تھوڑی ہماری تعریف کرے گا۔ شعر کہنا تو درکنار مجھے نہیں لگتا کسی دوست گزن یا رشتہ دار نے کبھی سراہا بھی ہو۔

”نکتہ چیں ہوں لوگ تو کوئی کیا کرے“

ج: انیلا اور نوشین! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ فرحت اشتیاق کا تعلق کراچی سے ہے۔
عازان کا مطلب ہمیں نہیں معلوم کسی قاری بہن کو معلوم ہو تو ہمیں خط لکھ کر بتادیں ہم شاکر بن گئے۔
سدرہ تخمین عطاریہ۔ چوک اعظم لہہ

نگہت عبد اللہ کا ناول بہت اچھا جا رہا ہے اور یہ ہم سب کو بہت پسند ہے اور ”سفال گر“ تو بشری جی کی بہت اچھی کاوش ہے اس کے علاوہ بھی تمام سلسلے بہت اچھے ہوتے ہیں مگر آپ کی نمونہ احمد کے ناول ”مصحف“ تو ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس ناول کو ہم سب ساری زندگی نہیں بھول سکتے۔

ج: یاری سدرہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید FM 89 کے آریج طارق مسعود ایالٹی اور فرزانہ سلطان کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

سحر امیر۔ علی پور

آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے ہم بہا رہے ہیں۔ اس بار سارے ناول افسانے اچھے تھے۔ شازیہ ہمایوں کی کہانی بہت پسند آئی ہے۔ میں تو پڑھ کر رو گئی تھی۔ آپنی ہمارے گھر ڈائجسٹ پڑھنے نہیں دیتے۔ ہم بہت چھپ کے پڑھتی ہیں۔

ج: سحر اور امیر! آپ کا خط پڑھ کر بے حد دکھ ہوا۔ ہماری اکثر بہنیں لکھتی ہیں کہ ان کے گھر میں پڑھنے پر پابندی ہے۔ اس دور میں جبکہ چینل پر ہر طرح کی آزادی ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ ایک صاف ستھری تقریر ہے جو علم و آگہی بھی دیتی ہے اس کے مطالعہ پر۔ پابندی لگانا کسی طور درست نہیں کہا جاسکتا۔ کم از کم ایک بار پڑھ کر ضرور دیکھ لیتا چاہیے کہ ان ڈائجسٹوں میں کیا لکھا ہے۔ پھر پابندی لگائیں۔

✽

میں اور سب سے بڑی بات موبائل نے جو تباہی مچائی ہے ان سب کی موجودگی میں آپ کا ڈائجسٹ سب میں ایجنز کے لیے مشعل راہ ہے۔

میں اپنے اس خط کے ذریعے اپنی سب بہنوں کو یہ پیغام دیتا چاہوں گی کہ اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی بیٹیوں کی تربیت بہت اچھے انداز میں ہو تو آپ خواتین اور شعاع پڑھنے سے نہ روکیں۔ آپ کی بچوں کی شخصیت نکھر کر سامنے آئے گی۔ میں نے خود ان رسالوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اچھائی برائی کی تمیز بہتر زندگی گزارنے کے اصول، رشتہ بھانا، حالات کا مقابلہ کرنا اور سب سے بڑی بات صبر اور شکر ہے۔ یہ سب کچھ میں نے خواتین اور شعاع سے سیکھا ہے۔ آپ سے ایک درخواست ہے پلیز اس کے معیار کو قائم رکھیں۔ سبھی ہوئی تحریریں سب بچوں کے لیے ایک اثاثہ ہیں اور کیا موبائل میں اور شعاع خواتین ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

ج: فاطمہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کو ڈائجسٹ میں کمی محسوس ہوئی پر اپنی راہ شامل ہوتی ہیں پچھلے ماہ بھی رفعت ناہید سجاد آسیہ رزاقی نگہت عبد اللہ فرحت اشتیاق راشدہ رفعت اور بشری سعید پرانی راہ تھیں۔

انیلا گل تو شین گل۔ ایسٹ آباد

سردق اچھا لگا۔ سب سے پہلے بشری سعید کے پاس پہنچے۔ ”سفال گر“ خوب صورت پیرا میں لکھا گیا خوب صورت ناول، عمر اور حکیم بیگم کے کردار بہت اچھے لکھے ہیں۔ فرحت اشتیاق کے ناول کی قسط بہت شاندار ہے۔ ”سینور سکندر“ ہمیں بہت پسند آیا۔ زین اور ام مریم کے ساتھ کچھ بران کیجئے گا۔ فرحت اشتیاق کا تعلق کون سے شہر سے؟ نایاب جیلانی کا تو نام ہی کافی ہے۔ ہر ناول پہلے سے پڑھ کے ہوتا ہے۔ ”چراغ آخر شب“ اور ”کتا عرصہ چلے گا؟“ افسانوں میں سعیدہ ریس کا ”رنگ زندگی کے“ پڑھا اور بہت اچھا لگا۔

آپنی پلیز ”عازان“ نام کا مطلب بتادیں۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نسل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ویڈیو چینل پر ڈراما ڈرامائی نقلیں اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طے کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔



آپ کا اورپی خانہ

درخت شاہ علیہ

اورک	1 چائے کا چمچ
گھی	1/2 پیالہ
ہری مرچیں	4-3 عدد باریک کاٹ لیں
دہی	1 پاؤ
نمک	حسب ضرورت
ٹماہٹ لال مرچ (کٹی ہوئی)	1/2 کھانے والا چمچ
لال مرچ	1 چائے کا چمچ
زیر پاؤڈر	1 چائے کا چمچ
دھنیا پاؤڈر	1 چائے کا چمچ
گوشت	1/2 کلو
گرم مسالا	1/2 چائے کا چمچ
ہرا دھنیا	تھوڑا سا

ترکیب :

دیکھی میں گھی ڈالیں۔ پھر یاز ڈال کر ہلکا سا کچا کچا

مٹن مسالا ہانڈی

2 عدد
1 چائے کا چمچ

اجزا :
پیاز
نشن

پکائیں۔ پھر اس میں گوشت ڈال دیں اور خوب بھونیں۔ پھر دہی — میں تمام چیزیں ملا دیں اور یہ دہی اس میں ڈال دیں اور اس کو پلٹے دیں۔ تھوڑا سا پریشوریں۔ پھر اس کو بھون لیں اور اوپر سے کترا ہوا ہرا دھنیا، ہری مرچیں اس کے اوپر گرم مسالا ڈالیں اب یہ تیار ہے اسے مہمانوں کی خدمت میں پیش کریں تنان کے ساتھ۔

(3) واقعی یہ سچ ہے کہ عورت کی حلیہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ عورت پر ہی منحصر ہے کہ وہ کیسے اپنا چمن چکا کر رکھتی ہے میں روزانہ اپنا چولہا اچھی طرح صاف کرتی ہوں اور آٹھ سالوں کے بعد بھی وہ نئے کی طرح چمک رہا ہے۔ میرا چمن امریکن ٹائپ کا اوپن چمن ہے۔ میں اس میں ترتیب کا خیال رکھتی ہوں۔ ہفتہ وار صفائی کرتی ہوں۔ نیچے کینٹ کی بھی باقاعدہ صفائی کرتی ہوں۔ تب ہی یہ ہمیشہ صاف رہتے ہیں اور اس میں کیڑے مکوڑے بھی نہیں ہوتے ہیں رات کے کھانے کے بعد چمن کی صفائی اور برتن دھو کر لیتی ہوں۔

(4) تمام دن کے کھانے میں صبح کے ناشتے کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں پراٹھا بہت پسند کیا جاتا ہے اتوار کو میں پوری، حلوہ اور نیچے خودی گھر میں تیار کرتی ہوں۔ کبھی بھارباہر سے آتا ہے۔

پر اپراٹھا

اجزا :
اندھے
پیاز
ہری مرچیں
دھنیا
نمٹا
زیر پاؤڈر
آٹا
گھی
ترکیب :





موسم کے پکوان

خالہ جیلانی

ترکیب :

ایک کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں لہسن اور ک پیسٹ ڈال کر فرائی کریں، پھر اس میں سرخ مرچ، پیسا دھنیا، گرم مسالا، زمرہ اور سونف (کوٹ کر)، نمک، نمٹاؤ پیسٹ، دہی اور پیاز (ہراؤن کر کے چورا کر لیں) ڈال کر بھونیں۔ یہاں تک کہ مسالا یکجان ہو جائے۔ گوشت ڈال کر اچھی طرح مکس کریں پھر ڈھکن بند کر کے ہلکی آنچ پر گوشت گٹنے تک پکائیں۔ اس دوران وقفہ وقفہ سے پیچہ چلاتی رہیں تاکہ گوشت لگنے نہ پائے۔ گوشت گل جائے تو روغن اور پر آنے تک بھونیں، پھر باریک کٹے ہوئے پودینے، ہرے دھنیے اور ہری مرچیں چھڑک کر گرم گرم چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

چلیانی رائس

1 کلو
آدھا کلو

اجزا :
پاستی چاول
پھجلی

روغن جوش

1 کلو
2 کھانے کے چمچے
آدھا کھانے کا چمچ
2 کھانے کے چمچے
1 کھانے کا چمچ
1 کھانے کا چمچ
ڈیڑھ کھانے کا چمچ
تین چوتھائی کپ
3 عدد بڑی
1 کپ
حسب مرضی
3 عدد
حسب ذائقہ
تین چوتھائی کپ

اجزا :
گوشت
لہسن اور ک پیسٹ
سرخ مرچ
پیسا ہوا دھنیا
پیسا گرم مسالا
زیرہ
سونف
نمٹاؤ پیسٹ
پیاز
دہی
ہرا دھنیا، پودینہ
ہری مرچ
نمک
تیل

خبریں و بریں

تصیر نشاط



مبارک!

مبارک! مبارک! ارمیائے ”ہی سال“ شادی کر رہی ہیں۔ رہا کے دولہا کا نام ڈاکٹر طارق شاہ ہے۔ ان کا تعلق کراچی سے ہے، مگر وہ برسوں سے امریکہ میں مقیم ہیں، سو شادی کی تقریب بھی امریکہ میں ہی ہوئی۔ فلم ”دولہا لے کر جاؤں گی“ میں رہا ہواڑے پر چڑھ کر دولہا کو رخصت کرانے پہنچی تھیں، تاہم حقیقی زندگی میں رہا ہوائی جہاز پر سوار ہو کر شادی کرنے امریکہ پہنچیں۔ ویرانہ ملنے کے سبب رہا کے والد اس شادی میں شریک نہ ہو سکے۔ (ہاں، یعنی! شادی میں صرف دولہا، دلہن کی موجودگی ہی ضروری ہے۔) رہا کے والد کو تو ویرانہ ملا نہیں، مگر اداکارہ میرا اس نقیب میں بن بلائے پہنچ گئیں۔ (بن بلائے ”مہارت ہمارا کر عادت یڑ گئی ہوگی نہ) اور اپنی ساتھی اداکارہ کو اپنی

دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا۔ (براہ کرام! اسے ”دعائیں“ ہی سمجھا جائے ”کوئے“ نہیں۔) رہا کی ساس نے انہیں ایک ملین ڈالر کی مالیت کا مکان تحفے میں دیا ہے۔ (نئے ساس چاہے وہی ہو) جبکہ ڈاکٹر طارق شاہ نے انہیں منہ دکھائی میں ایک بی ایم ڈیو کار اور بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی دی ہے۔ (رہا نے تحفے میں اپنی فلم ”ٹوئیں کم“ پیش کی ہوگی۔)

رہا کی دیکھا دیکھی کئی اداکاراؤں نے اعلان کیا ہے کہ وہ بھی بہت جلد شادی کر لیں گی۔ ان میں اداکارہ بدرجہ شاہ، سنا شاہین، صلہ حسین شامل ہیں، جبکہ کئی لوگوں کے خیال میں اب ریشم، نرما اور میرا کو بھی شادی کر رہی یعنی چاہیے۔

بھی ملے پانی میں ابال لیں۔ خیال رکھیے گا کہ زیادہ نہ گل جائیں۔ آلو کو کیوبڑی شکل میں اور گاجر کے گول گول قتلے کاٹ لیں۔ الگ پتیلی میں تیل گرم کر کے میکرونی اور سبزیاں ڈال کر ہلکا ہلکا چبچہ چلا کر مکس کریں، پھر انڈے میں ہلکا سا نمک اور پیسی ہوئی سیاہ مرچ ڈال کر اتنا پھینٹ لیں کہ جھاگ بن جائے، میکرونی میں ملا کر ہلکے ہاتھ سے اچھی طرح مکس کریں۔ انڈے فرائی ہو جائیں تو اتار لیں۔ مزیدار و بجی ٹیل میکرونی تیار ہیں۔

دودھ ڈالاری

- 2 کلو
- 4 کھانے کے چمچے
- 3 پیکٹ (مختلف رنگ کے)
- 1 پاؤ
- 1 پاؤ
- 1 پھٹاک
- 3 کھانے کے چمچے
- حسب ضرورت

اجزا :
دودھ
کسٹرو
جیلی
ریبڑی
خشک چمچ
رنگین ستیاں
چینی
بادام پستہ

دودھ کو چینی ڈال کر ابال لیں پھر اس میں کسٹرو ملا کر ایک ابال دے لیں اور فریج میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔

مختلف رنگوں کی جیلی الگ الگ پکا کر الگ الگ ہی جمالیں۔ فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیں۔ پھر چوکور ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔

سویاں ابال لیں، تنھار الگ رکھ لیں۔
چمچ کو علیحدہ ایک پیالے میں تھوڑے سے دودھ میں بھل دوں۔

اب فریج سے کسٹرو ملا دودھ نکال کر اس میں ریبڑی ملا لیں۔ چمچ کو دودھ سمیت اس میں شامل کر دیں۔
سویاں اور جیلی کے ٹکڑے بھی اس میں ڈال دیں۔

آپ چاہیں تو اس میں موسمی پھل بھی شامل کر سکتی ہیں لیکن یہ خیال رکھیں کہ پھل رس دار نہ ہوں (یعنی کیو نہ لیں، سیب، انگور، کیلا، پائین ابل لے لیں) پیش کرتے وقت بادام پستے بھی شامل کر لیں۔

- انڈے
- سرکہ
- سویا ساس
- ہری پیاز
- لال اور ہری شملہ مرچ
- پسی سفید مرچ
- نمک
- تیل
- 3 عدد
- 2 کھانے کے چمچے
- 1 کھانے کا چمچ
- 4 عدد
- 2 عدد
- ایک کھانے کا چمچ
- حسب ذائقہ
- 1 کپ

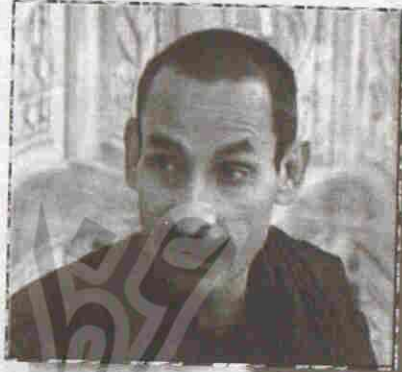
مچھلی کو صاف کر کے کھال اور کانٹے الگ کر لیں، پھر قلوں میں کاٹ کر بھاپ میں گلا لیں۔ ایک پتیلی میں تیل گرم کر کے مچھلی کے قتلے فرائی کر لیں، نمک، سرکہ اور سویا ساس ڈال کر تھوڑا سا پکا میں، پھر شملہ مرچ (بج نکال کر چوکور کاٹ لیں) اور ہری پیاز (صرف پتے، رنگ میں کاٹ لیں) ڈال کر مکس کریں۔ تھوڑی دیر بعد انڈے پھینٹ کر ڈال دیں اور تیل اوپر آنے تک پکائیں۔

چاولوں کو نمک ڈال کر ابال لیں مگر بج نہ لائے سے پانچ منٹ قبل اس میں چوکور کٹی ہوئی ہری شملہ مرچ اور رنگ میں کٹی ہوئی ہری پیاز ڈال دیں، پھر تنھار کروم لگا دیں۔ چاول والی ڈش میں چاروں طرف چاول ڈال کر بیچ میں مچھلی کا ساں ڈال دیں۔ منفردی ڈش گرم گرم پیش کر کے خوب داد پائیے۔

و بجی ٹیل میکرونی

- اجزا :
- میکرونی
- مٹر
- گاجر
- آلو
- انڈے
- پسی سیاہ مرچ
- نمک
- تیل
- 1 پاؤ
- 1 پاؤ
- 2 عدد
- 1 عدد (بڑا)
- 2 عدد
- حسب ضرورت
- حسب ذائقہ
- 2 کھانے کے چمچے

میکرونی کو نمک ڈال کر ابال لیں۔ تمام سبزیوں کو



عمر سات سال ہے۔ (کچھ یاد نہیں آ رہا کہ وینا کے پہلے بھارت یا ترائی کو گزرے کتنے برس ہو گئے۔)
وینا کے بارے میں یہ اطلاعات بھی ہیں کہ وہ بھارت میں مستقل قیام کے لیے بھارتی حکام کو درخواست دینے کی تیاریاں بھی کر رہی ہیں۔ (وینا جی!) ہماری دعا ہے آپ کے ساتھ ہیں، لیکن عدنان سمجھ اور راحت علی خان کا انجام ذہن میں رکھیے گا! انڈیا والے ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس بھی لے لیتے ہیں۔)

جوڑ

اسٹیج اداکار افتخار ٹھیاکر مزاحیہ اداکاری کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی فنی زندگی طویل جدوجہد سے عبارت ہے۔ تاہم اب ڈھلتی عمر میں قسمت اچانک ان پر مہمان ہو گئی ہے۔
ہوا کچھ یوں کہ سید نور نے انہیں اپنی فلم ”دوہٹی لے کے جانی اے“ میں صائمہ کے مقابل ہیرو کا رول کر لیا۔ ٹھیاکر کی خوش قسمتی سے فلم کامیاب ہو گئی، سو اب انہیں ایک کے بعد ایک فلموں کی آفرز ہو رہی ہیں۔ اپنی دوسری فلم ”ٹھاکر 420“ میں وہ نرگس کے مقابل ہیرو آ رہے ہیں۔ (مبارک ہو! فلم انڈسٹری کو بالآخر نرگس اور صائمہ کے جوڑ کا ہیرو مل ہی گیا۔)



مصروفیات سے اپنی ”گھر والی“ کو لا علم ہی رکھتے ہیں۔)
گود بھرائی

ہالی ووڈ کے اداکار جنوں میں رہنے کے گڑ سے اچھی طرح واقف ہیں، سو وہ اکثر ویسٹر کوئی نہ کوئی انوکھی اور حیران کن حرکتیں کرتے رہتے ہیں، مگر جناب! ہماری دینا ملک بھی ان سے کچھ کم نہیں۔ وہ بھی آئے دن کوئی نہ کوئی ”وکھری ٹائپ کی“ حرکتیں کرتی رہتی ہیں۔
ہالی ووڈ میں بچے گود لینے کا فیشن ہے۔ اکثر اداکاروں نے اپنے بچے ہونے کے باوجود بھی کئی بچے گود لیے ہوئے ہیں۔ جیسے خبر آئی ہے کہ انجلینا جولی اور بریڈ پیٹ ساتواں بچہ گود لینے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کی تقلید میں دینا ملک نے بھی ایک بچی گود لی ہے۔ یہ ان کی دوسری بچی ہے۔ (بھئی! گود لی ہوئی!) اس سے قبل دینا ملک نے پاکستان میں ایک بچہ بھی گود لے رکھا ہے۔ (اس سے پہلے وہ پاکستان میں تھیں نا!)
وینا نے ابھی جو بچی گود لی ہے، اس کا نام پائل کیلے ہے۔ پائل کا حلق بھارت سے ہے اور اس کی



تبدیلی

گئے دنوں کی بات ہے کہ پاکستان فلم انڈسٹری کی رابطہ کمیٹی کے تحت منعقدہ ایک سیمینار میں معروف ہدایت کار و مصنف سید نور نے اپنی جذباتی تقریر میں اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ ہم بھارتی فلموں کی نمائش بند کر کے ہی دم لیں گے۔ یہی نہیں، انہوں نے اس سلسلے میں ارباب اختیار سے کئی ملاقاتیں بھی کی تھیں، مگر جناب! دن وقت اور خیالات بدلتے دیر کہاں لگتی ہے بھلا۔

خبر آئی ہے کہ سید نور ایک بھارتی فلم کی ہدایت دے رہے ہیں۔ فلم کے پروڈیوسر بھارتی گلوکار دلیر مہدی ہیں۔ سنا ہے دلیر مہدی اپنے بیٹے کو بطور ہیرو متعارف کرانے کے لیے یہ فلم بنارہے ہیں۔ سید نور ان دنوں اس فلم کی شوٹنگ کے لیے دہلی میں مقیم ہیں۔ (شاہ جی! اس بھارتی فلم کی نمائش کہاں ہوگی؟) اس خبر کی تصدیق کے لیے جب اداکارہ صائمہ سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ۔

”شاہ جی نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ پتا نہیں وہ انڈین فلم ہے بھی یا نہیں۔ یہ تو شاہ جی دینی سے واپس آ کر ہی بتائیں گے۔ میں اس بارے میں لا علم ہوں۔“

(جی ہاں! شاہ جی کی پرانی عادت ہے کہ وہ اپنی بیرونی



عزیز بن! آپ کی دوست کا مسئلہ بڑھ کر دل کا نب اٹھا ہے جس طرح مذہب کو مذاق بنایا گیا اسے کسی طور جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پہلے طلاق دینا، پھر حلالہ کرانے کے لیے نکاح کرانا۔ پھر طلاق اور شادی۔ اب یہ مسئلہ کھڑا کر دیا ہے کہ دوسرے حلالہ کیوں نہیں کیا گیا۔

صرف آپ کی سہیلی کے ساتھ ہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی دوسری بڑی بہو کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا ہے۔ آپ کی سہیلی کا شوہر اب پھر طلاق کی دھمکیاں دیتا ہے اسے اپنے بچوں کا بھی احساس نہیں ہے کہ ان پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ اس مسئلہ کا مثبت حل بتائیں نہایت افسوس کے ساتھ کہ اس مسئلہ کا کوئی مثبت حل ممکن نہیں ہے۔ آپ کی سہیلی جن لوگوں میں بیاہ کر گئی ہے وہاں عزت غیرت کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ آپ کی سہیلی کو سوچنا چاہیے کہ اگر شوہر طلاق دے دے تو اسے کیا کرنا ہے۔ اندازہ تو یہی ہے کہ وہ صرف دھمکیاں دیتا ہے طلاق نہیں دے گا لیکن بالفرض محال ایسی کوئی صورت پیش آجائے تو دوبارہ کسی حال میں بھی حلالہ یا شوہر سے رجوع کرنے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔

ا۔

اچھی بہن! آپ کے والد کی خواہش ہے کہ آپ ڈاکٹر بنیں، ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے آپ نے سائنس لی اور اپنی طرف سے پوری محنت بھی کی لیکن رزلٹ حسب توقع نہ آسکا۔ اس کی وجہ سے آپ پریشانی کا شکار ہوئیں اور ہر وقت بڑھنے اور پریشان رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے ذہن پر اس کے اثرات ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ آپ بلاوجہ خوف کا شکار ہو گئیں۔ کسی نے آپ سے غلط کہا ہے کہ جانوروں اور پرندوں سے ڈرنے والے نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ ایک نارمل آدمی بھی جانوروں سے ڈرتا ہے۔ خصوصاً لڑکیاں تو کاکڑیچ اور چھپکلی سے بھی ڈرتی ہیں۔ کوئی کاکڑیچ قریب سے گزر جائے تو بے ہوش ہونے لگتی ہیں۔ اس لیے یہ بات اپنے ذہن سے نکال دیں کہ آپ نفسیاتی مریض ہیں۔ آپ کو جو جسم پر کچھ رہینگے کا احساس ہوتا ہے وہ بھی ہر وقت پریشان کن سوچوں میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے ہے۔

دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ ڈاکٹر بننے والے ہی ذہین ہوں جس جینکٹ یا مضمون میں دلچسپی نہ ہو اس کو بھر کر کے بڑھا جائے تو پیچھے پی نکلتا ہے۔ سائنس میں آپ کے اچھے نمبر نہیں آئے تو آرٹس لے لیں آپ نے خود لکھا ہے کہ جب چھوٹی تھیں تو ہر کلاس میں پوزیشن لیتی تھیں۔ جب آپ آرٹس میں اچھے نمبر لیں گی تو جو لوگ آپ کی انسلٹ کرتے ہیں۔ وہ تعریف کریں گے۔

سش۔ ملتان

آپ اس سے بدلہ لینے کے لیے جس چکر میں پڑ گئی ہیں اس سے باز آجائیں۔ یہ سرسرتابی اور بریادی کا راستہ ہے۔ آپ نے اسے گھبرا کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ خدا کا شکر ادا کریں کہ آپ بچ گئیں، آئندہ ایسی غلطی نہ کریں۔ تمہیں کو مطمئن کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ آئندہ کے لیے توبہ کریں اور خدا سے دعا کریں کہ آپ کو راہ مستقیم پر چلائے۔



کیا آپ اپنی شکل و صورت کے بارے میں اکثر کڑھتی رہتی ہیں؟ اور بڑی حسرت آپ کو ہوتی ہے کہ اسے کاش ممکن ہو تاکہ فلاں حسین عورت کی صورت سے اپنی صورت بدل لیتی؟ اگر ایسا ہے تو کڑھنا بند کر دیجئے۔ اور تاسف ان لوگوں پر کیجئے جن پر آپ کو رشک آیا کرتا ہے۔ کیونکہ اس خوب صورتی اور خوش روی ہی کی بدولت ان کی زندگی زیادہ ابتلا و آلام کی زد میں ہے۔

یہ سچ ہے کہ خوب صورتی کی بدولت کسی کو ”فتح پائی“ کے فوائد اور خراج تحسین حاصل کرنے کے فوری مواقع بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن خوب صورت لڑکیوں کی زندگی ان کی جوانی میں اتنی تن آسانیوں، سہل انگاریوں کا مجموعہ بنادی جاتی ہے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کی نشوونما کے ذوق و شوق سے تقریباً محروم ہو کر رہ جاتی ہیں اور نتیجتاً ان کا خاتمہ اکثر و بیشتر بے اثر یا ٹوٹی مری ہوئی شخصیتوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ زندگی کے شدید جھٹکوں اور جھگڑوں کو سنبھالنے کے لیے باطنی ذرائع اور سہارے ان میں کمی ہی ہوتے ہیں۔

والدین کا رجحان یہ ہے کہ وہ اپنے سب سے زیادہ قبول صورت بچوں کو خزانہ بنایا کر رکھتے ہیں لیکن انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ خوش نصیبی کے ساتھ ساتھ ان پر یہ ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے کہ ان کے بیٹے اپنی ظاہری چمک و مک کی وجہ سے مقبول و محبوب ہونے کے بجائے اپنی شخصیتوں کی نمائش کے لیے طبعی مواقع حاصل کریں۔

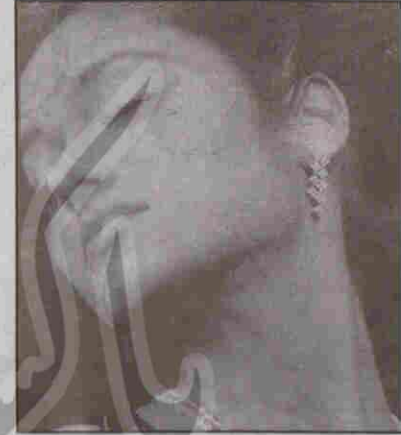
ایک سمجھ دار اور ذہین عورت کا دھیان اچھی بیوی بننے کی طرف زیادہ رہے گا۔ خوشگوار اور پائیدار ازدواجی زندگی قائم کرنے کے اتفاقات، فطری حسن کے لیے اوسط سے پنجیس فیصد کم ہی ہوتے ہیں۔ طلاق کی عدالتیں بیشتر حسن والوں ہی سے آباد رہتی ہیں اور تناسب آبادی کے لحاظ سے ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔

روزمرہ کے میل جول اور ربط و ضبط میں بھی حسن والوں کی راہیں کچھ بند سی رہی ہیں۔ کسی خوب صورت عورت کی موجودگی میں مرد اکثر بے قراری سی محسوس کرتے ہیں کہ ان کو اپنی ان محرکات طبعی کی نشوونما کا موقع ہی بہت کم نصیب ہوتا ہے۔



کم ہمتی، تنگ مزاجی، غصہ، خوف اور دل شکنگی بھی ایک طرح کا ڈپریشن ہے۔ ان میں غصہ اور تنگ مزاجی زیادہ ڈپریشن کے زمرے میں نہیں آتے۔ لیکن پھر بھی بعض دوسری باتیں مل کر یعنی اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ذہنیاتی کا غصہ، بات بات پر جھنجھکی اور تنگ مزاجی کو بھی ایک طرح کا ڈپریشن ہی سمجھنا چاہیے۔ اس سے نجات حاصل کرنا قطعی طور پر آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ارادے پابند ہونا، ہمت کرنا اور اس پر عمل کرنا ڈپریشن کو شکست دینا ہے اور ایک واضح شکست دینے کا مطلب ہے کہ آپ نے ڈپریشن پر فتح حاصل کر لی اور اپنی زندگی کو کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کر لیا۔

ڈپریشن سے نجات کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ خود کو مصروف رکھیں۔ دوسروں میں دلچسپی لیں۔ ان سے محبت کریں، محبت کرنے والے لوگوں کو اپنے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ دوسروں کی خوشیوں میں اپنی خوشیاں تلاش کرتے ہیں اور ان کے دل ہمیشہ سچی خوشی سے سرشار رہتے ہیں۔



ہانیہ سعید۔ نامعلوم جگہ

س : میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بالوں میں بہت لکھن ہیں اور اس کے لیے میں نے بہت سے ٹونکے کیے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میری شادی ہونے والی ہے پلیز مجھے کوئی اچھا سا ٹونکنا دیں۔

ج : فائل کی گولیاں باریک پیس کر سرسوں کے تیل میں ملائیں اور رات کو سونے سے پہلے اچھی طرح لگائیں۔ صبح سر دھو لیں۔ بال بلبھا کر باریک کنگھی کریں۔ یہ عمل ہفتے میں دوبارہ کریں۔ ان شاء اللہ دو سے تین ہفتوں میں جوڑوں اور لہکھوں سے مکمل نجات مل جائے گی۔

نازیہ ارشد۔ گوجرہ

س : بائی! میرے منہ پر بلیک ہیڈز بہت زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ پھنسیاں بنتی ہیں اور نشان چھوڑ جاتی ہیں اور میرے چہرے پر بال بھی کٹی ہیں۔ پلیز مجھے ان

سب مسئلوں کے لیے کچھ بتائیں اور رنگت نکھارنے کے لیے بھی۔ میری جلد چکنی ہے میں بازار کی بنی ہوئی مصنوعات استعمال کر کے تنگ لپچی ہوں پلیز آپ کوئی سادہ سا نسخہ بتائیے۔ پلیز مجھے ان سب مسئلوں سے نجات دلا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں بلیک ہیڈز کو جہاں سے دبا کر نکالتی ہوں وہاں پھنسی بن جاتی ہے۔ پلیز کچھ ایسا بتائیں کہ ان مسئلوں سے چھٹکارا مل جائے۔

ج : بلیک ہیڈز کے لیے ایک سخت ٹمائز کاٹ کر پورے چہرے پر رگڑیں۔ ایک گھنٹے بعد منہ دھو لیں۔

وانوں اور پھنسیوں یا رنگت نکھارنے کے لیے غیر معیاری کریمیں یا اوویات استعمال کرنے کے بجائے پھلوں اور سبز نولوں سے علاج کریں۔

پھنسیاں عموماً چکنی جلد پر نکلتی ہیں۔ آپ روزانہ دو مرتبہ منہ سے منہ دھو لیں۔ مین جلد کی چکنائی جذب کر لیتا ہے۔ اس سے دانے نکلتا آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں۔ وانوں کو ہرگز مت چھیڑیں اور نہ ہی دبا کر ان کا مواد نکالنے کی کوشش کریں۔ ہاتھوں پر جراثیم ہوتے ہیں جو دانوں میں مزید انٹیکشن پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں اور اسی وجہ سے دانے اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ اس لیے دانے نکلنے اور ختم ہونے کے عمل میں مداخلت نہ کریں۔

رات کو سوتے وقت کچے دودھ میں ایک چمکی نمک ملا کر روئی کے پھاہے سے چہرے پر مساج کریں۔ ایک مہینہ مسلسل یہ عمل کرنے سے چہرے کا رواں جھڑ جاتا ہے۔

یاد رکھیے! کوئی بھی چیز مستقل استعمال سے ہی فائدہ دیتی ہے۔ اس لیے اگر بہترین نتائج چاہتی ہیں تو کوئی بھی نسخہ کچھ عرصہ مسلسل استعمال کریں۔

